اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرّحمٰن

مطبع جامعہ ملّیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

مطبوعات شرکت کاویانی برلن (جرمنی)

(صرف مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیاپور ہندوستان میں ان کتابوں کو فراہم اور فروخت کرتا ہے)

۱۔ **سفرنامہ حکیم ناصر خسرو** | مع روشنائی نامہ وسعادت نامہ فارسی مصنف چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوا۔ اس عہد کے بلاد اسلامیہ کے چشم دید حالات نہایت دلچسپ وعبرت آموز جس میں مصنف کی دو غیر مطبوعہ بابات نظم بیان فلسفہ حکمت پر شامل ہیں۔ سرورق وسرنامہ اصل ایرانی نسخہ کے مطابق مطلا رنگین۔ کاغذ نہایت اعلیٰ دبیز چکنا سفید مثل چینی کی پلیٹ کے چمکیلا۔ طباعت نظر افروز قیمت [illegible]

۲۔ **زاد المسافرین** | حکیم ناصر خسرو کی یہ دوسری معرکۃ الآرا کتاب ہے جو عرصہ سے ناپید تھی اور اب مطبع کاویانی نے نہایت خوبی واہتمام کے ساتھ طبع کرائی ہے۔ فلسفہ وتصوف وحکمت اسلامی کی مستند کتاب ہے۔ قیمت [illegible]

۳۔ **گلستان** | شیخ سعدی شیرازی کی شہرہ آفاق کتاب جدید قالب میں نظر آتی ہے کاغذ عمدہ طباعت نفیس اور سرورق خوبصورت۔ قیمت [illegible]

۴۔ **تیاتر** | از مرزا ملکم خان ناظم الدولہ جنکی علمی وقلمی جد وجہد سے ایران دوبارہ زندہ ہوا۔ یہ ان کے تین نثر ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں گزشتہ صدی کے نظام حکومت ایران کی ابتری کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ فارسی جدید کے قدردان اس تحفہ کو بڑی قدر سے قبول کریں گے قیمت [illegible]

۵۔ **موش وگربہ فارسی** | از خواجہ عبید زاکانی۔ جو آٹھویں صدی کا ہجوگو اور مشہور شاعر تھا۔ چوہے بلی کی جنگ کا قصہ جس میں نباتات عصر کی ہجو بلیغ ہے جو عہد حاضر کے لئے بھی یکساں برمحل ہے۔ ہر صفحہ رنگین ودلاویز تصاویر نظم نہایت دلچسپ ومہذب۔ بچوں کے واسطے بھی نہایت موزوں ہے قیمت [illegible]

۶۔ **تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء (عربی)** | مؤلفہ حمزہ ابن الحسن اصفہانی ۳۵۰ھ ہجری میں لکھی گئی انتہائی کاوش کے ساتھ قدیم تواریخ فارس وروم۔ یونان مصر۔ عراق۔ شام وعرب کے متعلق تمام صحیح ومعتبر ہیں کی تفتیش وتحقیق ہے۔ شائقین تاریخ کے لئے نہایت دلچسپ ومفید تحفہ ہے۔ قیمت [illegible]

۷۔ **نصاب الصبیان** | فارسی جدید کے شائقین اور طلبا کے واسطے بہترین مجموعہ نظم ہے قیمت [illegible]

۸۔ **رہنمائے پسران** | بچوں کو خط وکتابت کے پیرایہ میں عمدہ نصیحتیں کی ہیں [illegible]

۹۔ **تلغراف بی سیم** | فارسی میں اس ٹیلیگرافی پر قابل قدر تصنیف ہے جس میں متعدد نقشے تصویریں اور بلاک شامل ہیں قیمت [illegible]

۱۰۔ **لغات المانی بفارسی** | فارسی وجرمن زبان کی لغت۔ قیمت [illegible]

مبادی معاشیات | علم المعیشت میں قابل قدر اور گراں مایہ اضافہ ہے جو اصول معاشیات
پر تازہ ترین مباحث پر حاوی ہے از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب

قیمت عہ مجلد عہ

خطبہ صدارت شیخ الہند مرحوم | بہ تقریب افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ قیمت ۲ر

خطبہ صدارت مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مدظلہ | بہ تقریب جلسہ اول تقسیم اسناد جامعہ ملیہ قیمت ۲ر

اسلامی تہذیب و قومی تعلیم | ڈاکٹر سر پی۔ سی رائے کا وہ مشہور و معروف خطبہ صدارت
جو ممدوح نے بہ تقریب جلسۂ دوم تقسیم اسناد جامعہ
بزبان انگریزی پڑھا۔ جس میں مسلمانوں کی گذشتہ علمی خدمات کی تاریخ کا قابل دید
مرقع ہے۔ مترجمہ مولوی محمد مسلم ایم۔ اے قیمت ۴ر انگریزی ایڈیشن قیمت ۸ر

ترکوں کی کہانیاں | محبت اسلامی و غیرتِ قومی کو جوش دلانے والی چند ترک بہادروں
کی جانبازیوں کی نہایت سچے اور بصیرت افروز تاریخی واقعات زبان
سلیس و عام فہم اور آسان۔ قیمت ۴ر

حقائق اسلام | فلسفۂ اسلام پر عقلی دلائل و براہین از مفتی انوار الحق صاحب ایم۔ اے
نئی روشنی کے حضرات کے واسطے قابل قدر تحفہ ہے قیمت ۱۲ر

المدنیۃ و الاسلام | فرید وجدی علامۂ مصر کی عربی کتاب کا بہترین و دلکش ترجمہ کہ
اصل کتاب اور ترجمہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اسلامی اصول
پر محققانہ اور دلچسپ مباحث۔ از مولٰنا رشید احمد انصاری مرحوم استاذ جامعہ و سابق پروفیسر
مدرسۃ العلوم قیمت ۱۲ر

مکاتیب | نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا
قابل قدر۔ دلچسپ۔ پُر از معلومات بہترین مجموعہ مرتبہ مولوی محمد امین صاحب
زبیری مہتمم تاریخ بھوپال قیمت عہ

تصانیف خواجہ محمد عبد الحی صاحب فاروقی پروفیسر جامعہ ملیہ علیگڈھ

الفرقان فی معارف القرآن

قرآن حکیم کی اس سے بہتر زبان اردو میں کوئی تفسیر ملک میں موجود نہیں۔ مولینا کی یہ خدمت قابل قدر و ستائش ہے۔ آپ جن مضامین کو وقت و زمانہ کے لحاظ سے زیادہ ضروری و اہم خیال فرماتے ہیں۔ پہلے انہیں کو ترتیب فرما رہے ہیں۔ اب تک دو حصے شایع ہو چکے ہیں۔

حصہ اول۔ الخلافۃ الکبریٰ سورۂ بقر کی مکمل و مفصل تفسیر حجم ۲۲۴ صفحات قیمت للعہ، مجلد صہ

حصہ چہارم۔ الصراط المستقیم سورۂ انفال و توبہ کی مبسوط تفسیر۔ شروع میں مسئلہ جہاد پر ایک بصیرت افروز مقدمہ کا اضافہ ہے
حجم صفحات کاغذ ولایتی سفید و چکنا قیمت عہ

بصائر حضرت موسیٰ اور فرعون کے واقعات، زمانہ حاضرہ سے تطبیق طبع جدید جس میں بعض مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے قیمت ۶ر

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد سوم	جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۴ء	نمبر ۱

جرمنی کی تعلیمی زندگی

(۳)

ہائی اسکول

(ڈاکٹر فریڈرک ایرنسٹ رایش کے قلم سے)

زمانۂ جنگ تک جرمنی میں لڑکوں کے ہائی اسکولوں کی تین بڑی قسمیں کی جاتی تھیں۔ ان تینوں میں چھ سال کی پڑھائی کے بعد رعایتاً صرف ایک سال کی فوجی خدمت انجام دینا ہوتی تھی (ورنہ در اصل میعاد قانونی دو سے تین سال تک تھی) اور نو سال پورے کرنے کے بعد تعلیم دار الفنون (یونیورسٹی) کی صلاحیت کی سند ملتی تھی (اسے جرمن میں [illegible] کہتے ہیں) ہائی اسکول کی تعلیم سے قبل تین سال ابتدائی مدرسہ میں تعلیم کی شرط تھی۔

ہومانی گمنازیم (Humanistic Gymnasium) ان مدارس میں سب سے پرانی قسم ہے اور عرصہ تک یہی سب سے معزز و قابل قدر سمجھا جاتا تھا۔

اس کا آغاز ہومانی یونیورسٹی کی ایک شاخ کے طور پر ہوا تھا چنانچہ اس میں ہمیشہ

فضیلت مآبی کی یہ شان باقی رہی حتیٰ کہ ۱۸۹۰ء کی تجدید ہو مانی کے بعد بھی۔ ان مدرسوں میں تعلیم کا مرکز لاطینی اور آگے چل کر یونانی تمدن کا مطالعہ تھا، جس کے لئے ایک حد تک خود جرمن زبان اور تاریخ کے گھنٹے سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ اس کی تائید میں یہ خیال پیش کیا جاتا ہے جس کے قائل خود ہمارے (جرمن) کلاسکل عہد کے شعرا بھی تھے، کہ اہل یونان کی زندگی نے ان چیزوں میں جو تمام نوع انسان میں مشترک ہیں اعلیٰ ترین نمونہ حاصل کیا تھا اس لئے یونانی تاریخ، فلسفہ اور ٹریجڈی کا درس حقیقی معنوں میں سبق آموز ہے۔ خاص مقصد، مختص اغراض، اور پیشوں کے لئے تعلیم آئندہ زندگی میں ہوتی رہے گی، مدرسہ میں ہمہ گیر اور عام خصایص انسانی کو نشو و نما دینے والی تعلیم ہوگی جس سے ذہن کی اصل ذات کا عرفان حاصل ہو۔ تہذیب جدید کی کارگذاریاں اور صنعت و حرفت تربیت آموز اثر نہیں رکھتیں لہذا ان پر محض ضمنی پہلو سے توجہ کی جاسکتی ہے۔

ان مدارس میں سے بعض میں طالبعلم ہر تیسرے یا پانچویں سال ارسطافنیس Aristophanes کی کوئی کامیڈی یا کوئی قدیم ٹریجڈی کھیلتے تھے۔ قدرتی طور پر یہ تماشہ ہوتا جرمن زبان میں تھا، یونانی میں زیادہ سے زیادہ کورس ہوا کرتا تھا۔ جو لوگ مذہبی علوم سے دلچسپی رکھتے تھے وہ ان مدرسوں میں عبرانیات کی تحصیل بھی کر سکتے تھے۔ البتہ جدید غیر زبانیں کس مپرسی کی حالت میں تھیں۔ ان مدارس میں لاطینی کی نوجی قواعد کی سی مشق اور علم اللسان کی بے نتیجہ موشگافیوں کے خلاف جن سے شاذ و نادر ہی کوئی کلاسکل روح کی تہ تک پہونچ سکتا ہے، زمانۂ حال میں بڑے زور شور کے حملے ہوئے ہیں۔ غالباً یہ چیزیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جائیں گی۔

ہائی اسکول کی دوسری قسم اور بریال شولے (Realschule) مذہبیئین کے عہد کی آفرینش ہے لیکن عملی حیثیت سے یہ مدارس اُنیسویں صدی کی ابتدا میں بویریا اور پروسیہ میں قایم ہوئے۔ باوجودیکہ ایک عرصہ تک ان کی شدت سے مخالفت ہوتی

رہی یہ قسم زمانہ حال کا مدرسہ بن گئی۔ جزو اعظم اس میں حکمیات کی یعنی طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کی تعلیم ہو؛ جرمن زبان اور جدید غیر زبانوں کا بھی قوی عنصر موجود ہو؛ البتہ قدیم زبانیں بالکل مفقود ہیں۔ اس کے حامی کہتے ہیں کہ مدرسہ کو زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے اور جدید ترقی اور نشوونما کے سمجھنے میں مدد دینا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے مدارس کے فوائد مذکورہ صدر گمنازیم سے کسی طرح گھٹ کر نہیں ہیں، لیکن اس میں اس یک آہنگ تعلیمی نصب العین کی کمی ہو جو مثلاً اس طریقہ سے حاصل ہوسکتا تھا کہ المانیات کی تعلیم میں تمام مضامین کا نقطۂ اتحاد قایم کیا جاتا یا یوں کہ کائنات کا تصور کھلم کھلا حکمیات کے مطابق ہوتا۔ اس طرز کے مدارس کی تعداد روز افزوں ہو۔

پروسیہ اور **ورٹمبرگ** میں ۱۸۸۲ء میں ایک تیسری قسم کے مدارس قایم ہوئے جن کا اصول دونوں ماقبل الذکر مدرسوں کے بین بین ہو۔ اس قسم کے مدارس کو **ریال گمنازیم** (Realgymnasium.) کہتے ہیں۔ یہ مدرسہ ایک خاص انداز کا دوگونہ نصب العین رکھتا ہو۔ ایک طرف تو یہ جدید زبانوں اور حکمیات کی تعلیم کے ذریعہ عہد ترقی کی خدمت کرنا چاہتا ہو لیکن دوسری طرف تمدن قدیم کی اہمیت کے سامنے بھی خراج تسلیم پیش کرتا ہو۔ چنانچہ کافی وقت لاطینی کی تعلیم پر بھی صرف کرتا ہو جو ساری تعلیمی عمارت کے لئے لسانی بنیاد کا کام دیتی ہو۔ چنانچہ اصل میں یہ قسم دوم کا مدرسہ ہو یعنی (Oberrealschule.) جس میں لاطینی کے سبق کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ اس دورخی کے باعث ریال گمنازیم قدیم اور جدید دونوں تمدنوں کے شیدائیوں کا منظور نظر ہو۔ لیکن دوسری طرف اسی سبب سے اس پر ادھورے پن اور بے اصولی کا الزام بھی لگایا جاتا ہو۔ ممالک غیر کی دو زبانیں جرمنی میں سکھائی جاتی ہیں، جن میں پہلا درجہ فرانسیسی کو اور دوسرا انگریزی کو دیا جاتا تھا لیکن آجکل سب کہیں انگریزی پہلے درجہ کی طرف بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ جہاں انتخاب زبان کی آزادی ہو وہاں جنوبی امریکہ کے تعلقات کے خیال سے ہسپانوی زبان کو ترجیح دی جاتی ہو

علاوہ اِن تین اصلی مضموں کے ان کی بین بین اور متعدد قسمیں ہیں جو نام کیلئے ریفارم گمنازیم (Reformgymnasium) کہلاتی ہیں۔ اِن میں بس زبانوں کی تعلیم کی ترتیب دوسری ہے لیکن اس قسم کی جزوی تبدیلیوں سے کوئی اہم فائدہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ آجکل بالکل جدید اُلو پر جو مدارس قایم ہوئے ہیں وہ قابل توجہ ہیں اور میں اِن کا ذکر کسی آیندہ مضمون میں کرونگا۔
یہ تمام مدرسے اصل میں صرف لڑکوں کے لئے قایم ہوئے ہیں۔ یہ ابھی تھوڑے دن کی بات ہے کہ لڑکیوں کو بھی ان میں داخلہ کی اجازت ملی ہے۔ پہلے اس کے بجائے الگ دستے لڑکیوں کے مدارس تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجا تعلیم اگر دیہاتی مدارس سے قطع نظر کر لی جائے تو صرف ریاست بادن کے ہائی اسکولوں میں ہوتی ہے۔ بادن جرمنی میں سیاسی اور تعلیمی حیثیت سے نمونہ کی ریاست سمجھی جاتی تھی۔ اسی ریاست نے سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۲ء میں عورتوں کو یونیورسٹی میں داخلہ کا حق دیا تھا جس کی تقلید پروسیہ نے کہیں چھ سال بعد جاکر کی۔ اس کے علاوہ دونوں جنس کے بچوں کی یکجا تعلیم صرف خانگی دیہاتی تعلیمگاہوں میں ہوتی ہے جن کا ہم آگے ذکر کریں گے۔
لڑکیوں کے مدارس کے متعلق ایک عرصہ تک نہایت شدت سے مجادلہ ہوا ہے۔ ایک طرف تو "جداگانہ" نسوانی حقوق کے حامی تھے، جو مدرسہ میں لڑکیوں کو دستکاری اور خانہ داری کی تعلیم دینے پر زور دئے جانے کے طالب تھے۔ دوسری جانب نسوانی تحریک تھی جو مردوں جیسی علوم و فنون میں مکمل اور غیر محدود تعلیم کا حق چاہتی تھی۔ اس معرکہ کا خاتمہ سنہ ۱۹۱۲ء میں اس طرح ہوا کہ ایک لڑکیوں کا اسکول جس میں دس درجے ہوتے ہیں قایم ہوا۔ اس کا نام لیسیم (Lyceum) رکھا گیا۔ اِن مدارس کی تعلیم چھ درجہ تک کے ریال شولے کی تعلیم سے ملتی جلتی ہے، لیکن یہاں ختم مدرسہ (School leaving) کے امتحان کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی لڑکی اس مدرسہ سے فراغت پاکر مزید تعلیم حاصل کرنا چاہے تو اسے اوبرلیسیم (Oberlyceum) میں پڑھنا چاہیے جس کے بعد وہ

معلمہ بننے کی خاص تعلیم حاصل کرسکتی ہے یا ایک خاص قسم کے زنانہ مدرسہ میں یا Weib-
Studienanstalt جا سکتی ہے جہاں ختم درس کا امتحان ہوتا ہے۔ خالص حیثیت اور
خانہ داری کے مقاصد کے لئے لیسیم کے بعد اسی سلسلہ کی مزید کڑی کی حیثیت سے
"نسوانی مدارس" کام دیتے ہیں، جو مقدم الذکر کی طرح زمانہ حال ہی میں قائم ہوئے ہیں۔
ہائی اسکول کے نظم ونسق کا بالتفصیل ذکر کرنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اسکول
کا اعلیٰ افسر ایک ڈائرکٹر ہوتا ہے۔ جماعت معلمین اور ڈائرکٹر سے ملکر "کانفرنس" بنتی ہے
جسے تمام انتظامی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مدارس کا معائنہ "شول راٹ"
یعنی انسپکٹر سال میں دو بار کرتے ہیں اور ان کا صدر دفتر وزارت تعلیم کے ایک مخصوص
شعبہ میں ہوتا ہے۔ جسے "جماعت انتظامی مدارس صوبجات" کہتے ہیں۔
درس وتدریس کے لئے صرف وہ معلمین (اور لڑکیوں کے مدارس میں معلمات
اور معلمین دونوں) مقرر کئے جاتے ہیں جنہوں نے یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہو اور
فن تعلیم کے بھی ماہر ہوں۔ جس میں سب ملاکر چھ سات سال صرف ہوتے ہیں نیچے کے
درجوں میں ابتدائی مدارس کے معلمین بھی پڑھا سکتے ہیں یعنی وہ جو سیمینار (Seminar)
(ٹریننگ اسکول) یا اوبرلیسیم (Oberlyceum) میں تعلیم پا چکے ہوں۔
علاوہ مذکورہ بالا لسانی، وطنی، اور سائنس کے مضامین کے ریاضی، جغرافیہ،
ڈرائنگ، موسیقی اور جمناسٹک کی بھی تعلیم دیجاتی ہے۔ اسی کے ساتھ موسیقی
اور دستکاری کے پرائیویٹ کلاس بھی ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے مدرسوں میں دستکاری اور
کبھی کبھی کھانا پکانا بھی نصاب تعلیم میں داخل ہے۔
عرصہ سے سبق کا گھنٹہ ۴۵ منٹ کا کردیا گیا ہے تاکہ دوپہر تک مدرسہ کا کام
ختم ہوجائے اور بڑے شہروں میں لڑکے اور لڑکیاں ایک تو سہ پہر کے کٹھن گھنٹوں
میں پڑھنے سے دوسرے دوبارہ مدرسہ آنے جانے سے بچیں۔ اب سہ پہر کو صرف کبھی کبھی

گانا اور جسمانی کھیل (مثلاً تیرنا) ہوتے ہیں۔ ورزش جسمانی پر مدرسہ کے آخری درجوں میں خاص طور پر زور دیا جاتا ہے اور اس کے لئے آسانیاں بہم پہونچائی جاتی ہیں۔ طالب علم کو ہفتہ میں ۳۲ گھنٹے (۴۵ منٹ کے حساب سے) پڑھنا اور مدرس کو ۲۲ گھنٹے پڑھانا پڑتا ہے۔

جرمنی کے ہائی اسکولوں میں کام نہایت محنت سے کیا جاتا ہے۔ مگر آج کل کی مالی مشکلات ان کے لئے نہایت خطرناک ہیں، چنانچہ اکثر مدرسے اسی سبب سے بند کر دیئے گئے ہیں۔ ان مدرسوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں دارالاقامہ کا نظام تقریباً مفقود ہے۔ صرف معدودے چند پرانے رئیسوں کے مدرسوں میں دارالاقامہ کا انتظام ہے۔ چنانچہ عموماً طالب علم اپنی ہشت یا دوازدہ سالہ تعلیم کے زمانہ میں سبق کے بعد اپنے والدین کے گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ تعلیمی اثر (یا اکثر صورتوں میں محض "مدرسی اثر") صرف چند گھنٹوں تک (صبح آٹھ بجے سے ڈیڑھ بجے تک) محدود ہوتا ہے۔

جنگ کے بعد سے کیونکہ لوگوں نے غریب طالب علموں کے لئے کھانے کا انتظام کیا ہے اس لئے سبق کے بعد ان بچوں کو کھانا بھی کھلایا جاتا ہے، ورنہ طالب علم اپنا ناشتہ گھر سے ساتھ لاتے ہیں۔ سبق کے گھنٹوں کے درمیان پندرہ پندرہ منٹ کے وقفے ہوتے ہیں اور ایک وقفہ آدھے گھنٹہ کا جنھیں بچے مدرسہ کے سامنے وسیع میدان میں گذارتے ہیں۔ مدرسوں کی نئی عمارتوں کے لئے لازمی ہے کہ حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق بنائی جائیں۔

آخر میں ہم طلباء کی اصلی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ہمارے بزرگ اب تک بیان کیا کرتے ہیں کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ میں مدرس پروفیسرانہ جاہ وجلال کے ساتھ درجہ میں داخل ہوا کرتے تھے اور خاص تمکنت کے ساتھ اپنی کرسی پر رونق افروز ہو کر طالب علموں پر قہر و غضب کا نزول اور بے پناہ اور لرزا دینے والے بید کی بوچھار کیا

کرتے تھے۔

انسانی تعلق کے اعتبار سے اِن میں اور طالبعلموں میں ایک بے پایاں خلیج حائل تھا۔ اس باب میں تو چندسال سے اصولی تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ مدرس اپنے شاگردوں کے ساتھ سیر کو جاتے ہیں، کشتی چلاتے ہیں، تیرتے ہیں۔ اکثر نئے نوجوان مدرس طالب علموں سے سچی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہو کہ جسمانی سزا کے موقوف ہوجانے کے بعد سے سبق میں بھی بجائے درشتی کے نرمی اور ملاطفت سے کام لیا جاتا ہو۔ مدرسوں میں اجتماعی زندگی، جسمانی کھیل اور اکثر جگہ طالب علموں کے آرچسٹرا اور تھیٹر فروغ پا رہے ہیں۔ بلاشبہ نئی پبلک مدارس میں آزاد تر روح کام کررہی ہو باوجودیکہ کافی تعداد میں ایسے معلم موجود نہیں جو حقیقی طور پر زندہ دل اور جوان طبیعت ہوں پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پبلک اسکولوں کا نظام ہی اس قسم کا ہو جو لڑکپن کی اسپرٹ کا دشمن ہو۔ مثلاً درجوں میں طلباء کی کثرت (آج کل ایک مدرس کی نگرانی میں فی درجہ پچاس سے کم لڑکے نہیں ہوتے) اوقات تعلیم کا مختلف مضامین کے گھنٹوں میں تقسیم ہونا، اور نام نہاد مدرسہ کی سزائیں۔ اگر ان مدرسوں کی تعلیم سے جسمانی اور روحانی اعتبار سے انسان کامل بنانا مقصود ہو تو ابھی بہت اصلاح کی ضرورت ہو۔ ان اصلاحات کا ذکر میں کسی آئندہ مضمون میں کروں گا۔ فقط

نامۂ جوہر

بنام

عبدالماجد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چھنڈواڑہ ۱۰۔ نومبر ۱۹۱۶ء

مکرمی۔ السلام علیکم۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کے ملازم صاحب نے ایک خط آپ کا ضرور تلف کر دیا مگر اس کے بعد کے دونوں خط مورخہ ۲۵ ستمبر و ۱۱۔ اکتوبر مجھے ملے میری اس خاموشی سے آپ ضرور متردد اور غالباً ناخوش بھی ہوگئے ہوں گے مگر میرے عذرات سنکر ضرور مجھ سے ہمدردی بھی فرمائیں گے آپ کا پہلا عنایت نامہ مجھے ۲۸۔ ستمبر کو ملا۔ یکم اکتوبر کو مسٹر منظم علی میرے سالے بانکی پور سے معہ اپنی بیگم صاحبہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے تشریف لائے چونکہ والدہ رامپور گئیں اور میری اہلیہ کو صحت کامل نہ ہونے پائی تھی اس لئے خانہ داری کا تھوڑا بہت کام میرے بھی متعلق تھا۔ یہی کچھ کم نہ تھا کہ مجھے تیمارداری بھی کرنا پڑی اور وہ بھی ایک نرس کی طرح۔ میرا منجھلا سالا بانکی پور ہی سے بخار ساتھ لایا تھا۔ یہاں دو روز بعد ڈاکٹر نے ٹائیفوائڈ تشخیص کیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ اس عمر میں مرض سخت ترین امراض میں سے ہوتا ہے۔ اور علاج سوائے نرسنگ کے کچھ نہیں۔ شوکت صاحب تو ہمیشہ کے بڑے تیماردار تھے اب کی بار بالکل بیکار ہوگئے ایک ناتجربہ کار ڈاکٹر نے ایک کچی پھڑیا میں نشتر لگا دیا معدہ خراب پہلے ہی سے تھا۔ (Enithemia) میں مبتلا ہوگئے اور سخت تکلیف رہی دس بارہ دن برابر مسہل رہی تب جاکر چلنا پھرنا

نصیب ہوا میں اپنی چھوٹی لڑکی کی تیمارداری نا یفوائڈ میں حال ہی میں کر چکا تھا میری اہلیہ سخت
علیل رہی تو ان کی تیمارداری بھی مجھی کو کرنا پڑی ان امراض مبہم نے مجھے چھمنداوڑہ کی اچھی
خاصی مس فلارنس نائٹنگیل بنا دیا تھا یہ تو امر مسلمہ ہے کہ "ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی
ایک طرف" اپنے سالے کی تیمارداری میں ایسا منہمک ہو گیا اور ایسا منہمک ہونا پڑا کہ آپ
کو ایک کارڈ بھی اطلاعاً نہ لکھ سکا کہ دونوں عنایت نامہ مل گئے میرے متعلقین کو اس کوردہ
میں پڑے پڑے ایک سال ہونے کو آیا تھا مگر مجھے تنہا چھوڑنا بھی کسی کو گوارا نہ تھا دوسرے
لے دے کر صرف ڈھائی سو روپیہ کے وظیفہ پر معاش تھی اب جب تک اس
subsistence allowance پر ایک separation allowance کا اضافہ نہ ہو ان لوگوں
کو علیحدہ رکھنے کی نظر بندی بجٹ میں گنجایش بھی نہ تھی ایک ہنڈیا بھی مشکل سے چڑھنے
پاتی تھی دو ہنڈیوں کا چڑھنا معلوم۔ مگر یہ بھی سوچتا تھا کہ ہم تو پھر بھی شہر میں چل پھر
لیتے ہیں رہتے رہتے بہت لوگوں سے واقفیت ہو گئی ہے۔ دوسرے اپنے افکار اشتغال
کا کام دیتے ہیں ان بیچاروں کے لئے تو یہ بھی موجود نہیں سوائے دو ایک گھروں کے کہیں
آنا جانا نہیں "ملا کی دوڑ مسیت تک" اگر ہوا خوری کے لئے باہر گئے بھی تو سول لائینس
میں دو ایک جگہ حدود میونسپلٹی سے باہر نکلنے پر بند نظر بندوں کے پر جلتے تھے پھر گھر میں مبہم
بیماریوں کا ہونا اور خصوصاً موتی جھرا کے دو واقعات پے درپے۔ اس لئے گورنمنٹ کو
لکھا کہ جس زمانہ میں یہ subsistence allowance مقرر ہوا تھا صرف میرا بار اس پر
تھا اور میں نے در اصل اصولاً اس پر زور دیا تھا۔ اور بھائی حیلی Halley سے "دوستانہ"
خط و کتابت عرصہ تک صرف اصول کے لئے جاری رکھی تھی مگر ہمدرد کے بند ہو جانے
کے بعد صرف یہ ہی ایک ذریعہ معاش کا میرے اور میرے متعلقین کے لئے رہ گیا تھا۔ میرے
ہی لئے کافی نہ تھا۔ مگر "ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر" کے اصول پر جس طرح
بن پڑا اب تک کام چلایا مگر اس الاؤنس کے دو ٹکڑے کرنا اور چھ چھ برس کے دو ملازم

نوکر رکھنا برابر ہے سفر خرچ کی بھی گنجائش نہیں ہے سفر خرچ دیا جائے اور الاؤنس میں اضافہ کیا جائے یہ تحریر اب گورنمنٹ ہند کے "زیر غور" ہے نہ معلوم خزانۂ عامرہ کی کیا کیفیت ہے، تہی ساغری ہے یا لبریزی بہرحال متعلقین کا زیادہ رکھنا مناسب نہ تھا۔ ان کو یکم نومبر کو براہ بانکی پور رام پور روانہ کردیا ڈھائی تین ماہ بعد پھر آجائیں گے والدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم تنہا رہ گئے تو بیچاری فوراً رخت سفر باندھ چلدیں اور ۵ کو یہاں آگئیں آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اب تک مجھے کس قدر کم فرصت ملی ہوگی ۱۰ تک تو عزیزی مسعود کو حرارت رہی اس کے بعد جاکر ٹوٹی اور بفضلہ تعالیٰ صحت کامل حاصل ہوگئی مگر ۱۲ تک سخت تردد تھا۔

اس قدر لمبی چوڑی معذرت کے بعد آپ کے عنایت ناموں کا جواب دیتا ہوں۔ بھائی علوی[۱] مجھ سے کچھ خفا ہیں کہ اب تک فلسفۂ اجتماع[۲] کی جلد روانہ نہ کی۔ مجھے پہلے بھی خوف تھا اور اب تو آپ کے لکھنے سے اس خیال کو اور تقویت ہوگئی کہ آپ کو اجتماع سے نفرت ہی مگر تعجب ہے کہ صاحبزادہ[۳] صاحب کو بھی اجتماع سے نفرت ہے اور آپ کو بھی اور پھر دونوں میں نبھ سکی[۴] نہ معلوم نفسیات القرآن[۵] میں آپ وامرہم شوریٰ بینہم اور وشاورہم فی الامر کی شان میں کیا فرمائیں۔ بہرحال میں فلسفۂ اجتماع کے دیکھنے کا مشتاق ہوں، ظفرالملک صاحب سے کہکر جلد روانہ کرائیے۔

---

۱ مولوی ظفر الملک علوی، منیجر الناظر بک ایجنسی، جن کے زیر اہتمام فلسفۂ اجتماع طبع و شائع ہوئی تھی

۲ مکتوب الیہ کی کتاب جو چند ماہ قبل شائع ہوئی تھی۔

۳ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب

۴ مکتوب الیہ نے چند ہفتہ کانفرنس میں صاحبزادہ صاحب کے ساتھ بطور آنریری اسسٹنٹ سکرٹری کے کام کیا تھا

۵ اس نام سے ایک کتاب اس وقت مکتوب الیہ کے زیر تحریر تھی، مگر تمام نہ ہوسکی۔

پر تو میں اپنی رائے دے چکا ہوں، Psychology of Leadership[1]

سر ویلنٹائن چرول[2] ایک ...... و بد باطن شخص نہ معلوم اس کی تعریف کی آپ نے کس طرح وقعت کی وہ ہمارے لئے غلامی اور اپنے لئے خواجگی ہی کو پسند کرتا ہے - ابھی حال میں اونہوں نے میرے ایک ...... صفت دوست جگندر سنگھ صاحب کے لکچر میں صدارتی تقریر کی تھی اور فرمایا تھا کہ ۴۰ برس سے اونہیں مشرق بلا رہا تھا - اونکی مشرق کی حال پر یہ بڑی ہی نوازش ہوئی کہ تشریف لائے "خانہ خانہ تست" مضمون ہے مگر کاش اون کو جارہی سال سے مغرب بھی پکارتا[3] اور وہ اس کے حال پر کرم فرماتے اور وطن مالوف کی طرف مراجعت فرماتے۔ مگر ان لوگوں کی صرف یہی سزا ہے کہ قانون قدرت ان کے خاطر نہیں بدل سکتا جو دوسروں کے لئے گڑھا کھودتا خود اوسی میں گرتا ہے غلامی کو دوسروں کے لئے پسند کرنا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے خود اپنی غلامی کا - اگر اجتماع ہمارے لئے برا سمجھا جاتا ہے تو کل کو خود ایسا لکھنے والوں کے لئے بھی برا سمجھا جائے گا روما کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے تاریخ اسلام خود اسی کی شاہد ہے - جس طرح آپ مجھے لکھ رہے ہیں اوس سے تو نفسیات القرآن کے متعلق بھی میرا خوف روبترقی ہے "ناطر فدارانہ طرز ادا[4]"، مخالفین کے رام کرنے کے لئے شوق سے استعمال کیجئے - لیکن اگر آپ کا قلب بھی "ناطر فدار" ہے اور وہ حصۂ جسم بھی جس میں ایمان جاگزین ہوتا ہے محض ایک لوح سادہ ہے جس پر Psychology کی بدولت کچھ نقوش منقش ہوں گے تو ایک مسلم اور مومن سے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ

---

[1] مکتوب الیہ کی انگریزی کتاب جس پر مولانا محمد علی اپنے دو پچھلے والا ناموں میں مفصل مبسوط تنقید کر چکے ہیں۔

[2] انگلستان کا نامور جرنلسٹ لندن ٹائمز کا سابق فارن ایڈیٹر اس وقت شملہ پر والسیرائے کا مہمان تھا اس نے مکتوب الیہ کی کتاب مذکورہ بالا کی داد دی تھی۔

[3] جنگ انگلستان و جرمنی کو چھڑے ہوئے چوتھا سال تھا۔

[4] مکتوب الیہ کے الفاظ ہیں۔

آپ کو مسلم اور مومن بھی سمجھے جب ایک بار قلب نے اعتراف و اقبال کر لیا کہ آمنّا و صدّقنا تو پھر تو یہی صادق آنا چاہیئے کہ " مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے " گو روئے سخن صرف خدا اور رسول ؐ کی طرف ہونا چاہیئے نہ کہ ہر گیسو دراز و ریش دراز کیطرف۔ میں اجتہاد پر ایمان رکھتا ہوں اور اس کو بسا ضروری بلکہ لابدی سمجھتا ہوں گورانہ تقلید میرا ہرگز مذہب نہیں اگر آپ اس طرح لکھیں کہ اپنا ایمان مقدمہ کتاب میں واضح ہو جائے اور محض اس ([illegible]) کی تشریح اصل کتاب میں ہو جس سے خود آپ کے قلب کی لوحِ سادہ پر بتدریج ایمان اور عقیدہ منقش ہوتا گیا تا کنا طرفدار تو نا طرفدار خود مخالفین کے دلوں پر کے کفر و شرک کے نقوش دھندلے پڑتے جائیں اور بتدریج مٹ جائیں اور پھر ورق سادہ پر آپکے کتاب کلمہ لا الہ الا اللہ و محمد الرسول اللہ جلی حروف میں لکھدے تو واقعی میں آپ کی نفسیات کی قدر کروں گا۔

برادرم۔ ایمان ہر شے پر مقدم ہے اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں نے جب حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو خلیفہ اول بنایا تو در اصل اس امر کا اعتراف کیا کہ ایمان ابوبکر ؓ، عدل عمر ؓ غنا، و حیا، عثمان ؓ اور فقر و شجاعت علی ؓ سے بھی زیادہ قابل قدر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آفتاب محمدی بہ تقاضائے فطرت لبشری ۲۳ سال کی نبوت کے بعد غروب ہو گیا اور سارے عالم پر اندھیرا سا چھا گیا تو جو لوگ اپنے ہر امر میں اس کی شمع ہدایت کی روشنی کے عادی ہو گئے تھے، خدا کی دی ہوئی آنکھیں بھی گویا کھو بیٹھے اور بعض مولفتہ القلوب کے مرتد اور زندیق ہو جانے سے اون کے ایمان بھی تھوڑی دیر کے لئے معرض خطر میں آ گئے یہاں تک کہ حضرت عمر ؓ کو سوائے اس کے کچھ نہ سوجھا کہ تلوار نکالکر کھڑے ہو گئے، اور چلّانے لگے کہ اگر کسی نے کہا کہ محمد (روحی فداہ) قضا کر گئے تو اوس کی قضا اوسی وقت اس تلوار کے ذریعہ اوس تک پہنچ جائے گی " ایسے وقت میں وہ آمنّا و صدّقنا کہنے والا آیا اور اس نے ایک بدیہی امر ان سراسیمہ اور پریشان لوگوں

کو جتلایا۔ آفتاب محمدی غروب ہوگیا تہا مگر خدا اکا شمار آفلین میں نہ تھا آفتاب اسلام اسی طرح درخشاں تھا۔ بھائی یہ سب ایمان کے کرشمے تھے یہ فطرت صدیقی تھی۔ اگر کچھ کمی تھی تو اس امین اعظم ؐ کے ایمان نے پوری کردی تھی جبکہ غار ثور میں ابو بکرؓ کو بتایا گیا تھا کہ وہاں سینکڑوں دشمنوں سے خائف اور مارے ڈر کے غار میں چھپے ہوئے صرف بندگانِ خدا ہی نہ تھے بلکہ ایک تیسرا اور بھی وہاں موجود تھا، جو ان دونوں کا نگراں اور نگہبان تھا۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کی تعلیم کے بعد ایمان ابو بکرؓ پختہ ہوگیا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ امینؐ کی خلافت صدیقؓ کو ملی اگر آپ فلسفہ اور استدلال سے مدد لیتے ہیں تو لیجئے مگر صرف اسی طرح اطمینان قلب کے لئے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے مُردہ زندہ کرنے کے متعلق اطمینان قلب چاہا تہا۔ مخالف کے لئے دلیل اور ثبوت کے ہتھیار تیار کیجئے استدلال و تحقیقات کی توپیں اپنے دماغ کے کارخانہ اسلحہ سازی میں ڈھالئے یہ تو ایک مومن کے لئے ضروری ہیں تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جاری رہے جس کے لئے ہم کو خیر اُمتہ کا لقب عطا ہوا ہے مگر کیا تُومنون باللّٰہ قرآن سے خارج کردیا گیا ہے مجھے اگر اعتراض ہے تو اس پر کہ کہیں خود قلب و دماغ "ناطرفدار" نہ ثابت ہوں، اسلوب بیان تمامتر نفسیات ارسطو اور نفسیات کانٹ[۱] کا کس طرح ہوسکتا ہے جبکہ آپ ارسطو اور کانٹ[۲] دونوں کو مرکب من الخطا مانتے ہیں اور ان کی تقلید ہر امر میں فرض نہیں جانتے مگر قرآن حرف بحرف فرمودۂ خدا ہے اور خدا خاطی نہیں ہوسکتا۔ آپ شوق سے اُسے فرمودۂ خدا ثابت کیجئے اور خدا کو غیر خاطی بھی ثابت کیجئے مگر خود آپ کے قلب کو مستغنی عن الحجۃ ہونا چاہئے بھائی جنتی شاعری چاہو باہر کی عورت پر صرف کرو اور اوسے لبھاؤ اور رام کرو مگر گھر کی بیوی تمہاری ہے نہ دوسرے پر نظر ڈال سکتی ہے نہ اوس کو

---

[۱] مکتوب الیہ نے (خدا اس کے گناہ کو معاف کرے) جس پر اُس وقت تک تل، اسپنسر کی پیدا کی ہوئی لاادریت (agnosticism) پوری طرح مسلط تھی، یہ لکھا تھا کہ نفسیات القرآن کا اسلوب بیان تمامتر اسی طرح کا ہوگا جس طرح نفسیات ارسطو یا نفسیات کانٹ وغیرہ کا ہوسکتا ہے۔

[۲] جرمنی کا مشہور فلسفی۔

تمہارے گریہ وزاری اور التماس وگذارش کی ضرورت ہے بلکہ اصل تو یہ ہے کہ بقول میرے
؎ نہ تبسم کی ضرورت نہ نگہ کی حاجت ، نہیں جز دل کے توسل کوئی دل آنے میں۔ غزالی کا فلسفہ
مجھسے زیادہ آپ نے پڑھا ہوگا۔ انکی احیاء العلوم کا اگر فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوگیا ہوتا تو ڈی
کارٹ[1] کو دنیا چور سمجھتی۔ مگر اون کی تصنیف کردہ سیرۃ بلکہ سوانح قلبی، دماغ کو ملاحظہ فرمائے
آخر میں اسی کا اعتراف ہے کہ اصل وہی مشاہدہ ہے جو حسیات ظاہری سے مستغنی اور استدلال
و حجت سے بے نیاز ہے خدا نے ہم پر بڑا رحم فرمایا کہ مسلمان کے گھر پیدا کیا (Heredity
کا رجحان اسلام و توحید کی طرف تربیت اسلام اور توحید کے دائرہ میں، اگر اس پر ہمارے فلسفہ
نے ہماری امداد کی ہے تو سونے پر سہاگہ ہے۔ اسلام اور ایمان کو اور بھی تقویت ہوگئی اور
عقل و نقل دونوں کی زد سے باہر ہوگئے اب نہ ارسطو کا جادو چل سکتا ہے نہ کانٹ کا۔ مگر
صرف استدلال ہی پر اگر بھروسہ ہے اور خود اپنی عقل پر اس قدر زعم ہے کہ جو اُس میں نہ سمائے
وہ خدا نہیں اور جو اس میں نہ آئے وہ ایمان نہیں تو اس کا جواب صرف یہی ہے کہ
"پائے استدلالیاں چوبیں بود" اور باوجود اس کے کہ میرے اور شاید آپ کے بھی اوستاد
(شبلی مرحوم) آخر عمر میں اسی مینت سے چلتے تھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ
"پائے چوبیں سخت بے تمکین بود" خواہ کسی طرح تفسیر کیجئے مگر قرآن خود صاف صاف کہہ چکا ہے
کہ علم انسانی بہت ہی کم ہے میں اس کا ضرور قائل ہوں کہ خواہ کسی قدر کم کیوں نہ ہو
وہ خدا کی دین ہے اور ایمان کے بعد اوس کی بہترین دین بلکہ اوس کے بغیر ایمان کمزور
رہتا ہے اس لئے اس کا پورا پورا استعمال کرنا چاہئے اور ایمان کے لئے علم کا پشتہ
ایمان کو مستحکم کرنے والا ہوتا ہے اس لئے اس کے ذریعہ سے ایمان کا استحکام کرنا
چاہئے مگر زعم علم سے حذر اور پرہیز کرنا ضروری ہے خدا کی رحمت ہو اقبال پر خوب
مولانا رومؒ کا اتمام کر رہا ہے ؎

---

[1] فرانس کا مشہور فلسفی۔ فلسفہ جدید کا بانی اول ہے۔

پرزن واز جذب خاک آزاد باش | ہمچو طائر ایمن از افتاد باش[1]
تو اگر طائر نۂ اے ہوشمند | بر سرِ غار آشیانِ خود مبند
اے کہ باشی درپئے کسبِ علوم | با تو می گویم پیام پیر روم
"علم را بر تن زنی مارے بود | علم را بر دل زنی یارے بود"
آگہ از قصۂ آخوند روم | آنکہ داد اندر حلب درس علوم
پائے در زنجیر توجیہات عقل | کشتیش طوفانیٔ ظلمات عقل
موسیٔ بیگانۂ سینائے عشق | بیخبر از عشق و از سودائے عشق
از تشکک گفت و از اشراق گفت | وز حکم صد گوہر تابندہ سفت
عقدہائے قولِ مشائین کشود | نور فکرش ہر خفی را وا نمود
گرد و پیشش بود انبار کتب | بر لب اُو شرح اسرار کتب
پیر تبریزی ز ارشاد کمال (شیخ کمال الدین جندی رحمۃ اللہ علیہ) | جست راہِ مکتب مُلّا جلال
گفت این غوغا و قیل و قال چیست | این قیاس و وہم و استدلال چیست
مولوی فرمود نادان لب ببند | بر مقالات خردمندان مخند
پائے خویش از مکتبم بیرون گذار | قیل و قال است این ترا با وی چہ کار
قالِ ما از فہم تو بالاتر است | شیشۂ ادراک را روشنگر است
حرف مُلا شمس را احدت فزود | آتشے از جانِ تبریزی کشود
بر زمین برقِ نگاہ اُو فتاد | خاک از سوز دمِ او شعلہ زاد
التہاب دل خسِ ادراک سوخت | دفتر آن فلسفی را پاک سوخت
مولوی بیگانہ از اعجازِ عشق | ناشناسِ نغمہائے سازِ عشق

---

[1] یہ تمام اشعار اسرار خودی کے ہیں۔

گفت این آتش چسان افروختی — دفترِ ارباب حکمت سوختی
گفت شیخ اے مسلمِ زنّار دار — ذوق و حال است این ترا با وی چہ کار
حالِ ما از فکرِ تو بالاتر است — شعلۂ ما کیمیائے احمر است
ساختی از برفِ حکمت ساز و برگ — از سحابِ فکرِ تو بارد تگرگ
آتشے افروز از خاشاکِ خویش — شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش
علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است — معنیٔ اسلام ترکِ آفل است
چوں ز بندِ آفل ابراہیم رست — در میانِ شعلہ ہا نیکو نشست
علمِ حق را در قفا انداختی — بہرِ نانے نقدِ دین در باختی
گرم رَو در جستجوئے سرمۂ — واقف از چشمِ سیاہِ خود نۂ
آبِ حیوان از دمِ خنجر طلب — از دہانِ اژدہا کوثر طلب
سنگِ اسود از درِ بتخانہ خواہ — نافۂ مشک از سگِ دیوانہ خواہ
سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجو — کیفِ حق از جامِ این کافر مجو
مدّتے محوِ تگ و دَو بودہ ام — راز دانِ دانشِ نَو بودہ ام
باغبانان امتحانم کردہ اند — محرمِ این گلستانم کردہ اند
گلستانے لالہ زارِ عبرتے — چوں گلِ کاغذ سرابِ نکہتے
تا ز بندِ این گلستان رستہ ام — آشیان بر شاخِ طوبیٰ بستہ ام
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است — بت پرست و بت فروش و بتگر است
پا بزندانِ مظاہر بستۂ — از حدودِ حس برون ناجستۂ
در صراطِ زندگی از پا فتاد — بر گلوئے خویشتن خنجر نہاد
آتشے دارد مثالِ لالہ سرد — شعلۂ دارد مثالِ ژالہ سرد
فطرتش از سوزِ عشق آزاد ماند — در جہانِ جستجو ناشاد ماند

عشق افلاطونِ علت ہائے عقل ۔۔۔ بہ شود از نشترش سودائے عقل
جملہ عالم ساجد و مسجودِ عشق ۔۔۔ سومناتِ عقل را محمودِ عشق
ایں مے دیرینہ در میناش نیست
شورِ "یارب" قسمتِ شبہاش نیست

لکھنے بیٹھا تھا خط۔ مگر لکھہ گیا اقبال کی مثنوی شریف۔ مگر چونکہ بحیثیت ادب کے اس کا پایہ میری نثر سے اوتنا ہی اونچا ہے جتنا کہ زمین سے آسمان کا۔ اور آپ باوجود فلسفی ہونے کے ادب کو استدلال سے مرجح سمجھتے ہیں اس لئے اسرار خواری کا یہ حصہ نقل کر دیا گیا امید ہے کہ تشفی ہوگی۔

رہا ظریف[۱] مرحوم کا معاملہ۔ اوس کی حقیقت یہ ہے کہ مجھے مرحوم سے بید محبت تھی اور میں اون کی قابلیت اور اس سے زیادہ اون کی محبت کا قدردان تھا مگر اون کی فلسفیانہ گفتگو کو میں ہمیشہ ہذیان سرائی سمجھا اور وہ مجھے اوس کا قدردان نہ پاکر محض اپنی ادبیت ظرافت اور محبت سے محظوظ فرمایا کرتے تھے۔ اپنی معقولات مجھ سے معقول تر دوستوں کے لئے محفوظ رکھتے تھے، عقلیات کی ایک کاپی تحفۃً مجھے بھی دی مگر میں نے اون کی محبت کا پاس کرکے کبھی اُسے کھولکر بھی نہ پڑھا۔ ممکن ہے کہ کامریڈ کی لائبریری میں ابھی تک موجود ہو ممکن ہے کہ کوئی لیگیا ہو۔ چند اور خیالات پریشان غالب کے الحاد

---

[۱] پروفیسر ظریف محمدؒ۔ ایم۔ اے مرحوم صوبہ سرحدی کے باشندے، علیگڈھ سے ایم۔ اے کیا، اوہیں منطق کے پروفیسر ہوگئے، زندگی بھر دہریت کے قایل رہے، اور اسکی تبلیغ کرتے رہے عقلیت و اسلام کے نام سے ایک مہمل کتاب بھی شایع کی عین عالم شباب میں دفعۃً وفات پائی موت سے ذرا قبل اپنی دہریت سے تایب، اور پختہ مسلمان ہوگئے تھے مکتوب الیہ نے مولانا محمد علی سے سوال کیا تھا کہ آپ پر اسقدر مذہبی تقشف غالب ہے، آپ سے ظریف سے کیونکر نباہ ہوا"؟۔ یہاں سے اس کا جواب ہے۔

کے متعلق اونہوں نے تحریر فرمائے تھے وہ کسی دوست کی جیب میں جو ہم سے یہاں ملنے آئے تھے پڑے ہوئے ملگئے میں نے دیکھا تو اون کی اس بے موقع "ظرافت" پر افسوس ہوا۔ اونہوں نے ناحق اپنے ساتھ غالب جیسے موحد وسلم کو بھی لینا چاہا تھا اسی سے ان کی عقلیت کی نامعقولیت واضح تھی جنگ طرابلس میں میرا "اسلامی" جوش اون کے "قومی" سے کم نہ تھا۔ نہ معلوم کس طرح وہ ترکوں کو اپنا ہم قوم سمجھتے تھے بہرحال جوش ضرور تھا اور اٹلی سے سخت نفرت۔ اس کے بعد میں دہلی چلا آیا۔ بلقان کی لڑائی چھڑی ترکوں کو پیہم شکستیں ہوئیں بہ ظاہر خدائے قادر و توانا حی وقیوم کی بارگاہ میں ہماری دعائیں نامسموع ثابت ہورہی تہیں یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک دن تو میں نے خودکشی ہی کرلی ہوتی مگر حرام موت مرنے سے خوف خدا مانع ہوا اسی زمانہ میں ظریف مرحوم کا ایک خط آیا۔ نام ندارد تھا مضمون خط صرف ایک مصرع غالب کا تھا ع "دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز" مطلب یہ تھا کہ دعا وغیرہ سب کچھ لغو ہے جن کے پاس توپ گولہ نہیں وہ ضرور ہار لگا نہ دنیا کا کوئی خدا ہے نہ اوس کا کوئی بندہ۔ نہ وہ بندہ نواز۔ بندگی بیکار ہے اون کی عقلیات صرف یہیں تک راستہ روشن کرتی تھی مگر ۲۱۔ جون ۱۹۱۳ء کو ایڈریا نوپل پھر غازی انور پاشا ادام اللہ نیفنہ کے قبضہ میں آگیا اور دائرہ حکومت اسلام میں از سر نو داخل ہوا اور شبلی مرحوم کا شعر جو انصاری صاحب کے مشن کی واپسی والی نظم میں تھا صادق آیا ؎ عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے ٭ کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں اس کو عقلیات کہیے یا نقلیات بہرحال شبلی مرحوم کا شعر ظریف مرحوم کی "ظرافت" سے صحیح تر اسی وقت ثابت ہو چکا تھا۔ اکبر کے "بحمد اللہ اب خون شہیدان رنگ لایا ہے"۔ والے قطعہ نے صحیح ترین ثابت کر دیا۔ میں مرحوم سے اوائل ۱۹۱۴ء میں کلکتہ میں ملا۔ ہم دونوں تفریح کے لئے چندر نگر گئے تھے اور شب ماہ میں دریائے ہگلی کی سیر ساتھ ساتھ کی تھی۔ پچھلی "قومیت" کا دریا پھر موجزن تھا۔ وہ تو یہی کہتے تھے کہ یہ اسلام اور ایمان نہیں ہے۔

مگر ایمان چھپائے سے نہیں چھپتا۔ قرآن کریم کے بے مثل ادب کے قائل تھے هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ کے ادب پر وجد کرتے تھے اس کے چند ماہ بعد میں رام پور گیا اور نظر بند ہوا۔ وہاں نصیر حسین خاں خیال کا خط آیا کہ مرحوم تفریحاً ایام فرصت میں ورگا بیٹم گئے تھے۔ وہاں سے تار آیا ہے کہ ان کا یکایک انتقال ہوگیا۔ ان کے پسماندوں کو اطلاع دیدو کہ مال و اسباب لے جائیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ مرحوم پر آج ہم سے کہیں زیادہ اسرار ہستی آشکارا ہوگئے ہوں گے امید ہے کہ خاتمہ اسلام اور ایمان پر نہ کہ غفلت پر ہوا ہو دل سے مرحوم کے لئے وہ دعا نکلتی ہے جس کے قبول ہونے کا ویسا کبھی اقبال نہ تھا۔ آپ کو تو بفضلہ تعالیٰ خدا اور رسول کا انکار نہیں ہے۔ برائے خدا اور رسول اپنی عقل وتمیز۔ علم وتحقیقات کو اسلام اور صرف اسلام کے لئے وقف کردیجئے اور اس دانش حاضر کے حجاب اکبر میں مستور ومحجوب نہ رہئے۔

آپ نے مارگولیتھ[1] کا ذکر فرمایا ہے میں وہ بدنصیب ہوں کہ اس ۔۔۔ سے آکسفرڈ میں عربی پڑھی ہے۔ عربی اس کی مادری زبان ہے۔ قابلیت علمی بے شک بہت رکھتا ہے مگر دشمن اسلام ہے اور سب سے زیادہ زہر اگلو دکتاب سیرۃ نبوی پر اسی لئیم کی تصنیف کردہ ہے۔ مجھے خوف ہے کہ ہمارے لٹریری توجہ ان اس کے

---

[1] پروفیسر مارگولیتھ، آکسفرڈ میں عربی کا پروفیسر۔ اسلام پر متعدد تصانیف کا مصنف پنجاب یونیورسٹی کی دعوت پر تاریخ اسلام پر لکچر دینے ہندوستان تشریف لائے اور مکتوب الیہ کی دعوت پر لکھنؤ کو بھی سرفراز فرمایا۔ اس زمانہ میں مکتوب الیہ ان بزرگوار کی دوستی پر مفتخر تھا۔

پھندے میں آکر نبی اُمّی (روحی فداک یا رسولؐ اللہ) کو عرب کا لیڈر اعظم نہ سمجھنے لگیں" اور رحمتہ للعالمین کے خدائی لقب سے محروم نہ کردیں سر ولیم میور کی سیرۃ میں سید احمد خان مرحوم نے یہی سب سے بڑا عیب اور پوشیدہ مطلب ڈھونڈھ نکالا تھا اور خطبات احمدیہ اسی غرض سے لکھکر بہ صرف کثیر انگریزی میں ترجمہ کراکے طبع کرائی تھی۔

ھمدم سے میں ہرگز خوش نہیں نہ اس سے زیادہ کی اوس سے توقع تھی۔ اس جنگ کے خاتمہ پر ایک جنگ اور چھڑ گئی اور وہ بھائی جالب سے میری ہوگی بنائے مخاصمت (Mamma Dada) وہ دو چشمی "ھ" ہوگی جو اون کے ہمدم کے پیچھے لگی ہے۔ خدا کی مار ہو ھمدرد کو اگر اوس نے ہمدم کے قالب میں جنم لیا ہے۔ اور خدا سمجھے میرا کبر حسین "ابن الوقت معروف بہ لسان العصر" سے جنہوں "ہمدرد کی سرخی" وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا[ف] کو ہمدم کے لئے یوں بدلا ہے۔

میری غزلوں کی تعریف وہ فرمائیں یا آپ یا آپ کے احباب، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ادب میں داخل نہیں ہیں محض میرے درد کی آوازیں ہیں دیکھئے کبتک رہے والی زمین شگفتہ کیوں کر ہوسکتی ہے گو چشم انتظار وا ہونے سے شگفتہ چیزوں میں شمار ہو سکے نوادر بات ہے۔

حال میں چند اشعار لکھے ہیں، اور لکھکر غزلیں پوری کروں گا غالب کا ایک شعر مانع اظہار وحشت ہو رہا ہے اور ورد زبان ہے اوسی کی ردیف کو اور بھی محدود کرکے غزل لکھہ رہا ہوں۔ وہ شعر یہ ہے۔

ف ہمدم سرورق پر سالہا سال تک حضرت اکبر کی ایک رباعی درج ہوتی رہی، جس کا چوتھا مصرعہ یہ تھا "لایل سبجکٹ تم برٹش کے رہو"۔

ف مکتوب الیہ نے لکھا ہے کہ "بہار دیکھئے کبتک رہے، نگار دیکھئے کبتک رہے" والی غزل زیادہ شگفتہ زمین میں تھی۔

ﮯ چاک مت کر جیب بے ایام گل — کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

اس پر چند اشعار لکھے ہیں۔ ﮯ

صبر بھی شرط غمخواری کی ہے — ضبط کا یاروں میں یارا چاہیئے

تھک کے کہتا ہی جنوں کیا حجاب — خاک اُڑانا آشکارا چاہیئے

دشمنوں سے گر "تلطف" ہی تو کچھ — دوستوں سے بھی مدارا چاہیئے (حافظ تو "تلطف" کی صلاح دیتے تھے مگر آجکل اس ہم غنیمت)

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے — اک فقط تیرا سہارا چاہیئے

نہ معلوم کیوں ان ایام حج بیت اللہ میں باربار یہ شعر زبان پر آتا ہی ﮯ

تم تو کعبہ کے خدا تھے پھر نکالے کیوں گئے ؛ اے بتو! کیسی خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی

اس پر صرف ایک شعر خود بھی لکھدیا ہی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ بے اختیار زبان پر آ گیا۔

مستحقِ دار کو حکم نظر بندی ملا ؛ کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی!!!

دیکھیئے یہ دونوں غزلیں کب پوری ہوں۔ ﮯ

اب رخصت ہوتا ہوں امید کہ میری مذہبی نقادی بار خاطر نہ ثابت ہوگی۔ خوب یاد آیا **المعارف** میرے پاس نہیں آتا شکر خدا کہ بھائی ظفر الملک نے **الناظر** تو بھیجنا شروع کر دیا ہاشمی جوہر و **حسرت** کی لے میں کچھ لکھ گئے، مگر سنا ہی کہ **جوہر** پر پہلے بھی کچھ لکھا تھا۔ دیکھنے کا خواہشمند ہوں میں تو پہلے سے اس کا قایل ہوں۔

تم ہو تو نذر عشق، نہ لکھیں وہ مرثیہ ؛ یہ بات ہی مُروّتِ اہل سخن سے دور

آپ کا خیر طلب

محمد علی

ﮯ مجموعہ کلام جوہر میں اب یہ غزلیں مکمل اور اصلاحی شکل میں شایع ہو چکی ہیں۔ یہ اشعار وہ ہیں جو غزل کے مکمل ہونے تک اس شکل میں باقی نہ رہے۔ لیکن غزل کی تکمیل کا باعث ہو گئے۔

(مدیر جامعہ)

سیرۃ النبی پر ایک نظر

اردو میں سیرت نبویہ کا معروف نسخہ مؤلفہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم میری نظر سے گذرا چونکہ کتاب دینی وعلمی ہے اور عام لوگ مولانا پر کامل اعتماد رکھتے ہیں اس لئے جو اغلاط اس میں ہوں گے وہ عام ہو جائیں گے اس خوف سے میں نے پہلے حصہ کو سرسری نگاہ سے دیکھا، جس میں ہر قسم کے اغلاط بکثرت پائے، مجملاً اُن کا نمونہ درج ذیل ہے۔ یہ وہ اغلاط ہیں جنمیں تاویل کی گنجایش بہت ہی کم اور بحث کا موقع کالعدم ہے ان کے علاوہ اور بھی اغلاط ہیں جن میں بحث کی گنجایش ہے انہیں چھوڑ دیا گیا۔

۱۔ توریت حضرت موسیٰ کے (۳۰۰) برس بعد عالم وجود میں آئی صـ۲ یہ غلط ہے البتہ انجیل تقریباً اس مدت کے بعد انتخاب کیگئی۔

۲۔ کفی للمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع صـ۳۱ (صحیح کفی بالمرء)

۳۔ محمد بن اسحٰق تابعی ہیں۔ متعدد صحابہ کو دیکھا تھا۔ صـ۱۶ اُن کی تابعی ہونے میں کلام ہے سوائے انس کے کسی اور کو دیکھنا تاریخ رجال میں مذکور نہیں ہے۔ محض دیکھنے سے تابعی ہونا غیر صحیح ہے۔

۴۔ ابن البنّی صـ۳۷ وغیرہ (صحیح ابن السُنّی)

۵۔ ابن عباس کی تردید بعض فتاوی حضرت علی صـ۵۲۔ محل بحث سے خارج ہے وہاں سند درکار نہ تھی۔ بلکہ ابن عباس کے نزدیک وہ مسائل خلاف حق تھے یہاں سند سے بحث ہے، پس یہ دعویٰ کرنا کہ ابن عباس نے بغیر سند دیکھے اور ثقہ غیر ثقہ معلوم کئے تردید کی، غلط ہے،

۶۔ حضرت عمار بن یاسر کی حدیث صـ۵۳ محل بحث سے خارج ہے، کیونکہ اس میں عمار نے فقط رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نقل نہیں کیا ہے بلکہ حضرت عمر کا اور اپنا اور دونوں کا واقعہ نقل کیا ہے جس کو حضرت عمر بھول گئے۔ اس بنا پر حضرت عمر نے کلام کیا۔ لیکن جبکہ عمار نے کہا کیا میں اس کو بیان نہ کروں؟ تو کہا نہیں۔ بیان کرو اس سے سند

کی تنقید کئے بغیر تردید کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

۷۔ حضرت عباس و حضرت علیؓ کی نزاع باب فدک ص۵۵ کی حدیث کو غلط کہنا لغو ہے۔ محض اس وجہ سے کہ حضرت عباسؓ نے کچھ سخت و سست الفاظ حضرت علی کو کہے، ایسا معاملہ اکثر غصہ میں ہوتا رہتا ہے حالانکہ یہ حدیث جملہ دواوین اسلام میں صحیح اتفاق سے موجود ہے تواریخ بھی اس کے خلاف نہیں

۸۔ فاطمہ بنت قیس کی حدیث میں مطلق طلاق کے بعد نان و نفقہ نہ ہونا بھی غلط ہے۔ طلاق ثلثہ کے بعد کا ذکر ہے۔

۹۔ بکّہ کے معنی رونے کے اور اوس کو پکار کے ہم معنی سمجھنا ص۱۰۱ غلط اور خلاف لغت ہے۔ بکّہ اور پکار میں نہ تو اشتقاق ہے نہ ہم معنی، بکّہ بمعنی ازدحام و اجتماع ہے۔ کہ مکہ کو بکہ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔

۱۰۔ آیت وطہر بیتی للطائفین والقائمین کے ترجمہ میں ص۱۱۲ لفظ والقائمی کا ترجمہ رہگیا ہے

۱۱۔ ابوطالب کے قصیدہ لامیہ کو سرتاپا موضوع بتانا ص۱۴۳ حالانکہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس کے شعر موجود ہیں نیز خود مولانا شبلی صاحب نے اسی کتاب کے ص۲۳۶ پر اس کا شعر نقل کیا ہے، جسے صحیح خیال کیا ہوگا۔ اس جگہ شعر کے معنی ہی غلط کئے گئے ہیں

۱۲۔ مجاہد بن جبیر ص۱۴۴ (صحیح جبر)

۱۳۔ واصدغ بما تؤمر۔ اور تجھکو جو حکم دیا گیا ہے ص۱۵۳ (صحیح آیت فاصدع)

۱۴۔ حضرت علی نے دعوت کا سامان کیا ص۱۵۴ اس قصہ کی سند نہیں دی

۱۵۔ خاندان تمیم ص۱۵۵ (صحیح تیم)

۱۶۔ عمر بن العاص ص۱۵۶ (صحیح عمرو بن العاص)

۱۷۔ مسیّب فتح مکہ میں اسلام لائے اور ابوطالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے ص۱۸۱ (اس جگہ دو دعوی کئے اور ہر دو بلا دلیل ایک زمانہ اسلام مسیب الد سعید بن المسیب اسکی دلیل بیان کرنی چاہئے، اگر وہ اوس وقت مسلمان نہ تھے تو یہ قصہ بعد از اسلام نقل کیا

ہے پس اس سے آنکو کچھ نفع نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اون کی شہادت بعد از اسلام مقبول و صحیح ہے دوسرا دعویٰ باطل و مردود ہے وہ یہ کہ وفات ابو طالب کے وقت وہ موجود نہ تھے کیا پیدا نہ ہوئے تھے۔ یا مکہ اون کا وطن نہ تھا۔ یا کسی تجارت کے لئے گئے تھے۔ کوئی سند تاریخ سے اس عدم موجودگی کی پیش کی جاتی۔

۱۸۔ ابو الہیثم بن نبہان ص۱۹۲ وغیرہ (صحیح تیّہان)

۱۹۔ منذر بن عمر ص۱۹۴ (صحیح عمرو) ایضاً طفیل بن عمر صحیح عمرو

۲۰۔ زبیری بن مطعم ص۱۹۶ (صحیح جُبَیر)

۲۱۔ سراقہ بن خثعم ص۲۰۰ (صحیح جُعْشُم)

۲۲۔ أفلح مَن یُعَالِج المساجدا۔ ویقرأ القرآن قائماً و قاعدا ص۲۰۲ (صحیح۔ یَظَلّ فیہا قائماً و قاعدا)

۲۳۔ اذان کے متعلق بحث ص۲۰۳ پر نہایت مختصر اور غلط ہے۔

۲۴۔ لنعلم من ینقلب علی عقبیہ ص۲۲۱ (صحیح آیت لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ

۲۵۔ لقد کان لکم آیۃ فی فئتین التقتا (انفال) ص۲۳۴ (صحیح آیت قد کان لکم۔ اور انفال میں نہیں ہے آل عمران میں ہے) چنانچہ صحیح حوالہ ص۲۳۹ پر دیا ہے لیکن ایک غلطی فاحش وہاں بھی ہوئی ہے یعنی یرونہم مثلیہم کی جگہ یرونکم لکھا گیا ہے۔

۲۶۔ فلا تبکی علی بکر ولکن۔ علی بدر تقاصرت الجدود ص۲۴۴ اس شعر کا ترجمہ غلط، اور حاشیہ خبط سے پر ہے، لکھا ہے۔ لکن بکر پر تجھکو رونا نہیں آتا۔ (بکر اسود کا بیٹا بدر میں مارا گیا) حالانکہ بکر اونٹ نر کو کہتے ہیں، قریش نے بدر کے واقعہ کے بعد اپنے مقتولین پر رونے کو منع کر دیا تھا۔ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ فدیہ نہ مانگیں۔ اسود کے تین بیٹے زمعہ عقیل حارث بدر میں مارے گئے تھے اوس کے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی ایک روز کسی کے رونے کا آواز سنا۔ اپنے غلام کو بھیجا کہ جا کر دیکھ آ کیا رونے کی اجازت ہوگئی اوس نے آکر کہا نہیں ایک عورت اپنے اونٹ پر رو رہی تھی

جو گم ہو گیا تھا اوس وقت اسود نے بیساختہ یہ اشعار کہے۔

اتبکی ان یَضِلّ لھا بعیرٌ ویمنعھا من النوم السُّھودُ

فلاتبکی علی بکرٍ ولکن الخ

۲۷۔ ذلک بانہم شاقوا اللہ ورسولہ۔ فان اللہ شدید العقاب ص۲۴۲ صحیح آیت ومن یُشاقِقِ اللہ ورسولہ فان اللہ شدید العقاب، تعجب ہے کہ ترجمہ میں بھی اس کو کاٹ دیا ہے،

۲۸۔ سعد بن عبادہ کی تقریر بابت بدر۔ عدم حضور سعد بن عبادہ بدر ص۲۵۶ صحیح یہ تقریر سعد بن معاذ کی ہے۔ حضور سعد بن عبادہ مختلف فیہ ہے۔

۲۹۔ ان علی اہل اللوا ء حقا۔ ص۲۷۶ نیزہ بردار کا فرض ہے، یہ ترجمہ غلط ہے اہل اللواء یعنی علمبردار ہے بنو عبد الدار قریش کے علمبردار تھے جب بدر میں شکست ہوئی تو قریش نے کہا یہ تمہاری کوتاہی ہے اوتھیں اون سے جھنڈا چھین لینا چاہا اونہوں نے معاہدہ وحلف سے کہا ہم ابکی دکھا دیں گے، چنانچہ سات آٹھ آدمی یکے بعد دیگرے اُحد میں مارے گئے اور پیچھے نہ ہٹے، اون میں سے ایک کا یہ رجز ہے۔ ص۵۶ پر علمبرداری جو بنو امیہ کی طرف منسوب کی ہے۔ سخت تاریخی غلطی ہے۔

۳۰۔ الذین یتبعون النبی الامی الذی ص۳۳۴ صحیح آیت الذین یتبعون الرسول النبی

۳۱۔ ماریہ قبطیہ کے متعلق یہ لکھنا کہ یہ اسلام لاچکی تھیں لونڈی نہ تھیں۔ نکاح کیا ہوگا نہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپ کے حرم میں آئیں ص۳۴۶ یہ سب خلاف واقعہ اور صحیح روایات اور محض دعویٰ بے دلیل ہے جو قابل سماع نہیں ہے۔ کیا ان کا اسلام بھیجنے سے پہلے تھا یا بعد؟ اور کسی کی لونڈی اگر مسلمان ہوجائے تو وہ بلا نکاح مالک کے لئے حلال نہیں ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کا استدلال ہے۔

۳۲۔ حاشیہ پر لکھا ہے نجاشی نے بھیجی اور جاریہ عظیمۃ القدر لکھا اس سے معلوم ہوا شریف گھرانے کی ہوں گی صحیح مقوقس نے بھیجی نہ نجاشی نے اور عظیمۃ القدر ہونے

سے خوبصورت خوش سلیقہ مقصود ہے نہ شریف خاندان - کہ دنیا میں کوئی بادشاہ اپنی بیٹیں غنیم کی خدمت میں نہیں بھیجا کرتا ہے ، اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی طمع تھی دو لونڈیں - ایک ماریہ - دوسری سیرین مقوقس نے بھیجیں ایک کو حضرتؐ نے اپنے پاس رکھا - دوسری حسان بن ثابت انصاری شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی یہ مشہور و متواتر خبر ہے - کسی اہل علم نے مولوی شبلی صاحب سے پہلے یہ بمعنی خیال نہیں ظاہر کیا

۳۳- فاغفر فداءً لک ما اتقینا - ہم تجھپر فدا ہوں جو احکام نہیں بجالائے اون کو معاف کردے صہ ۲۵۳ (اس شعر کے معنی میں غلطی ہے اور لفظ میں بھی - لفظی غلطی یہ ہے کہ تین لفظ مروی ہیں ا ما اُبقینا ۲ ما اُقتفینا ۳ ما اُقتنینا ہر تینوں کے معنی ہیں جو کچھ جمع کیا ہم نے - معنی یہ ہوے ہماری کمائی تجھپر فدا ہے ہمارے گناہ معاف کردے - ما اتقینا فاغفر کا مفعول بنایا گیا ہے جس سے معنی غلط ہو گئے -

۳۴- لاھمّ انی ناشد محمدًا صہ ۲۵۳ کچھ غم نہیں - (یہ ترجمہ غلط اعراب کی وجہ سے ہوا صحیح لاھُمّ بضم الہار بمعنی ای اللہ

۳۵- فان اللہ اعد للمحسنین منکن اجرا عظیما صہ ۲۶۳ (صحیح للمحسنات منکن) فقط لفظی غلطی نہیں ترجمہ میں نیکوکار بندوں کی لئے لکھا ہے

۳۶- ابوقالی - صہ ۲۱۷ (صحیح ابوعلی قالی -

۳۷- شعر یا عمرو الّا تدع شتمی الخ صہ ۲۱۷ ابو دواد ابادی کا بتایا ہے حالانکہ باجماع اہل ادب ذوالاصبع العدوانی کا ہے -

۳۸- صہ ۲۳۳ پر سریہ کعب لکھا ہے - اسی کو صہ ۲۳ پر بھی لکھا ہے - جواز قسم تکرار بے معنی ہے

۳۹- لایرقبون فی مؤمن الّا ولا ذمّۃ انھم لا ایمان لھم - یہ عجیب بے ربط عبارت بنائی ہے - سورہ توبہ شروع میں دیکھیئے - پہلی آیت کا ایک ٹکڑا حذف کیا بیچیں ایک آیت حذف

کی تیسری آیت کا شروع حذف کیا پھر یہ ٹکڑا لکھا۔ اغلاط مذکورہ ۱؎ قرآن ۲؎ حدیث ۳؎ تاریخ ۴؎ انساب ۵؎ لغت و ادب پر مشتمل ہیں۔

مندرجہ بالا یادداشت کو بالترتیب لکھنے کا خیال اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ وہ ایک مستقل مضمون ہوجاتا۔ اور یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ایسے مضمون کے مخالفانہ سمجھے جانے کے اندیشہ کو دور کیا جاسکتا۔ اِن اشارات کا مقصد محض اس قدر ہے کہ سیرۃ کی طبع جدید میں ان فروگذاشتوں کی مناسب اصلاح ہوجاے اور کتاب کی تیمت پر کوئی حرف نہ آئے۔

ابوعبداللہ محمد بن یوسف السورتی
ٹونک سنہ [illegible]ھ

سیلِ تاتار

تاریخ الامت کے حصہ پنجم سے یہ مقالہ نقل کیا جاتا ہے۔
کتاب عنقریب شایع ہونے والی ہے ۔
مدیر

اسلامی تاریخ میں سب سے بڑا واقعہ اور سب سے جانکاہ حادثہ تاتاریوں کا حملہ ہے۔ یہ جماعت ایک طوفان کی طرح مشرق سے نکلکر تمام ایشیائی اسلامی ممالک پر مشرقی یورپ تک چھاگئی اور قتل و غارت سے ایک عالم کو تباہ و برباد کردیا۔

اس حادثہ کا آغاز چنگیز خاں مغولی اور خوارزم شاہ علاء الدین محمد تکش کی باہمی نزاع سے ہوا۔

چنگیز خاں

ترکی مورخوں کا بیان ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایک بادشاہ النجہ خاں کے دو بیٹے توأم پیدا ہوئے تھے۔ ایک کا نام مغول رکھا گیا۔ دوسرے کا تاتار ان کی نسل کے قبیلے بعد میں اُنہیں کے نام سے مشہور ہوئے۔ ایک مدت تک ان میں اتحاد رہا۔ لیکن جب ایل خاں مغولوں کا سردار ہوا اور سونج خاں تاتاریوں کا تو ان میں باہم جنگ ہوگئی۔ تاتاریوں نے فتح پائی۔ اور مغولوں کو غلام بنالیا۔ کچھ زمانہ کے بعد مغول نے متفق ہوکر تاتاریوں کی شوکت توڑ دی اور آزاد ہوگئے۔ اس وقت سے ترکی اقوام کی سیادت ان کے ہاتھ میں آگئی اور یسوکی بھادر خاں تک سلسلہ بسلسلہ اُنہیں میں سے بادشاہ ہوتے چلے آئے۔ ۵۴۹ھ میں اس کا بیٹا چنگیز خاں پیدا ہوا۔ جس کا نام پہلے تموجین رکھا گیا۔ یسوکی بہادر نے جس وقت انتقال کیا اس کی عمر ۱۳ سال کی تھی۔ مغولی سرداروں نے اس کو کمزور پاکر جابجا اپنی خودمختار حکومتیں قائم کرلیں۔ تموجین ایک زمانہ تک ان کے ساتھ لڑتا رہا۔ آخرکار

سب کو اپنا مطیع بنا لیا۔ اس وقت سے اس کا لقب چنگیز خاں رکھا گیا۔ شہر قراقرم کو اس نے اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ اور اپنی قوم کے لئے ایک دستور العمل بھی مرتب کیا جس کا نام الیاق رکھا۔ اس کو وہ لوگ بمنزلہ ایک مذہبی کتاب کے سمجھتے تھے۔ اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔

اس کتاب کا ایک نسخہ بغداد کے مدرسہ مستنصریہ میں محفوظ تھا۔ علامہ مقریزی نے اس کو دیکھکر اپنی کتاب الخطط و الآثار میں اس کا خلاصہ لکھا ہے۔

یورش کا باعث

بعض مورخین نے تاتاریوں کے حملہ کی وجہ یہ لکھی ہے کہ خلیفہ بغداد ناصر لدین اللہ اور خوارزم شاہ میں چونکہ سخت ناچاقی ہوگئی تھی اور خلیفہ کو خطرہ تھا کہ کہیں وہ آکر بغداد پر قبضہ نہ کرلے۔ اس لئے اس نے چنگیز خاں کو لکھا کہ خوارزم شاہ پر فوج کشی کرے۔

بنی عباس کی تاریخ دیکھتے ہوئے یہ بیان بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ اس سے پہلے ترکوں کے استبداد کو توڑنے کے لئے انہیں لوگوں نے بنی بویہ کو طلب کیا تھا۔ پھر بساسیری کے غلبہ کے وقت طغرل بک سلجوقی کو بلایا تھا۔ اس کے بعد سلجوقیوں کو مٹانے کے لئے خوارزم شاہیوں سے درخواست کی تھی۔ ہاں۔ یہ فرق ضرور ہے کہ یہ سب لوگ مسلمان تھے اور مغول کافر۔ مگر پھر بھی اپنے ملک کو بچانے کے لئے اس قسم کی کارروائی خلیفہ عباسی سے بعید نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا مقصد صرف یہ رہا ہوگا کہ خوارزم شاہ اس کی مصروفیت کی وجہ سے ادھر کا رخ نہ کرسکے۔ یہ کب اس کے خیال میں آسکتا تھا کہ یہ طوفان خود اس کی سلطنت کو بھی بہا لیجائے گا۔

لیکن اصلی سبب چنگیز خاں کے حملہ کا یہ ہوا کہ سنہ ۶۱۲ھ میں اس نے اپنے ملک کے معزز مسلمانوں کا ایک وفد خوارزم شاہ کے دربار میں بھیجا کہ دونوں ممالک میں تجارت کا سلسلہ قائم ہو جائے۔ خوارزم شاہ نے منظور کرلیا۔ ایک عرصہ تک دونوں طرف سے کاروان تجارت آتے جاتے رہے۔ سنہ ۶۱۵ھ میں چار سو تاتاری تاجروں کا ایک قافلہ دریائے سیحون کے ساحل پر مقام

سردار یا میں اُترا - وہاں کے والی نے خوارزم شاہ کو لکھا کہ چنگیز خاں کے جاسوس تاجروں کے بھیس میں یہاں آئے ہیں - خوارزم شاہ نے حکم دیا کہ ان کو قتل کردو - والی نے اس حکم کی تعمیل کی - اور وہ سارا سامانِ تجارت خوارزم شاہ کے پاس بھیجدیا - اس نے سمرقند اور بخارا کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا -

چنگیز خاں نے لکھا کہ یہ معاہدہ کے خلاف ورزی ہے - لہذا وہ سارا سامان واپس کرو - اور غایر خاں والی سردار یا کو ہمارے حوالہ کر دو کہ قصاص لیں - خوارزم شاہ نے غصہ اور جہالت کی وجہ سے اس کے سفیر کو بھی قتل کرا دیا - اس پر چنگیز خاں نے غضبناک ہو کر چڑھائی کی تیاری شروع کی -

خوارزم شاہ نے یہ سمجھکر کہ جنگ اب یقینی ہے پہلے ہی حدود ترکستان پر حملہ کر دیا چنگیز اوس وقت چین میں تھا - اس کی جو تھوڑی سی فوج سرحد پر متعین تھی اس نے نہایت بہادری سے مدافعت کی - جس کی وجہ سے خوارزم شاہ کو یقین ہو گیا کہ وہ تاتاریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا - اس لئے واپس ہوا - راستہ میں جس قدر شہر اور قصبے تھے اُن کے باشندوں کو تاتاریوں کے حملہ کے خوف سے جلا وطنی کا حکم دیا - جس سے وہ حصۂ ملک جو دنیا کی جنت تھا ویران ہو گیا -

چنگیز خاں اپنا لشکر تیار کر کے دریائے سیحون سے اُترا - کہیں کوئی مدافعت پیش نہیں آئی - بخارا میں بیس ہزار فوج تھی وہ بھی مقابلہ نہ کر سکی - اہل شہر نے علامہ بدر الدین قاضی شہر کو بھیجا کہ امان طلب کریں - چنگیز نے منظور کی - اور ۴ ذیحجہ ۶۱۶ھ کو بخارا میں داخل ہوا - شہر میں اعلان کرا دیا کہ ہمارے تاجروں کا سامان جس کے پاس ہو وہ حاضر کر دے - چنانچہ سب لوگوں نے لا کر جمع کر دیا - پھر حکم دیا کہ تمام باشندے نکل جائیں - اس کے بعد جو لوگ رہ گئے قتل کئے گئے - مال لوٹ لیا گیا - اور بخارا جیسا عظیم الشان اور آباد شہر صرف کھنڈروں کا مجموعہ رہ گیا -

محرم ۶۱۷ھ میں سمرقند کی طرف بڑھا۔ یہاں پچاس ہزار فوج تھی۔ مگر مرعوب پہلے ہی حملہ میں شکست کھا گئی۔ تاتاریوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اور ہر طرف سے باشندوں کو قتل و غارت کرنے لگے۔ پھر اعلان کیا کہ لوگ تین دن کے اندر یہاں سے نکل جائیں۔ مسلمان بیچارگی اور سراسیمگی کے ساتھ بھاگے اور یہ شہر بھی جو ارباب علم و فن کا مخزن اور اہل ثروت و تجارت کا مرکز تھا۔ بکل اجاڑ ہو گیا۔

چنگیز خاں نے اپنی بیس ہزار منتخب فوج کو حکم دیا کہ خوارزم شاہ کو جہاں سے ملے پکڑ لاؤ۔ گو وہ آسمان پر کیوں نہ چڑھ گیا ہو۔ یہ فوج دریائے جیحوں سے اُتر کر روانہ ہوئی۔ خوارزم شاہ غربیہ میں تھا۔ تاتاریوں کے خوف سے بھاگ کر نیشاپور پہونچا وہاں قیام نہیں کرنے پایا تھا۔ کہ وہ مازندران میں آ گئے۔ اس لئے فوراً نیشاپور چھوڑ کر آگے بڑھا۔ تاتاری اس کے تعاقب میں چلے جاتے تھے۔

اس حالت میں بھی جبکہ خطرناک دشمن اس کے پیچھے تھا شراب میں رات دن مست رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے ایک بار بھی مقابلہ کی جرأت نہ کر سکا۔ حالانکہ اس کے پاس لاکھوں کی تعداد میں فوج تھی۔

بحیرہ طبرستان کے اندر اس کا ایک قلعہ تھا۔ بندرگاہ پر پہونچکر جہاز میں سوار ہو۔ جب روانہ ہو گیا اس وقت تاتاری ساحل پر پہونچے۔ اب اس کی گرفتاری کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس وجہ سے مجبوراً پیچھا چھوڑ کر مازندران میں چلے آئے۔ وہاں سے بڑھکر رے کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔

انھوں نے بہت سے مسلمانوں اور دوسری قوم کے لوگوں کو بھی جو فتنہ اور فساد میں حصہ لیتے تھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ راستہ میں جو بستی پڑتی تھی لوٹ لیتے تھے ہمدان میں جس وقت پہونچے وہاں کے لوگوں نے امان مانگ لی۔ پھر قزوین کو فتح کر کے

تقریباً چالیس ہزار باشندوں کو تہِ تیغ کر ڈالا۔ وہاں سے آذربیجان کی طرف بڑھے تبریز کا محاصرہ کیا۔ اس کا امیر ازبک پہلوان تھا جو ہر وقت شراب کے نشہ میں رہتا تھا۔ مدافعت کے لئے تیار نہ ہو سکا۔ اس لئے وزرا نے کچھ رقم دیکر صلح کر لی۔

اب وہ ساحل کی طرف بڑھے۔ اور موقان پر قبضہ کیا۔ بلاد کرج کے امرا نے ازبک اور ملک اشرف بن عادل ایوبی فرمانروائے خلاط وجزیرہ وغیرہ کو لکھا کہ ہم سب لوگ متفق ہو کر مقابلہ کریں۔ لیکن کوئی راضی نہیں ہوا۔ ازبک کا ایک غلام آقوش ترکمانوں اور کردوں کی ایک جماعت لیکر تاتاریوں سے جا کر ملگیا۔ انہوں نے گرجستان پر حملہ کر کے ذی قعد ۶۱۸ھ میں اس کے مرکز تفلیس کو فتح کر لیا۔ پھر پلٹ کر مراغہ میں آئے۔ اس کو تاراج کر ڈالا۔ وہاں سے دربند شرواں ہوتے ہوئے شماخی پہونچے اور اوس کو لوٹا۔ پھر دشت قبچاق میں جا کر قتل وغارت کر کے اس کے قصبوں کو ویران کر ڈالا۔ بہت سے باشندے بھاگ کر اسلامی ممالک میں آئے۔ لوگوں نے ان کی ایک بڑی تعداد کو لیجا کر مصر میں فروخت کیا۔ جن کو ملک صالح نجم الدین نے خرید کر بحری خدمت میں لگایا یہی ممالیک بحریہ آخر میں دولت ایوبی کے وارث ہو گئے۔ انہیں سے معز ایبک اور منصور قلاؤوں نامی ملوک گذرے ہیں۔

تاتاری قبچاق سے روس میں داخل ہوئے۔ بقیہ قبچاقیوں اور روسیوں نے متحد ہو کر مقابلہ کیا۔ مگر ہزیمت اٹھا کر بھاگے۔ وہاں بھی قتل ونہب میں کوئی کمی نہیں کی۔ ۶۲۰ھ میں بلغار میں پہونچے۔ مگر اہل بلغار نے کمینگاہیں بنا کر ان میں اپنے سپاہی چھپا دیے تھے جو بے خبری میں تاتاریوں پر آپڑے۔ اور ان کے بیشتر حصہ کو قتل کر ڈالا۔

یہ صرف اس مختصر جماعت کی کیفیت ہے جو خوارزم شاہ کے تعاقب میں بھیجی گئی تھی۔ ان کی حالت القی خرگاہ والے سلجوقیوں سے مشابہ ہے جنہوں نے سلاجقۂ عظمیٰ

سے پہلے نکلکر بلاد اسلامیہ میں قتل و غارت سے شورش برپا کردی تھی۔

چنگیز خاں نے سمرقند سے اپنے ایک بیٹے کی قیادت میں دوسری فوج خراسان پر بھیجی۔ وہ دریائے جیحون کو عبور کرکے ۶۱۷ھ میں بلخ میں پہونچی۔ باشندوں نے امان طلب کرلی۔ تاتاری داخل ہوئے۔ کسی سے کچھ تعرض نہیں کیا۔ اور اپنا ایک شحنہ مقرر کرکے آگے بڑھے۔ رفتہ رفتہ خراسان کے اکثر شہروں پر قابض ہوگئے۔ یہ لوگ رعایا میں سے نہ کسی کو قتل کرتے تھے نہ لوٹتے تھے نہ اذیت دیتے تھے۔ صرف تھوڑے سے سپاہی ہر شہر سے اپنی مدد کے لئے ساتھ لے لیتے تھے۔

چنگیز خاں نے ایک اور فوج دشت قبچاق کی طرف روانہ کی۔ وہاں کی قوت پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ اس لئے آسانی کے ساتھ قبضہ ہوگیا۔ اب انقصائے چین سے بحر خزر اور حدود روس تک۔ اور بحر شمال سے سرحد ہند تک کا عریض وطویل رقبہ اس کے قبضہ میں آگیا۔ اس نے اس کو اپنے چاروں بیٹوں میں تقسیم کردیا۔

بڑے بیٹے **جوجی خاں** کو۔ دشت قبچاق۔ داغستان۔ خوارزم۔ بلغار۔ روس اور اس کے ملحقات ساحل بحر غربی تک۔

دوسرے بیٹے **چغتائی** کو۔ ایغور۔ ماوراءالنہر۔ مشرقی ترکستان

تیسرے بیٹے **تولی خاں** کو۔ خراسان۔ دیار بکر وغیرہ مغربی علاقہ جہاں تک کہ قبضہ میں آچکا تھا۔

چوتھے بیٹے **اوکدائی** کو۔ بلاد اصلی خطا و چین معمورہ شرقی تک

چوتھا سب سے چھوٹا تھا۔ اسی کو **قاآن اعظم** مقرر کیا۔ اور وصیت کی کہ دوسرے بھائی اس کے تابع اور مددگار رہیں۔ اور کوئی اس کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرنے۔

یہ تمام حوادث اسلامی ممالک میں ہو رہے تھے۔ اور خون کا سیلاب مسلمانوں کے سروں سے گذر رہا تھا۔ لیکن خلیفۂ بغداد ناصر بے خبر تھا اور اوس کے درباری اپنے

بیکار مشاغل میں مصروف تھے۔ اس پر بھی ابن طباطبا نے الفخری میں اس کی بڑی مدح سرائی کی ہے۔ آخر میں لکھا ہے کہ وہ امامیہ کا ہم خیال تھا۔ غالباً اس کی ان تعریفوں کی اصلی وجہ یہی ہے۔

۶۲۴ھ میں چنگیز خاں نے وفات پائی۔ اس کا بیٹا تولی خاں حسب وصیت خراسان کا بادشاہ ہوا۔ اس نے آخری خوارزم شاہ جلال الدین منکبرتی کے استیصال کے لئے جو آذربیجان میں تھا فوج بھیجی۔ اہل آذربیجان پر نہایت خوف مستولی ہوا۔ کیونکہ کوئی مسلمان بادشاہ تاتاریوں کا مقابلہ نہیں کرتا تھا۔ اور سب کے سب اپنے عیش و آرام میں مشغول تھے۔ آخر کار تاتاریوں نے ۶۲۸ھ میں منکبرتی کو قتل کیا اور خراسان سے لے کر عراق تک اپنے قبضہ میں لائے جس سے بغداد خطرہ میں پڑ گیا۔

تولی خاں اپنی سلطنت کی توسیع میں مصروف رہا۔ اور ایران کے ان حصوں پر جو باقی رہ گئے تھے قبضہ کیا۔ لیکن بغداد کی طرف رخ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اس کو یہ خیال تھا کہ خلافت کے مرکز پر اگر میں چڑھائی کروں گا تو تمام عالم اسلامی مجھ سے لڑنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

جب ۶۵۴ھ میں وہ انتقال کر گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ہلاکو خاں تخت نشین ہوا تو بغداد کے بعض منافق امرا اس کے ساتھ مل گئے۔ انہوں نے جرأت دلائی جس کی وجہ سے اس نے اس طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ صورت یہ تھی کہ بغداد کے زیادہ تر باشندے اگرچہ سنی تھے لیکن ایک جماعت شیعہ کی بھی وہاں تھی جن کی تعداد بنی بویہ کے زمانہ سے بڑھ گئی تھی۔ ان دونوں فرقوں میں ایک دائمی نزاع قائم تھی شیعہ جو علویین کی امامت کے قائل تھے بنی عباس کی خلافت کے دشمن تھے۔ اس وجہ سے وہ بھی ان سے بیزار تھے۔

خلیفہ مستعصم کے زمانہ میں ایک بار فریقین میں سخت جنگ ہوئی۔ خلیفہ کے بیٹے

ابوبکر کے اشارہ سے اہل سنت نے محلہ کرخ کو جو شیعہ کا تھا لوٹ لیا۔ اور اس کے باشندوں کو مارا۔ اس عناد اور تعصب کی وجہ سے خلیفہ کے وزیر ابن علقمی نے جو نہایت غالی شیعہ تھا ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی۔

ابن طباطبا علوی نے اپنی تاریخ میں ابن علقمی کو اس منافقت اور غداری کے الزام سے بری کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور دلیل یہ لکھی ہے کہ ہلاکو خاں نے فتح بغداد کے بعد سارا انتظام وزیر مذکور کے سپرد کر دیا تھا۔ اگر وہ اس جرم کا مرتکب ہوتا تو کبھی سلامت نہ رہ سکتا۔

میں اس دلیل اور اس کے اس نتیجہ کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ ایک بات یہ بھی پیش نظر رہے کہ ہلاکو خاں کا وزیر نصیر الدین محمد طوسی بھی غالی شیعہ تھا۔ اور اس کے دربار میں ابن علقمی کی تعریفیں کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے ہلاکو نے فتح کے بعد بغداد کا انتظام اس کے اور علی بہادر شحنہ کے سپرد کر دیا تھا۔

۱۵۔ محرم ۶۵۶ھ میں ہلاکو اپنا جرار لشکر لیکر بغداد کی طرف آیا۔ اور اس کا محاصرہ کیا۔ خلیفہ کے پاس مدافعت کی طاقت کہاں تھی۔ دس روز کے اندر وہ شہر میں داخل ہوگیا اس کی فوج نے قتل و غارت گری شروع کی۔ اکثر باشندے مارے گئے۔ اور بجز تھوڑے سے نصارا اور شیعہ کے وہاں کوئی باقی نہیں رہا۔ اور وہ بغداد جو اسلامی عظمت کا گہوارہ خلافت و امارت کا مرکز اور مشرقی ممالک کا تاج تھا ویران ہو کر اُن متفرق جماعتوں کا مسکن ہو گیا جو ہلاکو کی فوج کے ساتھ آئی تھیں۔ اور جن کا کوئی دین نہ تھا۔

خلیفہ مستعصم پیشکش کے لئے ایک طبق جواہر لیکر حاضر ہوا۔ ہلاکو نے اس کو اپنی فوج میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بیٹے ابوبکر کو ایک جماعت کے ساتھ باب کلواذی پر پھانسی دی۔ اور خود اس کو اور اس کے دوسرے بیٹوں اور خواجہ سراؤں کو ساتھ لیکر ۱۴ صفر ۶۵۶ھ کو بغداد سے چلا۔ پہلے ہی مرحلہ میں سب کو قتل کرا دیا۔ مستعصم کے قتل سے

خلافت عباسیہ کا آفتاب جو ۵۲۴ سال سے تاباں تھا غروب ہوگیا۔

خراسان سے سیاہ علم لیکر لوگ اٹھے تھے جنہوں نے عباسیوں کو عرش خلافت پر بٹھلایا تھا۔ اسی طرف سے تاتاریوں کا سیلاب آیا جو اُن کو اور اُن کے تخت کو خونیں موجوں میں بہا لے گیا۔

سقوطِ بغداد کے وقت اسلامی ممالک کی حالت حسب ذیل تھی۔

۱۔ غرناطہ اندلس میں بنی نصر کی خلافت قائم ہوچکی تھی اور اس خاندان کا بانی محمد غالب باللہ بن یوسف بن نصر خلیفہ تھا۔

۲۔ شمالی افریقہ میں موحدین کی حکومت تھی۔ تخت پر ابوحفص عمر مرتضیٰ بن اسحاق بن ابی یعقوب یوسف بن عبد المومن تھا۔

۳۔ الجزائر میں دولت زیانیہ یغمراسن بن زیان نے قائم کرلی تھی۔

۴۔ تونس میں بنی حفص میں سے ابو عبداللہ محمد مستنصر باللہ امیر تھا۔

۵۔ مراقش میں دولت مرینیہ تھی۔ اور حکمراں ابو یوسف یعقوب بن عبدالحق تھا۔

۶۔ مصر میں ممالیک بحری ایوبی حکومت پر قابض ہوگئے تھے۔ اور نورالدین علی تخت پر تھا۔

۷۔ یمن میں دولت رسولیہ تھی۔ اور مظفر بن یوسف برسر حکومت تھا۔

۸۔ صنعاء میں ائمہ زیدیہ میں سے متوکل شمس الدین احمد امام کا عہد تھا۔

۹۔ روم میں سلاجقہ میں سے رکن الدین قزل ارسلان چہارم کا زمانہ تھا۔

۱۰۔ ماردین میں دولتِ ارتقیہ کے تخت پر نجم الدین غازی سعید تھا۔

۱۱۔ فارس کی اتابکیہ سلغریہ میں سے ابوبکر بن سعد بن زنگی فرمانروا تھا۔

۱۲۔ لورستان کی اتابکیہ ہزار اسپیہ کا بادشاہ وگلہ بن ہزار اسپ تھا۔

۱۳۔ کرمان میں قتلغ خاتون کی حکومت تھی۔

۱۴۔ ھند میں نصرالدین محمود شاہ اول دہلی کے تخت پر تھا۔

محمد اسلم جیراجپوری

ہندوستان کا افلاس

ہندوستان کی معاشی زندگی کی نمایاں خصوصیات غربت اور بربادی اگر شہروں میں تعیشات میں جلوہ گر ہیں، تو دیہاتوں میں پردۂ افلاس میں پنہاں ہیں۔ ہرطرف انتہائی افلاس کے ساتھ ساتھ تباہ کن تضیع بھی پائی جاتی ہے۔ زندگی کی تباہی۔ قوت کا ضائع کرنا۔ تضیع اوقات اور خام پیداوار کی تباہی ہر طبقہ میں پائی جاتی ہے۔ اس وسیع براعظم کی غربت ایک امر مسلم ہے۔ اس کا سبب تباہی کے مختلف طریقوں پر موقوف ہے جو کہ یہاں کے لوگوں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں اور ان اسباب پر بہت ہی کم لوگ غور کرتے ہیں۔

جبکہ اُن ملکوں کے باشندے جن کے ساتھ فطرت اس قدر پر فیاض ثابت نہیں ہوئی جیسا کہ بلاشبہ ہندوستان کے اکثر حصے پر ہے سرگرمی سے پیداوار کے بڑھانے اور اُس سے استفادہ حاصل کرنے میں کوشاں ہیں تو اس وسیع براعظم کے باشندے اُن سے مطلق بے اعتنائی برتنے میں باہمدگر مقابلہ کرتے ہیں۔

ہندوستان میں کس قدر زندگی ضائع ہوتی ہے؟ جب زمانہ قدیم میں ہندوستان میں انسانی زندگی زیادہ سے زیادہ ۱۲۰ برس قرار دی جاتی تھی اور متوسط درجے کی عمر کی ایک سو سال سے کم کی توقع ہی نہیں کیجا سکتی تھی بعض دیگر ممالک میں مدت عمر ستر سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب حالات بالکل برعکس ہوگئے ہیں ہندوستان میں مدت عمر کی پیدائش سے ذکور کے لئے ۵۹ر۲۲ اور اناث کے لئے ۳۱ر۲۳ برس کی توقع کی جاتی ہے۔ بمقابلہ انگلستان کی مدت عمر کے جہاں ۴ر۴۶ اور ۵۲ر۵۵ بالترتیب ہے شہروں کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ بعض شہروں میں تو کم ہوتے ہوتے ۱۶ برس تک رہ گئی ہے۔ فی الحقیقت یہ خطرہ ہر کہ ہندوستانیوں

کی اوسط عمر ترقیٔ معکوس کرتے کرتے بہت ہی قلیل ہو رہی ہے۔

اس حقیقت کی اہمیت کا خیال کس قدر ہولناک ہے۔ مادی تعیشات کی کثرت اور عمدہ دماغی تفریحات اس قوم کو کہاں تک مفید ہو سکتی ہیں جس کے افراد اس قدر قلیل العمر ہوں جیسا کہ گذشتہ اعداد سے ظاہر ہے۔ مدراس کے ماہر ریاضی رامانوجن کا سا اچنبھا ملک کے لئے باعث فخر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی کم عمری کا حادثہ کس قدر دل شکن ہے۔ ایڈیسن اگر طویل اور پختہ مدت العمر نہ پاتا تو کیا اس کے اثمار ذہانت تعداد میں اس قدر زیادہ ہو سکتے تھے جتنے کہ آج دیکھے جاتے ہیں؟ کیا زمانہ انسانی معاملات میں ایک بہت بڑا عنصر نہیں ہے۔؟

ہندوستان میں سب سے بڑی وجہ انسانی زندگی کی تباہی کی یہاں کے باشندوں کی انتہائی ناداری ہے۔ فرد واحد کی سالانہ آمدنی کا تخمینہ ۲۰ سے بیالیس 42 روپے تک ہے۔ یہ اعداد جیسا کہ ناچیز معلوم ہوتے ہیں۔ ضروریات زندگی کی قیمتوں کا بڑھنا اور بھی انہیں خوفناک طریقہ سے کم کر دیتا ہے۔ اس کا تخیل کہ آبادی کا ایک کثیر حصہ فاقہ مستی کا شکار ہوتا ہوگا کچھ مشکل نہیں۔ ہندوستان کے اکثر حصوں کے لوگ جس قدر زندگی سے عاری ہیں وہ راقم کے علم میں ہے۔ مان لیا کہ مزدوروں کی اجرت بڑھ گئی ہے (اگرچہ یہ اب بھی مشکوک ہے کہ اجرت کا اضافہ قیمتوں کے اضافے کے تناسب سے ہوا ہے) تاہم ان اشخاص کی کمائی جن کی آمدنی مقرر ہے متوسط طبقہ کے لوگوں کی آمدنی تقریباً مقامی رہی ہے۔ ان حالات نے زندگی کے نقطۂ نظر کو یہاں تک تاریک بنا دیا ہے کہ جس کا تخیل ہر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کھانا زندگی کی سب سے پہلی احتیاج ہے۔ لیکن اس کا اکثر حصہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔ زراعت اور اناج فراہم کرنے کے نکمے طریقے قلیل پیداوار اور خطرناک نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ دوسرے ملکوں سے اعداد و شمار کا مقابلہ یہ ظاہر کر دے گا کہ ہندوستان کی زمین کی پیداوار

قابلیت کس قدر کم ہے۔ کھاد یا تو ایندھن کے طور پر استعمال کی جاتی ہے یا باہر بھیج دی جاتی ہے۔ کھیتوں میں شاید ہی کھاد ڈالی جاتی ہو اور ذرائع آبپاشی کے ذریعہ انہیں سیراب نہیں کیا جاتا۔ محض چوہوں ہی سے نقصان غلّے کو پہنچتا ہے وہ بہت بڑا نقصان ہے یہ اناج جو ہر سال اس طرح ضائع ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

وسیع علمی تربیت کا فقدان اور باشندوں کی انتہائی غربت موزوں ذرائع کے استعمال سے اور چوہوں کے سدباب کے لئے گوداموں کی تعمیر کے ذریعہ پیداوار بڑھانے سے روکتی ہے۔ ان ذرائع کے فقدان اور حکومت کی لگان وصول کرنے میں سختی کاشتکاروں اور چھوٹے چھوٹے تاجروں کو غیر ممالک کے تاجروں کے ہاتھ مضرت رساں شرائط پر گیہوں منتقل کرنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے آپس میں اور رعایا اور حکومت کے مابین اتحاد عمل کا فقدان کاشتکاروں کو ذاتی ساعی پر بھروسہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو کئی شعبوں میں بربادی کا باعث ہوتا ہے۔

کثیر المصارف حکومت فاقہ کش ملک میں تباہ کن تجارت درآمد و برآمد کی ضرورت پیدا کر دیتی ہے۔ یہ تجارت لوگوں کی معاشی زندگی کا اظہار کرتی ہے۔ ہندوستان میں درآمد میں سب سے بڑی مد کپڑے اور برآمد میں اناج کی تجارت ہے۔ جو قدر و قیمت میں آپس میں تقریباً برابر ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں روئی کی پیداوار کا رقبہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے لیکن اس کی درآمد تجارت کپڑے کے مقابلہ میں تھوڑی ہے اور جہاں دیکھو لکھوکھا نفوس یہاں فاقہ کشی کا شکار رہ جاتے ہیں وہاں اناج کی تجارت برآمد سب سے زیادہ ہے۔ کیا یہ لوگوں کے غور و فکر کرنے کے لئے کافی نہیں۔؟

قوانین ملک کے ماتحت زمین کی تقسیم در تقسیم سرمائے یکجا جمع نہ ہو سکنے کے باعث پیداوار بر پیمانہ کثیر کو روکتی ہے اور اس ملک میں جہاں مشترک سرمایہ دار اور محدود سرمایہ دار کمپنی کے طریقہ شاذ ہیں یہ اور بھی ترقی کی مانع ہے۔ تقسیم ذات کا بھی یہی

انجام ہے ۔ اس میں نقص یہ ہے کہ اس میں اضافۂ مہارت کے لئے بہت کم گنجائش ہے۔ باپ جتنا خود جانتا ہے اُس سے زیادہ بیٹے کو نہیں سکھا سکتا اور بیٹا صرف باپ ہی سے سیکھتا ہے ۔ زندگی غیر تبدل پذیر اور رسم ورواج کی پابند ہو جاتی ہے۔

فاقہ کشی کے باعث خرابی صحت ناپاک فضا پید کردیتی ہے ۔ دیہاتی ہندوستان میں صفائی کا نام تک نہیں سنا جاتا اور شہروں میں اس کے قواعد کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ وبائی امراض یہاں تک شدت سے پھیلتے ہیں کہ کوئی متنفس اُن کا شکار ہونے کے لئے زندہ نہیں بچتا ۔ بیشتر کہیں اون کا دفیعہ ہوتا ہے۔ اوسط حالات بہت ہی ردی ہیں ۔ ہندوستان بھر کے اکثر حصوں میں روشنی اور تازہ ہواؤں کا گذر نہ ہوتا تو یہ بھی آج سائبیریا کی طرح ایک ویران ملک ہوتا۔

اس پر بھی جیسا کہ مورلینڈ نے جو محکمہ لگان کے افسر ہونے کی حیثیت سے شمالی اور وسطی ہند کے حالات سے گہری واقفیت رکھتے تھے اپنے مشاہدے کے مطابق اشارہ کیا ”کہ اگرچہ ہندوستان کے خاص خاص حصے بہت گنجان آباد ہیں لیکن ہندوستان بحیثیت مجموعی (آباد) نہیں ۔ ہندوستان کے اکثر حصے ایسے ہیں جہاں کی زمین وادی گنگا کی سی زرخیز ہے لیکن دیگر شرائط کے اعدام کے باعث آبادی وہاں کم ہے“

لوگوں کی معاشی حالت جس قدر خراب ہے وہ تو ہے لیکن اون کے اجتماعی رسوم و عادات نے اُسے اور بھی بدتر بنا دیا ہے، مقدمہ بازی، بچپن کی شادی کی رسم اور دیگر اجتماعی رسوم جن میں ناعاقبت اندیشی سے اسراف ہوتا ہے نیز اُن مراسم قدیمہ کے قائم رکھنے میں جن میں نہ دنیوی فلاح ہے نہ دینی ۔ اور بھی لوگوں کے مصائب میں اضافہ کرتے ہیں۔ ریاستوں کے حکام اور مذہبی پیشوا بجز چند مستثنیات ملک کے معاشی حالات سے بے خبر ہیں ۔ مذہب کے نام پر امیر و غریب گداگروں

ی ایک غالب تعداد کی پرورش کی جاتی ہے۔ قوی الجثہ آدمی جنہیں فطرت نے صحت اور عقل دی ہے اپنا وقت تعیشات میں گذار دیتے ہیں یا صبح شام سال کے آغاز سے اختتام تک بھجن گاتے اور تسبیح پڑھتے ہیں۔

ہندوستان کی تقریباً نصف آبادی یعنی طبقہ نسواں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اون کی حیثیت سوسائٹی میں بہت ہی پست ہونے کی وجہ سے وہ بالکل عضو معطل ہیں جس سے جماعت ایک حقیقی مؤثر قوت سے محروم رہتی ہے۔ اس کی پوری پوری قدر و قیمت کا اندازہ مغربی ممالک کی ان عورتوں کے حالات معلوم کرنے سے ہوسکتا ہے۔ جو مردوں کا ہاتھ بٹا کر سوسائٹی کا بوجھ ہلکا کر رہی ہیں۔ ہر ہائی نس مہارانی بڑودہ نے صنف نازک کے کارنامے جن کا انہوں نے انگلستان میں مشاہدہ کیا ہے۔ لکھے ہیں۔ وہاں کے حالات کا ہندوستان کے حالات سے مقابلہ کرنے اور ان پر زور دینے کے لئے خصوصیت سے ان کا نام ”ہندوستان میں عورتوں کی حیثیت“ رکھا ہے۔ محض کتاب کا مطالعہ پڑھنے والے کی آنکھیں کھولنے اور اسے ملکی قوت کی تباہی کا قائل کرنے کو کافی ہے۔

یہاں کی ⅔ آبادی کا پیشہ زراعت ہے لیکن وہ بھی تباہ کن طریقے پر کیا جاتا ہے۔ چند عمدہ قطعے جن کی کاشت آبپاشی سے کی جاتی ہے اور جس پر ایک وقت معینہ میں اور وقفہ کرکے محنت ہوتی ہے یہاں کا موسمی پیشہ ہے۔

زراعت میں جو مزدور کام کرتے ہیں جب انہیں کوئی کام نہیں ہوتا تو کسی کام کی امید ہی میں وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ علم المعشیت کے ایک اہل قلم نے کہا ہے ” بہت ہی کم کام سے سست پڑ سکتے ہیں بہت زیادہ سے کمزور پڑ سکتے ہیں اور ہر طرز تفریح اختیار کرنے سے ذلیل ہوجاتے ہیں“۔ ایک سیر و سیاحت کرنے والا شخص ان تمام حالات کو ملک میں رائج دیکھ سکتا ہے۔

ان حالات کی موجودگی نے وسیع پیمانے پر لوگوں کو نشہ آور اشیا اور شراب

کے استعمال کی طرف مائل کر دیا ہے۔ اس سے صحت اور دولت کا جو نقصان ہوتا ہے وہ اندازے سے باہر ہے۔ بہت ہونہار آدمی عین عنفوان شباب میں بیکار اور سوسائٹی کے لئے خطرے کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان برائیوں کو اختیار کرکے انسان حیوانوں کی ذلیل حالت تک پہنچ جاتے ہیں اس کا افسوسناک انجام یہ ہے کہ ان کے نتائج انہی تک بس نہیں ہو جاتے بلکہ اگر ان کے بچے بچپن کے بعد زندہ رہیں تو وہ اپنی آبائی کمزوریوں سے بیماریوں اور وبائی امراض کا شکار رہتے ہیں۔

گردوپیش کے مایوس کن حالات کا بوجھ ملکانہ کر سکنے کے باعث باشندوں کی زندگی کا منظر بہت کچھ غمگین کن ہوگیا ہے۔ بچوں تک سے بھی شوخی اور زندہ دلی جاتی رہی اور اگر اس کا اظہار ہوتا بھی ہے تو اس میں ہمت افزائی نہیں کی جاتی۔ لوگوں کے بعض طبقے روپیہ بچانے یا اخراجات بڑھانے کے امکان سے کاہلی کی قدر زیادہ کرتے ہیں اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ روزی سے زیادہ کما رہے ہیں تو کام کی مقدار کم کردیں گے یا دوسرے لفظوں میں پیداوار بڑھانے کے بجائے کم کرتے ہیں۔ صحت سے غفلت برتی جاتی ہے۔ قدرتی مؤید صحت طریقوں سے بالکل فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ زندگی کو سیر و سیاحت سے مصفا نہیں بنایا جاتا۔ مگر گروہ در گروہ متبرک مقامات کو دیکھنے جاتے ہیں اور اپنے گندے طرز رہائش سے وبائی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ اجنبی ملک میں نظام کے ماتحت کمپنیوں کا ریلیں جاری کرنا اور ان میں بیرون ہندوستان کا منافع صرف کرنا ساتھ ہی ساتھ عدم مداخلت کی حکمت عملی ہندوستان کی قدیم دستکاریاں تباہ کرنے کا باعث ہوئے ہیں نیز ان وجوہات نے پیشے کے تمام راستے تنگ کر دئے ہیں موجودہ چند صنعتوں کے اجرا نے اس خرابی کے مقابلہ میں توازن قائم نہیں کیا۔ (زمین پر لگان) کے بوجھ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ہندوستانی والدین کی موجودہ حالت کو بہت زیادہ دیکھنے کے رجحان نے اور بھی حالات خراب کر دئے ہیں جیسا کہ مورلینڈ صاحب

کھتے ہیں۔ "وہ امکانی تبدیلیوں کے لئے کافی گنجایش نہیں رکھتے اس لئے ہم یہ دیکھتے
یں کہ قدیم مروجہ پیشوں یا حرفوں میں تقابل و تعارف بہت زبردست ہے اور اس طرح شرح
مدنی کم ہوجاتی ہے۔ حالانکہ بعض اوقات جدید مروجہ پیشوں اور حرفوں میں کام کرنے کے
یق آدمی تلاش کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے"۔

اپنی غفلت آمیز عادات کے باعث وقت کی کوئی قدر نہیں کیجاتی۔ ریل جہاں پہنچ
ئی ہے۔ وہاں کس قدر اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن زندگی کے تمام شعبوں میں بہت ہی خطرناک
لور پر وقت ضائع ہوتا ہے۔ جو لوگ چند پیشوں میں مصروف ہیں جن کے لئے یہ مقولہ کہ وقت
دلت ہے۔ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لوگ روزمرہ فرایض ادا کرنے کے بعد فضول گپ شپ
ں وقت ضائع کردیتے ہیں، یہی مسئلہ اُن کے درپیش ہوتا ہے۔ کہ وقت کو کیسے تباہ کیا جائے
ہاں محنت بچانے والے آلات اُسی کام کو بہت جلد اور کم اخراجات پر کرسکیں وہاں کمزور
ور ناقابل مزدور لگائے جاتے ہیں۔ بلکہ انسانی محنت کی بھی چنداں پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس
ا بالکل احساس نہیں ہوتا کہ اصول حفظ صحت میں ترقی ضروری ہے نہ صرف اس لئے
یہ زیادہ تعداد میں انسانوں کو زندہ رکھے گی بلکہ یہ بہت زیادہ مزدوروں کی صحت قائم
کھے گی اور اُنھیں کام کے قابل بنائے گی۔

انسانی زندگی سے یہ ظاہرا بے اعتنائی جہالت کی بنا پر نہیں ہے۔ یہ اُس عام سرد مہری
ا نتیجہ ہے۔ جو ملک کی دردناک معاشی حالت کے باعث پیدا ہوگئی ہے۔ تمام ممالک
یں سرمایہ دار خود غرض اور حریص ہوتے ہیں "موجودہ جرمنی" کا مصنف لکھتا ہے "زراعتی
زدوروں سے بدسلوکی اور روپے جنس کی صورت میں اُجرت کی ادائیگی کے متعلق لیت و لعل
در بالخصوص قوانین انتخاب کے بھیانک استعمال اب تک شکایات کا عنوان ہیں"۔ مورلینڈ
ماحب بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ "ہندوستان کی معاشی تاریخ اس یقینی اور عام
مقولہ کی صحت ثابت کرنے کے لئے کہ مزدور پہلے غلام تھے اور اُجرتیں اسی طرح شروع

ہوئیں کافی طور پر معلوم نہیں ہوئی۔

انفرادی اور شہری پیداوار کی تباہی کے ساتھ ساتھ قومی پیداوار کو بھی بالکل ضائع کردیا جاتا ہے۔ ممالک غیر میں اجناس خام صنعت کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ سر طامس ہالینڈ نے جو کبھی حکومت ہند میں تجارت اور صنعت کے ممبر تھے چند مہینے گذرے حاضرین لندن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا کہ اگرچہ ہندوستان کی دو سب سے بڑی ضروریات ارزاں قوت اور گندھک کا تیزاب ہیں۔ جو بہت علمی صنائع کی بنا ہے پھر بھی پانی کی طاقت کے ذرایع سے غفلت برتی گئی اور اجناس خام جن سے تیزاب بنایا جاسکتا تھا دساور بھیج دی جاتی تھیں

ہندوستان میں برطانوی نظام کے معذرت خواہ مثلاً سابق دیوان بہادر شری نواس رگھو آینگر اپنی کتاب "احاطہ مدراس میں چالیس سالہ ترقی" میں چند مادی ترقیات کی علامات کی طرف اشارہ کرکے ملکی بہبودی کا ثبوت پیش کرنے کے عادی ہیں۔ اس کے متعلق مسٹر بنرجی اپنی معشیت ہند میں صحیح طور پر لکھتے ہیں۔ "ہندوستان ذرہ بھر بھی تعیشات کی ایک بڑی مقدار جس کا نام لوگ غلطی سے زینت رکھتے ہیں حاصل کرکے بہتر یا مرفہ الحال نہیں ہوگا۔" "یہ فیصلہ دینے کے لئے" وہ لکھتے ہیں "کہ معیار بلند ہے یا پست ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ آیا جن لوگوں نے اس کو اختیار کیا ہے یہ ان کی اخلاقی اور مادی بہبودی کا ممد ہے یا نہیں ؟"

یہ باہمی شہادت ہے کہ اس سے قبل کہ لوگ آرائش سے فائدہ حاصل کریں بلکہ اُن کو اس کا خیال تک بھی آئے اُن میں کی ایک کثیر تعداد خوفناک طور پر ضروری احتیاجات کی محتاج ہے۔ صرف دو مصنفوں کا جن میں سے ایک معاشیات کے طالب علم ہیں دوسرے تربیت یافتہ اور دفتری حکومت کے قدیم حامی ہیں اقتباس کافی ہے۔

بنرجی لکھتے ہیں " موجودہ آمدنی اکثر لوگوں کی جیسا کہ ظاہر ہے ضروریات حیات کو

بھی کافی طور پر مہیا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ جب اضافہ شروع ہوگا تو پہلے چند دور ضروری احتیاجات کے پورا کرنے میں کام آئیں گے اور بعد کے دور اعلیٰ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وقف کئے جائیں گے۔"

مورلینڈ صاحب اس پر زیادہ زور دیتے ہیں "پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ ہندوستان ایک نادار ملک ہے۔ لوگ بحیثیت مجموعی اپنی شدید ترین احتیاجات کے پورا کرنے کے لئے دولت میں ایک بڑے اضافے کے محتاج ہیں۔ مثلاً چند احتیاجات کے نام یہ ہیں ان میں سے اکثر کو اعلیٰ غذا، عمدہ لباس، اعلیٰ تعلیم، عمدہ صحت اور عمدہ مکانات کی ضرورت ہے۔

باقی آئندہ

مترجمہ عبدالقادر سیالکوٹی
متعلم جامعہ ملیہ

مطبوعات جدیدہ

الصراط المستقیم

خواجہ عبدالحیٰ صاحب شیخ التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی کتاب الفرقان فی معارف القرآن کا پہلا حصہ جو سورۂ بقرہ کی تفسیر پر مشتمل ہے الخلافۃ الکبریٰ کے نام سے شائع اور مقبول ہوچکا ہے۔ اب یہ دوسری قسط الصراط المستقیم ہے جس میں انہوں نے سورۂ انفال و توبہ کی تفسیر شایع کی ہے۔ یہ الفرقان کا چوتھا حصہ ہے۔ درمیانی دو حصے بھی امید ہے کہ عنقریب شائع ہوں گے۔ بلکہ جہانتک مجکو معلوم ہوا ہے۔ دوسرا حصہ جس میں سورۂ آل عمران کی تفسیر ہے مطبع میں جاچکا ہے۔

عام خیال کے مطابق تفسیر کا یہ مفہوم ہے کہ قرآن کی ایسی شرح جس میں لغوی ادبی۔ علمی۔ تاریخی اور ضروری و غیر ضروری ہر قسم کی فلسفیانہ اور متکلمانہ بحثیں کی جائیں لیکن خواجہ صاحب نے اس قسم کے مباحث سے جو انسانی دماغ کے مخترعات ہیں اپنی اس کتاب میں احتراز کیا ہے۔ اور صرف انہیں امور کو لیا ہے جو فہم معانی آیات کے لئے ناگزیر تھے۔ ان کے پیش نظر ایک ہی چیز ہے۔ یعنی کلام رب العزت کا اصلی اور حقیقی مفہوم۔ اسی کو وہ نہایت صفائی کے ساتھ شستہ اور فصیح عبارت میں بیان کردیتے ہیں اور انسانی خیالات کی آمیزش سے کلام حق کو بالکل پاک رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصلی تفسیر اسی کا نام ہے۔ ورنہ علمی بحثوں کے گورکھ دہندوں میں پھنسکر انسان بسا اوقات آیات قرآن کے حقائق تک پہونچنے سے قاصر رہجاتا ہے۔

خواجہ صاحب کا طرز بیان سادہ اور مختصر ہونے کے باوجود نہایت پرزور

اور اقرب الی الفہم ہے۔ عامی سے عامی کو بھی اگر یہ تفسیر سنائی جائے تو وہ آسانی سے سمجھ لیگا۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ اس کتاب کا فائدہ بہت عام ہوگا۔

چونکہ سورۂ انفال و توبہ میں مختلف غزوات کا ذکر ہے۔ اور جنگ کے متعلق ہر قسم کی ضروری تعلیمات دی گئی ہیں اس لئے ان کے سمجھنے کے لئے ایک تمہید کی ضرورت تھی اسی غرض سے خواجہ صاحب نے شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں مشروعیت قتال اس کے اصول و شرائط و مقاصد۔ اور اس کی ضرورت و حقیقت پر خود قرآن مجید ہی کی آیات سے مفصل و مدلل بحث کی ہے۔

قرآن کریم مایۂ حیات اور حیات بخش ہے۔ امت مسلمہ کی ساری تباہی اور ذلت کا باعث یہی ہوا کہ اس نے قرآن کو متروک کر دیا۔ لہذا اب مسلمانوں کو زندہ کرنے کے لئے سخت ضرورت ہے کہ اس کتاب آسمانی کا صاف اور صحیح مفہوم ان کے سامنے رکھا جائے تاکہ اس شمع کی روشنی میں وہ سیدھے راستہ پر چلنے لگیں۔ ہمکو امید ہے کہ خواجہ صاحب اس تفسیر کے حصوں کو جلد جلد شایع کر کے اُمت کے ہاتھوں میں پہنچا دیں گے۔ اس اسلام کی یہ نہایت عظیم الشان خدمت ہے۔ اس کی لکھائی۔ چھپائی نہایت عمدہ اور کاغذ چکنا ہے قیمت ۸؍ ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ علیگڑھ۔

محمد اسلم جیراجپوری

قرآن مجید مع ترجمہ فتح الحمید

قرآن مجید کے اس وقت تک متعدد تراجم اردو زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولوی فتح محمدؐ جالندھری صاحب کا یہ ترجمہ ہے جو فتح الحمید کے نام سے موسوم ہے۔ مولوی صاحب نے اس کام میں بڑا وقت صرف کیا ہے۔ پہلی مرتبہ یہ بڑی تقطیع پر

شائع ہوا ۔ لیکن اب مولوی صاحب نے دوبارہ نظر ثانی کی ہے اور نہایت خوشنما موزوں
ومناسب حمایل کی شکل میں دوبارہ شائع کیا ہے۔ ترجمہ نہایت صاف اور قابل اعتماد
ہے ملک کے اکثر مصنفین اور علماء نے بھی پسند کیا ہے مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ
مل سکتا ہے۔ قیمت مجلد ۶ ؍

"ناقد"

نویدِ امید

پھر بہار آئیگی پھر جوش میں سودا ہوگا — زخمِ دیرینہ سے پھر خون ٹپکتا ہوگا

ہاتھ کو دست درازی کا پڑے گا لپکا — پاؤں کو پھر خلشِ خار کا سودا ہوگا

جھانکتی پھرتی ہے ویرانوں کو پھر آبادی — پھر چمن بند کوئی انجمن آرا ہوگا

ڈھونڈتی پھرتی ہے جس فرد کو عالم میں بقا — نوع کا ہے یہ اشارہ کہ وہ پیدا ہوگا

کیا کوئی موت ہے غفلت کہ نہ چونکا جائے — زندگی ہے تو سنبھلنے کا تقاضا ہوگا

رہگیا درد جو دل میں تو کسی دن ایسی — ٹیس اُٹھیگی کہ نہ تسکین کا یارا ہوگا

شرط آنکھیں ہیں نگہ سوزیِ گل سے اکدن — پھر ان آنکھوں سے رواں خون کا دریا ہوگا

بادِ صرصر نے جو چھوڑے ہیں خزاں میں تنکے — ڈوبتوں کو انہیں تنکوں کا سہارا ہوگا

حال کتنا ہی زبوں ہو مگر اپنے کو نہ بھول — تو منفرد ہی قطرہ ہے جو دریا ہوگا

گلشنِ دہر کے آئینہ میں خود بیں ہو کر — تو ہی عکسِ آگنِ روئے چمن آرا ہوگا

ہر کفِ خاک میں امکانِ دو عالم پنہاں — اس کا ذرّہ کبھی دریا کبھی صحرا ہوگا

فردِ بیمثل ہے نیرنگِ جہاں کا بانی — رنگ لائے گا وہی فرد جو یکتا ہوگا

"صدائی خاموش"

ہر یکے را بہر کارے ساختند

غالب ہوا جب اہلِ زمیں پر سکوتِ شام — رخصت ہوئی نگاہوں سے پھولی ہوئی شفق

دن بھر کے جتنے کام تھے سب ہوگئے تمام — اُلٹا بیاضِ صبح کا وہ زر فشاں ورق

ظلمت برنگِ زلفِ سیہ فام چھاگئی — سارے جہاں میں اب ہے سیاہی کا ایک رنگ

پیشِ نگاہ شمعِ شب افروز آ گئی — اور اُڑ کے اس کے ساتھ ہی سامنے آیا اک پتنگ

بیتاب بے قرار جگر تفتہ سر بکف — جویائے وصلِ شمع و مہیائے سوختن

لاکھ اس کو دستِ رو سے کرے کوئی برطرف — پرواز جاں فشاں سے وہی صرفِ سر زدن

اے بدنصیب کرمکِ بے عقل بے خرد — کیا مل گیا جو آگ میں یوں گر کے جل گیا

اے ہوشمند سوزِ محبت سے نابلد — تو یوں سمجھ، کہ تھا یہی خلقت کا اقتضا

آزاد عظیم آبادی

کلام حسرت

رنج راحت ہے سکونِ غمِ ہجراں کی قسم
یادِ جاناں کی قسم جلوۂ جاناں کی قسم

تجھکو مخمور جو دیکھا ہے تو اے پیکرِ ناز
مست ہم بھی ہیں تری مستیٔ لرزاں کی قسم

شوق سے جور کئے جائیں وہ، اربابِ وفا
خوش بہر حال ہیں عیشِ غمِ پنہاں کی قسم

کافرِ عشق ہیں، نظارۂ خوباں میں ہمیں
سیرِ جنت ہے، ہوسکاریٔ ایماں کی قسم

کیا تھے ہم، ہو گئے اک ساغرِ مے سے کیا ہم
جادوئے گردشِ پیمانۂ گرداں کی قسم

پیکرِ خاکیٔ عشاق بھی ہے، صورتِ دل
سر بسر نور، ترے حسنِ درخشاں کی قسم

حسرت اب کیوں ہیں وہ پردے میں، کہ مانندِ وفا[1]
"ہم نہ دیکھینگے اُنھیں دیدۂ حیراں کی قسم"

مرسلہ بیگم حسرت موہانی

[1] مرحوم حکیم عبدالہادی خاں رامپوری۔

نقد و نظر

"سوئزرلینڈ نے غیر تحریری قانون کے عجیب معنی ایجاد کئے ہیں۔ اگر یہ ثابت کردیا جائے کہ بالشویزم کے ہم موید نہیں ہیں۔ و نیز اس رائے سے جیوری بھی متفق ہو جائے تو گویا روسی حکومت کے ایک نمایندے کا قتل کر دینا بالکل جایز ہوگا!

لاسین کی دوسری کانفرنس میں روسی نمایندہ وُرووسکی کی قاتل مورس کونرڈی کو ایک ایک ایسی عدالت نے جو صرف ابتدا سے آخر تک اس بحث میں منہمک رہی ہے کہ روسیوں کی حکومت کا سرزمین روس میں کیا طرز رہا ہے، صرف وجہ نزاع کے بیان کر دینے پر رہا کر دیا ہے۔ نو افراد جوری میں سے پانچ، قاتل کو (جو یقیناً مجرم تھا) سزا دینے پر متفق تھے۔ لیکن بقیہ چار کا یہ خیال تھا کہ اگر مقتول کسی ایسے سیاسی عقیدہ کا پابند ہو جس سے قاتل متفق نہ ہو اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ مقتول غیر ملکی بھی ہو، قتل کوئی اہم جرم نہ سمجھا جائے گا۔ بلکہ ایک معمولی غلطی ہوگی۔ یہ کوئی نئی تعلیم نہیں ہے۔ لیکن ہاں تعجب تو یہ ہے کہ یہ سوئزرلینڈ جیسے ملک میں ہوتا ہے جو امن اور قانون کا سب سے بڑا حامی کہا جاتا ہے۔

ماسکو کی زرعتی نمایش میں "گائے کے تیسرے دن" کی شام اس طرح منائی گئی کہ ایک جوری کے سامنے جس میں سب کسان تھے اور جس کا صدر بھی ایک ماہر فن زراعت تھا ایک گائے کا مقدمہ پیش ہوا۔ گائے پر مندرجہ ذیل جرم لگائے گئے تھے۔

۱۔ اوس کا وزن معمول سے کیوں کم ہے۔؟

۲۔ خوب تیار اور موٹی کیوں نہیں ہے؟

۳ دودھ کافی کیوں نہیں دیتی ؟

نیز دوسرے جرایم شلاً کمزور کپڑے دنیا وغیرہ بھی فردِ جرم میں شامل تھے صفائی کے گواہوں نے بیان کیا کہ جانور کو کھانے کو کم ملتا ہے اور تبایا کہ اگر وہ اچھی طرح رکھی جائے تو خوب ترقی کرے گی۔ وکیل سرکار کی جرح یہ تھی کہ خرابی اصل میں نسل ہی کی ہے۔ جوری نے گائے کی بیگناہی کا فیصلہ صادر کیا۔ اور گائے کے مالک کو مجرم ٹھرایا۔ جس کو ایک زراعتی تعلیمگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کی سزا دیگئی۔

'حفاظت اطفال' کے نام سے جو رسالہ امریکہ سے شایع ہوتا ہے اس کی تجویز ہے کہ اب والدین کی تعلیم کے لئے بھی مدرسے کی ضرورت ہے۔ یعنی باپ یا ماں ہونے کے لئے جس قابلیت و واقفیت کی ضرورت ہے اس کی باضابطہ تعلیم ہونی چاہیئے۔ زمانہ نے اس قدر ترقی کی ہے اور موجودہ تہذیب و تمدن نے اس قدر جدید مسائل پیدا کردئے ہیں کہ بغیر کافی تعلیم کے والدین اپنے فرایض کو انجام نہیں دے سکتے۔ اب شیخ سعدی کا مقولہ کہ علم پدر آموز 'علم پسر آموز' میں تبدیل ہونے والا ہے۔

ڈیلی ہیرالڈ (لندن) جو مزدور جماعت کا اخبار ہے۔ اس جماعت کے برسرِ اقتدار ہونے پر ایک معقول تجویز پیش کرتا ہے اس کی رائے ہے کہ وزارت کو فوراً ایک عہدہ، وزارت امن، کے نام سے قائم کرنا چاہیئے۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ تمام دنیا میں وہ صلح کا پیغام پہنچائے۔ معاندانہ و منافقانہ تحریروں کی اشاعت کا سدباب کیا جاوے اور ہر ملک میں اپنی وفود بھیج کر لوگوں کو امن و آشتی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ دنیا سے فتنۂ جنگ فنا ہو سکے۔

لیکن اس تجویز کے سننے والے انگلستان میں کتنے لوگ ہیں اب

کا جواب شاید اخبار مذکور بھی نہیں دے سکتا۔

ممالک یورپ میں سوئٹزرلینڈ غالباً آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے سب سے چھوٹا ملک ہے، لیکن سیاسی اعتبار سے اس کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کی مثال کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی۔ اس دور جدید میں جب بادشاہت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور ہر ملک کا نظام حکومت جمہوریت کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ جس میں رائے عامہ کو زیادہ سے زیادہ دخل ہے، سوئٹزرلینڈ کا نظام حکومت تمام ممالک سے مختلف اور مخصوص حیثیت رکھتا ہے جس میں جمہوریت کی شان سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ بائیس اضلاع میں منقسم ہے ہر ضلع کی علیحدہ ایک پنچایت ہے جس کو د *Landsgemeinde* کہتے ہیں، یہ ہر سال موسم بہار میں عموماً یکشنبہ کے دن کسی کھلے میدان میں منعقد ہوتی ہے۔ اور ہر بالغ مرد اُس میں شریک ہو کر مختلف قوانین پر جو مقامی حالات کو مدنظر رکھکر پیش کئے جاتے ہیں، بحث کر سکتا ہے۔ اور اُس کی منظوری کے لئے رائے دینے کا حق رکھتا ہے۔ جو قوانین اس پنچایت میں کثرت آرا سے پاس ہوتے ہیں وہ مسلّم سمجھے جاتے ہیں، انتظامی معاملات کے متعلق پنچایت کی منظور کردہ تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چند اشخاص جنکی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں ہوتی ہر سال پنچایت خود ہی منتخب کر کے مقرر کر دیتی ہے۔

انہیں پنچایتوں کے ذریعہ سے مذہبی، اخلاقی اور دیگر مقدمات فیصل کئے جاتے ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی آبادی جو کسی ایک قوم و نسل کے افراد پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں جرمن۔ اطالوی اور فرانسیسی سب ہی شامل ہیں۔ اور مختلف مذاہب کے لوگ بھی ہیں، لیکن پھر بھی اختلاف نسل و قوم و اختلاف مذہب اور جذبۂ وطنیت کی بنا پر کبھی کوئی ناگوار واقعات نہیں پیش آئے اور باوجود ان اختلافات کے سب لوگ اپنے کو ایک ہی ملک کا باشندہ سمجھتے ہیں اور اس قانون پر عمل

کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جو کثرت آرا سے منظور ہوا ہو، چاہے انفرادی حیثیت سے بعضوں کے لئے وہ قانون کتنا ہی نقصان دِہ کیوں نہ ہو۔ غرض ملک کا ہر باشندہ مقنن بھی ہے اور منصف بھی اور حقیقی معنوں میں خود مختار ہے۔ لیکن ہر شخص اپنے لئے ایک محدود دائرۂ عمل رکھتا ہے۔ جس کی تعین رائے عامہ پنچایت کے ذریعے سے کرتی ہے۔

علاوہ ان مقامی پنچایتوں کے ایک مرکزی حکومت بھی ہے جس کے ذمہ زیادہ تر بیرونی تعلقات کا قایم رکھنا ہے، لیکن اس کو معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں دیا گیا ہے۔ اور ہر اہم معاملہ پر عام رائے لینا ضروری ہے۔ ورنہ تیس ہزار باشندے احتجاج کرکے قانون کو منسوخ کرا سکتے ہیں۔

علمائے سیاست نے امور حکومت میں رائے عامہ کے اس قدر زیادہ دخل پر بہت سے کلیات قائم کئے ہیں اور اُس کی اچھی طرح رد و قدح کی ہے اور پھر اُس کو ناقابل عمل اور مضر ثابت کیا ہے۔ لیکن اُن کے سیاسی نظریات کی تردید میں صرف یہ پیش کر دینا کافی ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں یہ نظام حکومت عرصہ سے قائم ہے اور اسپر عمل ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں بھی جمہوریت کا یہ تخم صدیوں تک موجود رہا۔ ہر ہر قریہ میں پنچائتیں تھیں جس کا صدر مُکھیا ہوا کرتا تھا۔ یہ ہی عدالت تھی اور یہ ہی جماعت مقنن ہر طرح کے مقدمات سادہ لوح پنچ کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ نہ جھوٹے گواہوں کی ضرورت تھی، نہ چرب زبان وکیلوں کی، نہ بڑی بڑی عدالتیں تھیں، نہ راشی منصف اور پولیس کے بیرحم سپاہی لیکن پنچ کا ہر قانون سب کے لئے یکساں قابل عمل ہوتا تھا اور ہر فیصلہ پر ظالم و مظلوم دونوں خوشی سے سر تسلیم خم کرتے تھے۔

"ناظر"

شذرات

ماہ دسمبر میں انجمنوں اور مجالس کی گرم بازاری ہندوستان کی خصوصیت ہوگئی ہے اور اخبارات کے کالم ہر سال چند ایسی انجمنوں کے نام بھی ظاہر کرتے ہیں جن سے پبلک اکثر سال بھر ناواقف رہتی ہے، لیکن اس ہفتہ کی شورش میں وہ اپنی آواز اس قدر بلند کر دیتے ہیں کہ غیر متوجہ پبلک بھی سُننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ مسلم لیڈیز کانفرنس علی گڑھ کا اجلاس بھی اس خصوصیت میں کسی دوسری انجمن سے کم نہیں۔ لیکن صنف نازک کی پر جوش مصلحین نے جس بارگراں کو اپنے ذمہ لیا وہ ان کی فطری نزاکت اور مسئلہ کی پیچیدگی کے اعتبار سے کچھ زیادہ موزوں نہ تھا۔ ان کی یہ تجویز کہ مرد ایک سے زیادہ شادی نہ کریں اور تعداد ازدواج کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے ممکن ہے کہ جدید اصلاحات کے پروگرام میں آجائے لیکن ہم باوجود اصلاح پسند ہونے کے اصلاحات کے لئے کسی وجہ اور ضرورت کے بھی متلاشی ہیں۔ اگر خواتین اپنے جذبات کو بے نقاب کرتے ہوئے اب تک ہچکچاتی ہیں تو وہ "ماڈرن ریویو" (جس نے ان سے ایک خاص انداز میں اظہار ہمدردی بھی کیا ہے) کی زبان مانگ لیں یا کسی زیادہ آزاد خیال بہن کی مدد حاصل کریں تاکہ اس مسئلہ کے کیف و کم اور اسباب و علل پر کافی بحث ہو سکے۔ ورنہ محض "نسوانی حکم" خواہ موجودہ دور تہذیب میں کیسا ہی واجب تعمیل کیوں نہ ہو مشرق کی دنیا میں بے چون و چرا

تسلیم نہیں کیا جاسکتا ۔

ایک زمانہ تھا کہ تعداد ازدواج کی انسداد کے لئے ہر شخص آسانی سے وکیل بن جاتا تھا لیکن گذشتہ عالمگیر جنگ و تمدن یورپ کے جدید اضافہ معلومات کے بعد اب بڑے سے بڑے آزاد خیال اصلاح پسند کے لئے بھی یہ ناممکن ہو گیا ہے۔ کہ وہ مسلمان خواتین کی اس تجویز کی تائید کر سکے ۔

ہمارے نزدیک مسلم لیڈیز کانفرنس کو اسی ایک معاملہ میں اپنی سرگرمی و عملی جدوجہد کی مثال پیش کرنی چاہئے۔ اور اون کو اپنی اس تجویز کے متعلق مستقل پروپاگنڈا شروع کر دینا ضروری ہے۔ تاکہ واقعات کی روشنی میں صحیح رائے قایم کرنے کا موقع مل جائے ۔

علم و عمل کی جنگ بھی دنیا میں اب ایسی ہی نمایاں ہوتی جاتی ہے جیسی محنت و سرمایہ کا تضاد۔ مغرب اپنی ترقیات علمی و آزادی فکر پر نازاں ہے۔ ہندوستان کی غلامی کی فضا میں بیٹھ کر ہم اس کی ترقی پر اظہار حیرت اور اس کی آزادی پر رشک کرتے ہیں۔ لیکن بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ آزادی فکر ورائے کو انگلستان میں بھی اسی حد تک جائز قرار دیا جاتا ہے۔ جہاں تک کہ وہ سرمایہ داری و حکمرانی میں سد راہ نہ ہول ۔ حال میں لندن یونیورسٹی کے پروفیسر آرنلڈ ٹوینبی کو اپنے عہدہ یونانی زبان کی پروفیسری سے اس سبب سے استعفا دینا پڑا کہ گزشتہ جنگ یونان و ترکی میں انہوں نے اخبارات کے ذریعہ سے یونانیوں کے حیا سوز مظالم اور منافی تہذیب شقاوت کی داستان شائع کردی تھی اور ایشیا رکوچک میں جو کچھ گذرا اس پر ایک ایماندار و باخبر شخص کی حیثیت میں رائے زنی کی تھی۔ پروفیسر مذکور

کا گناہ صرف اسی قدر ہے کہ جو کچھ وہ جانتے اور سمجھتے تھے اس کا اظہار اُنہوں نے ایسے وقت کر دیا جبکہ ان کی خاموشی معصیت کی مرادف ہوتی انگلستان کی سرکاری یونیورسٹی اس آزادی کو جائز نہیں قرار دیتی!

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کارفرماؤں سے یہ شکایت کہ وہ اپنے جائز حقوق کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ایک مضحکہ خیز بات ہے اُن کی حق ناشناسی اب ضرب المثل کے حدود میں آ گئی ہے عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت!

"نیابت الہی" کا منصب اگر وہ قبول کر لیتے ہیں تو کسی کو شکایت نہ ہونا چاہئے۔ لیکن اگر اس منصب جلیلہ کے پیش کرنے والے کا نام اُن سے دریافت کیا جائے اور وہ خاموش ہو جائیں تو ضرور آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ جو چاہیں اُن کی نسبت رائے قایم کر لیں۔ لیکن عبدیت" کی جو شان اس درسگاہ میں نظر آ رہی ہے وہ البتہ قابل غور ہے۔ خدا اور بندہ کا تعلق تو رشتۂ عبدیت میں خدا جانے کیا ہو لیکن "بندہ و آقا" کا مرتبہ تو مسلم یونیورسٹی میں اُس وقت ہی واضح کر دیا گیا تھا جبکہ اس کی بنیادوں کی پختگی کا مدار مغربی طرز تعمیر قرار پایا تھا۔ لیکن مشرقی زمین کی شورانگیزی اس وقت بھی اندیشہ ناک تھی اور آج بھی کبھی کبھی "بندہ و آقا" کا فلسفہ "عبدیت" کے نظریہ میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علی گڈھ میگزین کے ایک مضمون "فلسفہ ازدواج" کا چھپ جانے کے بعد شایع نہ ہونا یونیورسٹی مذکور کے اسی فلسفۂ "عبدیت" کی ایک تفسیر ہے۔

ہم کو مطلق حیرت نہیں کہ وہ مضمون قابل گرفت قرار پایا۔ لیکن تعجب اس امر پر ہے کہ اعتراض اُن صاحبوں کو ہے جو نہ پردہ کے قائل ہیں، نہ بیوی کے مشرقی تخیل کو مانتے ہیں اور نہ جن کے نزدیک حقوق نسواں کے کوئی حدود قایم کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا

تصانیف مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

تاریخ القرآن | جس میں قرآن حکیم کے ابتدائے نزول سے لیکر آج تک کے تمام تاریخی حالات اور اس کے متعلق ہر قسم کی معلومات اور لطیف علمی مباحث نہایت تحقیق اور اختصار کے ساتھ مختلف زبانوں کی مستند کتابوں سے اخذ کرکے لکھے گئے ہیں قیمت عہ مجلد عہ

خواتین | ابتدائے اسلام سے آج تک کے تینتیس ۳۳ مشہور مسلمان خاتونوں کے معتبر تاریخی حالات قیمت عہ

حیات جامی | مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی نہایت مکمل اور مقبول سوانح عمری ہے قیمت ۸ر

حیات حافظ | مولانا حافظ علیہ الرحمۃ کے مکمل حالات زندگی کے ساتھ ان کے کلام پر نہایت دلاویز تنقید قیمت عہ

محجوب الارث | فقہ اسلامیہ کے مشہور مسئلہ پر اجتہادی رنگ میں دلچسپ بحث ہے قیمت ۴ر

الوراثۃ فی الاسلام | قانون وراثت پر مولینا کا مجتہدانہ کارنامہ (عربی) قیمت ۸ر

تاریخ الامت | اسلامی تاریخ کو پہلی مرتبہ مولانا نے مسلسل وصاف اردو میں بیان کیا ہے جس کے چار حصے سیرۃ الرسول خلافت راشدہ عہد بنی امیہ و بنی عباس تک شایع ہو چکے ہیں قیمت ہر حصہ کی جداگانہ ۱۲ر ۔ مکمل عہ

شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

کی

جدید مطبوعات

۱۔ **تاریخ الدولتین** (از مولانا نیاز فتحپوری) بنی امیہ و بنی عباس کے عہد کی سب سے زیادہ موثر دلکش قابل استناد تاریخ ایک جلد میں صرف اسی کتاب میں نظر آئیگی جو جرجی زیدان مصری کی شہرہ آفاق تاریخ اسلامی کی بنیاد پر اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے۔ طرز بیان کی خوبی اور عبارت کی دلکشی کے لئے مولانا نیاز فتحپوری کا نام کافی ضمانت ہے۔ قیمت

۲۔ **انتخاب کلام میر** (مرتبہ مولوی نور الرحمن۔ بی۔ اے) اردو زبان کے بہترین شاعر اور استاذ الاساتذہ ہونیکی حیثیت سے میر کے ضخیم کلام کا انتخاب مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے۔ لیکن جس سوز و گداز نے میر کو خدائے سخن بنایا ہے اس کے صحیح نمونے صرف اسی انتخاب میں نظر آتے ہیں۔ جو نہایت مختصر ہونے کے ساتھ ہی میر کے تمام دیوان کا جوہر ہے ابتدا میں حالات زندگی اور ایک زبردست مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں اردو شاعری کی تاریخ محاسن کلام میر اور موجودہ فن تنقید کے اصول پر اس عہد کے شعراء کا موازنہ شعراء قدیم سے کیا گیا ہے۔ مجلد قیمت عہ

۳۔ **عرض جوہر** مولانا محمد علی مدظلہ کی غزلیات کا مجموعہ اس سے قبل شایع ہوچکا ہے لیکن زندان بیجاپور کے مکاشفات اس میں بھی نہیں ہیں عرض جوہر میں مولانا کا تازہ ترین کلام اور وہ بے نظیر غزلیں موجود ہیں جو صرف بیجاپور کے زندانی ہی کی زبان سے ادا ہوسکتی تھیں قیمت ۸

۴۔ **الصراط المستقیم** (تفسیر سورہ انفال و توبہ۔ از مولانا خواجہ عبد الحی صاحب) خواجہ صاحب کی تفسیر القرآن کے بعد ایک جدید تصنیف شایع ہوئی ہے۔ جس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو خواجہ صاحب کا حصہ ہوگئی ہیں مباحث قرآنی پر جس وضاحت و دلکشی کے ساتھ خواجہ صاحب نے قلم اٹھایا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت عہ

بااہتمام عبد اللطیف خاں نیجر

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرّحمٰن

مطبع جامعہ ملّیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

مطبوعات شرکت کاویانی برلن (جرمنی)

(صرف مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ ہندوستان میں ان کتابوں کو فراہم دفروخت کرتا ہے)

۱- سفرنامہ حکیم ناصر خسرو مع روشنائی نامہ وسعادت نامہ فارسی مصنف چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوا - اس عہد کے بلاد اسلامیہ کے چشم دید حالات نہایت دلچسپ و عبرت آموز جس میں مصنف کی دو غیر مطبوعہ نایاب مثنویاں فلسفہ حکمت پر شامل ہیں - سرورق و سرنامہ اصل ایرانی نسخہ کے مطابق مطلاً ورنگین - کاغذ نہایت اعلیٰ و دبیز چکنا سفید مثل چینی کی پلیٹ کے چمکیلا - طباعت نظر افروز قیمت [illegible]

۲- زاد المسافرین | حکیم ناصر خسرو کی یہ دوسری معرکۃ الآرا کتاب ہے جو عرصہ سے ناپید تھی اور اب مطبع کاویانی نے نہایت خوبی و اہتمام کے ساتھ طبع کرائی ہے - فلسفہ و تصوف اور حکمت اسلامی کی یہ مستند کتاب ہے - قیمت [illegible]

۳- گلستان | شیخ سعدی شیرازی کی شہرۂ آفاق کتاب جدید قالب میں نظر آتی ہے کاغذ عمدہ طباعت نفیس اور سرورق خوبصورت - قیمت [illegible]

۴- تیاتر | از مرزا ملکم خان ناظم الدولہ جنکی علمی و قلمی جدوجہد سے ایران دوبارہ زندہ ہوا - یہ ان کے تین نثر ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں گذشتہ صدی کے نظام حکومت ایران کی ابتری کی تصویر دکھائی گئی ہے - فارسی جدید کے قدردان اس تحفہ کو بڑی قدر سے قبول کریں گے قیمت [illegible]

۵- موش و گربہ فارسی | از خواجہ عبید زاکانی - جو آٹھویں صدی کا ہجوگو اور مشہور شاعر تھا چوہے بلی کی جنگ کا قصہ جس میں ابنائے عصر کی ہجو ملیح ہے جو عہد حاضر کے لئے بھی یکساں برمحل ہے - ہر صفحہ پر رنگین و دلآویز تصاویر نظم نہایت دلچسپ و مہذب بچوں کے واسطے بھی نہایت موزوں ہے قیمت ۵

۶- تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء (عربی) | مؤلفہ حمزہ ابن الحسن اصفہانی ۳۵۰ھ ہجری میں لکھی گئی انتہائی کاوش کے ساتھ قدیم تواریخ فارس و روم - یونان مصر - عراق - شام و عرب کے متعلق تمام صحیح و معتبر سنین کی تفتیش و تحقیق ہے - شائقین تاریخ کے لئے نہایت دلچسپ و مفید تحفہ ہے - قیمت [illegible]

۷- نصاب الصبیان | فارسی جدید کے شائقین اور طلباء کے واسطے بہترین مجموعہ نظم ہے قیمت عہ

۸- رہنمائے پسران | بچوں کو خط و کتابت کے پیرایہ میں عمدہ نصیحتیں کی ہیں [illegible]

۹- تلغراف بی سیم | فارسی میں اور میں ٹیلیگرافی پر قابل قدر تصنیف ہے جس میں نقشے تصویریں و مثالیں شامل ہیں قیمت [illegible]

۱۰- لغات المانی بفارسی | فارسی و جرمن زبان کی لغت - قیمت [illegible]

مبادی معاشیات | علم المعیشت میں قابل قدر اور گراں مایہ اضافہ ہے جو اصول معاشیات پر تازہ ترین مباحث پر حاوی ہے از پروفیسر ڈاکٹر حسین خاں صاحب قیمت عہ؍ مجلد عمہ؍

خطبہ صدارت شیخ الہند مرحوم | بہ تقریب افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ قیمت ۲؍

خطبہ صدارت مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم | بہ تقریب جلسہ اول تقسیم اسناد جامعہ ملیہ قیمت ۲؍

اسلامی تہذیب و قومی تعلیم | ڈاکٹر سر پی۔ سی رائے کا وہ مشہور و معروف خطبہ صدارت جو ممدوح نے بہ تقریب جلسۂ دوم تقسیم اسناد جامعہ بزبان انگریزی پڑھا۔ جس میں مسلمانوں کی گذشتہ علمی خدمات کی تاریخ کا قابل دید مرقع ہے۔ ترجمہ مولوی محمد مسلم ایم۔ اے قیمت ۴؍ انگریزی ایڈیشن قیمت ۸؍

ترکوں کی کہانیاں | محبت اسلامی و غیرت قومی کو جوش دلانے والی چند ترک بہادروں کی جانبازیوں کے نہایت سچے اور بصیرت افروز تاریخی واقعات۔ زبان سلیس و عام فہم اور آسان۔ قیمت ۴؍

حقائق اسلام | فلسفۂ اسلام پر عقلی دلائل و براہین از مفتی انوار الحق صاحب ایم اے نئی روشنی کے حضرات کے واسطے قابل قدر تحفہ ہے قیمت عہ؍

المدنیۃ و الاسلام | فرید وجدی علامۂ مصر کی عربی کتاب کا بہترین و دلکش ترجمہ کہ اصل کتاب اور ترجمہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اسلامی اصول پر محققانہ اور دلچسپ مباحث۔ از مولٰنا رشید احمد انصاری مرحوم استاذ جامعہ و سابق پروفیسر مدرسۃ العلوم قیمت عہ؍

مکاتیب | نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر۔ دلچسپ۔ پُر از معلومات بہترین مجموعہ مرتبہ مولوی محمد امین صاحب زبیری مہتمم تاریخ بھوپال قیمت عہ؍

تصانیف خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی پروفیسر جامعہ ملیہ علیگڈھ

الفرقان فی معارف القرآن

قرآن حکیم کی اس سے بہتر زبان اردو میں کوئی تفسیر ملک میں موجود نہیں۔ مولینا کی یہ خدمت قابل قدر و ستائش ہے۔ آپ جن مضامین کو دقت و زمانہ کے لحاظ سے زیادہ ضروری و اہم خیال فرماتے ہیں۔ پہلے انہیں کو ترتیب فرما رہے ہیں۔ اب تک دو حصے شایع ہو چکے ہیں۔

حصہ اول۔ الخلافۃ الکبریٰ۔ سورۂ بقر کی مکمل و مفصل تفسیر حجم ۲۲۴ صفحات قیمت للعہ مجلد صہ

حصہ چہارم۔ الصراط المستقیم۔ سورۂ انفال و توبہ کی مبسوط تفسیر۔ شروع میں مسئلہ جہاد پر ایک بصیرت افروز مقدمہ کا اضافہ ہے

حجم صفحات کاغذ ولایتی سفید چکنا قیمت عہ

بصائر۔ حضرت موسیٰ اور فرعون کے واقعات۔ زمانہ حاضرہ سے تطبیق طبع جدید جس میں بعض مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے قیمت ۱۲

ان کتابوں کے علاوہ اردو زبان کے تمام مشہور مصنفین مولانا شبلی، حالی، سرسید، مولوی نذیر احمد، اور زمانہ حال کے مصنفین مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا نیاز فتحپوری، حضرت خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری وغیرہ وغیرہ کی جملہ تصنیفات اور مطبوعات انجمن ترقی اردو دارالمصنفین وغیرہ ہمہ وقت موجود رہتی ہیں۔

منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ علی گڈھ سے مفصل فہرست طلب کیجئے

فہرست مضامین

جلد ۳ | ماہ رجب سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۲۴ع | نمبر ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد سوم	رجب سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۲۴ء	نمبر ۲

مسلمانانِ ہند

اور

تحریک اصلاح

احساساتِ عامہ پر جس تحریک کا انحصار ہو اوس کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ طبقہ اُس کی صحت کی تصدیق کرے جس سے عوام کے احساسات وابستہ ہیں۔ مسلمانوں کی سیاست جس کی بنا حق و صداقت پر رکھی گئی ہے خاص طور پر اوس گروہ کی دست نگر ہے جو ایک طرف خدا اور اوس کے احکام سے باخبر ہو اور دوسری طرف انسان اور اوس کے حقوق سے

سیاسی جد و جہد کا ہر دور اسی گروہ کی صحیح فہمیوں اور غلط فہمیوں کا پابند رہا۔ اگر کبھی عوام نے اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کیا لیکن مذہبی گروہ نے اوس کی تائید سے انکار کر دیا عوام کی جد و جہد قطعاً رائیگاں ہو گئی کوئی نتیجہ نکلا بھی تو یہ کہ طبقہ جہلا اور طبقہ

علمار میں وہ مخالفت پیدا ہوگئی جس کے اثرات کبھی مٹ نہیں سکتے اکثر ایسا بھی ہوا کہ طبقہ علمار نے آواز بلند کی لیکن عوام نے صدا بصحرا سمجھکر اوس پر کوئی توجہ نہیں کی بلکہ کبھی جہلا گمراہ ہوے اور کبھی علمار۔ کوئی متفقہ قوت ایسی مجتمع نہ ہوسکی جو حق وصداقت کو کذب و باطل پر غالب کرسکتی۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی سیاسی زندگی اسی کشمکش میں مبتلا رہی۔ ایک زمانہ وہ تھا جب دہلی اور نواح دہلی کے چند خدا شناس علمار نے اپنے قول و عمل سے عام اعلان کردیا کہ واقعات کس طرح کے ہیں اور مسلمانوں کے فرایض کیا۔ اونہوں نے اس کی کوشش کی کہ جہلا نہیں علمار اپنے فرایض سے باخبر ہو جائیں۔ اون کی راست روی جہلا کو خود بخود راہ راست کی طرف متوجہ کردے گی لیکن طبقۂ علمار نے اس اعلان کو اس طرح سُنا جس طرح کوئی مبتلائے عیش نوحۂ غم کو۔ وہ مکدر بھی ہوگیا اور متفکر بھی۔ وہ اس کے لئے ہرگز تیار نہ تھا کہ اپنی آسان پسند زندگی کو حق و ایمان کی دشواریوں پر قربان کردے۔ نتائج معلوم، صدائے حق پتھروں اور دیواروں سے ٹکراکر خاموش ہوگئی نہ علمار کی خدا فراموشیاں گئیں اور نہ جہلا کی خود فروشیاں۔

لیکن انسان جبر و ظلم سے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ جب طبقۂ علمار نے اپنے فرایض تبلیغ کو غسل و جنابت پر ختم کردیا اور تلقین ایمان کی جگہ پر تکفیر کے فرایض انجام دینے لگے عوام نے یہ طے کرلیا کہ اگر کوئی صورت اُن کی دستگیری کی پیدا ہوسکتی ہے تو وہ نہیں حق شناس شخصیتوں کے ذریعہ سے جن کو بظاہر "نیابت رسول" کی ذمہ داریوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس حقیقت کے قائل ہوگئے کہ طبقۂ علمار میں بھی جہلا رہیں اور طبقہ جہلا میں بھی علمار، اس انکشاف کے بعد علمار کا سیاسی اقتدار روز بروز کم ہوتا گیا بالآخر نہ اون کی کوئی

قوت رہی اور نہ کوئی اہمیت۔ صفحہ ہستی پر وہ ایک نقش باطل ہو کر رہ گئے دنیا یہ سمجھ چکی تھی کہ ایک دن یہ نقش بھی مٹ جائے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس سے بدتر کوئی صورت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ طبقہ ہمیشہ کے لئے بے کار ہو جائے جو امور مذہبی کا نگراں ہے لیکن وہ مجبور تھے وہ حسرت و افسوس کے ساتھ یہ دیکھ رہے تھے کہ علماء خود اپنی غفلت اور اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے اپنے وجود کو رائیگاں کر رہے ہیں۔

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے بھی تو یہ رنداں قدح خوار ہوئے

سیاسی و اخلاقی جد و جہد اب اس کلیہ کی قائل ہوگئی اور قوت اون شخصیتوں کے ہاتھ میں آگئی جن کو دین و مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ اس کے نتائج کئی حیثیتوں سے اسلامی تمدن کے لئے خطرناک تھے۔ نہ معاشرت کو اخلاق سے کوئی تعلق رہا اور نہ سیاست کو مذہب سے مسلمانوں کا طرز معاشرت۔ اون کا نظام اخلاق اور اون کا طریقہ تعلیم روایات مقدسہ سے بیگانہ ہو کر ایک نئے اصول پر قائم ہو گیا، رہبری اُن لوگوں نے کی جو دماغ رکھتے تھے اور حوصلے۔ مقتدی وہ ہوے جو ضروریات کے پابند تھے اور مصالح کے۔

سرسید کی شخصیت ایک مخصوص حیثیت رکھتی ہے۔ علماء کا گروہ اونھیں "اخوان الشیاطین" میں شمار کرتا رہا اور "روشن خیال" جہلاء اونہیں مسیح موعود کا مرتبہ دیتے رہے۔ آج بھی علماء کا ایک طبقہ اونہیں مسلمانوں کی گمراہیوں کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور تعلیم یافتہ جہلاء کا ایک گروہ اون کو موجودہ "دور تعلیم و تہذیب" کا ایک مجدد۔ حالانکہ سرسید نہ وہ تھے اور نہ یہ۔ اون کی ہستی محض اوس رد عمل کا نتیجہ تھی جس کی ذمہ دار علماء کا جہل مرکب تھا۔ گروہ علماء چاہتا تھا کہ عوام اوس کے اقتدار سے باہر قدم نہ رکھنے پائیں ورنہ اوس کی بھبکیاں

قائم نہ رکھ سکیں گی۔ برہمنیت اوس پر بھی مسلط ہوگئی تھی وہ کسی طرح یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ تعلیم اور بالخصوص تمدن جدید عوام کو اوس سے برگشتہ کردے اگر یہ گروہ اپنے فرائض نیابت کو دلسوزی اور نیک نیتی کے ساتھ انجام دیتا رھا ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ وقتی مصالح مسلمانوں کو صحیح راستہ سے ہٹاکر دور جدید کی ابلہ فریبیوں میں مبتلا کردیتے۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ علمار اپنا حق رہبری کھوچکے تھے پھر بھی وہ متمنی تھے کہ عوام پر اوسی شدت کے ساتھ حکمرانی کرتے رہیں جس طرح پہلے کررہے تھے۔

جب علمار کے طبقہ نے یہ محسوس کرلیا کہ دور جدید نے مسلمانوں کو اون کے اقتدار سے نکال کر آزاد کردیا ہے اونہوں نے انتقاماً کفر کے فتوے صادر کئے کوئی ایسا نہ تھا جو ملعون اور مرتد قرار نہ دیا گیا ہو۔ خدا نے صرف شیطان کو طوق لعنت پہنائی تھی رسول اکرم نے تکفیر کو ایک فعل مذموم قرار دیا تھا مگر ان خدا کے بندوں اور رسول کے قایم مقاموں نے تکفیر کا غلغلہ بلند کردیا ہر شخص جو صرف نحو اور میزان منشعب کے علاوہ کسی دوسرے درس کا قایل تھا وہ کافر ٹھرادیا گیا کفر منحصر ہوگیا گفتار و رفتار وضع ولباس اور تبسم وتکلم پر اور یہ فرض تکفیر اس جوش وخروش کے ساتھ ادا کیا جارہا تھا گویا خدا کے سب سے بڑے حکم اور رسول کی سب سے بڑی تعلیم کی مطابعت کی جارہی ہے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ تکفیر کرنے والوں کے گروہ میں نمایاں حصہ اون علمار کا تھا جنہوں نے عمر بھر کبھی مسلمانوں کے سب سے بڑے فرض کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ وہ کبھی اون فرائض کی تلقین نہیں کرتے تھے جن کے نتائج سنگین اور جن کی تبلیغ مشکل تھی۔

بزیر دلق ملمع سیاہ کارانند
دراز دستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں

اگر صرف اون گمراہ اور مرتد انسانوں کی تکفیر کی گئی ہوتی جو واقعتاً قابل تعزیر تھے کوئی کشمکش پیدا نہ ہوتی لیکن انتقام کا ایک جذبہ تھا ظلم تھا جس نے ہر ذی عقل مسلمان کو کافر ٹھہرا دینا چاہا۔ ہر اوس مسلمان کو جو اپنے دل و دماغ کی امداد سے طبقہ علمار کا حریف بنکر اوسے دنیاوی شکست دے سکتا تھا کافر و گمراہ کا خطاب دے دیا گیا۔

تکفیر کے اس ہنگامہ نے ایک شورش برپا کردی نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہی ہوا ہر وہ ہستی جو دور جدید کی قائل تھی اور اوس کے ان رجحانات کو کفر و الحاد سے تعبیر کیا جا رہا تھا۔ محض علمار کی ضد میں گمراہ ہو گئی۔ اتفاقاً ہی نہیں صرف فطرت ہی کے تقاضے سے نہیں بلکہ بالارادہ۔ سرسید کا شمار دراصل اونہیں اشخاص میں کیا جا سکتا ہے جو حقیقتاً نظر کی وسعتیں قلب کی گہرائیاں اور دماغ کی رفعتیں رکھتے تھے لیکن فطرتاً اون کی وسعتوں اور رفعتوں میں گمراہیوں کے انداز مضمر تھے صرف اس کی ضرورت تھی کہ کوئی حریف اونہیں مشتعل کر دے۔ علمار کے شغل تکفر نے یہی کیا۔ سرسید کی فطرت دور قدیم سے بغاوت کرنا چاہتی تھی لیکن اگر کوئی صحیح رہبر اون کی رہبری کے لئے پیدا ہو جاتا تو اون کی استعداد سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا سیاسی اور اخلاقی ہر حیثیت سے۔ لیکن اس کے برعکس مذہبی گروہ نے اپنی غلط اندیشیوں سے اون کو اوس منزل کی طرف متوجہ کر دیا جس کی طرف خود اون کے رجحانات اون کو لئے جا رہے تھے۔

علمار ایک حد پر تھے اور سرسید دوسری حد پر۔ سرسید پر سب سے بڑا الزام یہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ اونہوں نے علمار کی ضد میں مذہب کو غلط سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ مذہبی حیثیت سے وہ واقعتاً گمراہ تھے لیکن اون کی گمراہیوں کی سزا خود اونہیں نہیں بلکہ اون غلط اندیشوں کو دی جائے گی جنہوں نے

محض جوشِ مخالفت اور جذبۂ انتقام میں سرسید اور اون کے گروہ کو مرتد قرار دیکر
ہمیشہ کے لئے مذہب سے بیگانہ کر دیا۔ سرسید نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ اونہوں
نے مذہب کو صحیح نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا اور مقصد آ۔ اون کا مقصد صرف یہ تھا
کہ علماء کے نقطۂ نظر کو غلط ثابت کردیں اسی مقصد کے تحت میں اونھوں نے مذہب
کے ہر کلیہ کو غلط فہمیوں کے نذر کردیا وہ صرف یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مذہب
وہ نہیں ہے۔ جیسے اون کو کافر ٹھہرانے والے علماء سمجھے ہیں او نہوں نے اس کی
ضرورت نہ سمجھی کہ حقیقی مذہب کی توضیح کریں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر مذہب کے
حکمرانان قدیم دور جدید کے اس علم بردار کی مخالفت نہ کرتے مذہب بحث ہی میں
نہ آتا۔ سرسید اپنی محدود سیاست اور محدود تعلیم میں مصروف رہتے اگر کبھی
وہ مذہبی دائرہ کی طرف آتے بھی تو اس شان سے نہیں گویا علماء کا کوئی حریف
مذہب و اخلاق کو پامال کرنے جارہا ہے۔

اس ردعمل کا نتیجہ مذہب ہی پر نہیں بلکہ نظام معاشرت اور نظام سیاست
پر بھی مترتب ہوا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایک حد تک مذہب غیر متاثر رہا لیکن
اخلاق۔ معاشرت اور سیاست سب پامال ہوگئے۔

جب ہندوستان کا موجودہ تمدن تعلیم جدید پر قائم کیا جارہا تھا۔ مسلمانوں
کے لئے یہ لازمی تھا کہ اوس حربہ سے مسلح ہولیں جو دور جدید تنازع للبقا
میں ضروری ہے۔ اگر علماء چاہتے تھے کہ دور جدید کی تعلیم مسلمانوں کو گمراہ نہ کرسکے اونہیں
سرسید سے ملکر کوشش کرنی چاہئے تھی لیکن اون کا یہ تقاضا کہ مسلمان تعلیم جدید سے بے
بہرہ رہیں اور اوسکے ساتھ ہی روایات قدیم سے بہرہ ور نہ ہوسکیں انتہائی فریب کاریوں پر منحصر تھا۔ سرسید
نے عاقبت اندیشی کو دخل دیا اور علماء کے ہنگاموں سے مرعوب نہیں ہوئے
تعلیم جدید مذہب و اخلاق سے اگر بیگانہ ہوگئی اور تعلیم یافتہ گروہ اگر گمراہ

ہوگیا۔ اِس کی ذمہ داری تنہا سرسید پر نہیں بلکہ علماء پر بھی ہے۔ سرسید نے علماء کی مخالفت میں مذہب و اخلاق کو دورِ جدید کی ضروریات پر قربان کردیا اور علماء نے سرسید اور ان کے طبقہ کی مخالفت میں تعلیم جدید سے بیگانگی اختیار کرلی۔ اس کشمکش میں نہ علماء تباہ ہوئے اور نہ سرسید، جو کچھ تباہی آنی تھی وہ اسلامی تمدن پر آئی۔

دورِ جدید کا تعلیم یافتہ گروہ اپنی بدتوجیہوں پر فخر کرنے لگا اوس کے لئے سرمایۂ ناز یہ واقعہ تھا کہ عمال سرکاری اوس کی قدر کرتے ہیں وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ملک و ملت اوس سے کیا چاہتے ہیں وہ نہ مذہب کا قائل تھا اور نہ ملت کا۔ اوس کی نگاہوں میں اگر کوئی وقعت تھی تو علوم مغرب کی۔ اگر کوئی عزت تھی تو یورپ کے نظام اخلاق کی، وہ نہ مذہب کو قابل توجہ سمجھتا تھا اور نہ مشرقی اخلاق کو۔ وہ روایات قدیمہ سے بے خبر تھا۔ مصنفین مغرب کی ترتیب دی ہوئی تواریخ اوسے جو چاہتی نہیں سمجھا دیتی نہیں جس واقعہ کو چاہتی تھیں اوس کے دل و دماغ میں چھپا دیتی تھیں وہ مشرقیت کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتا تھا قرآن اوس کے نزدیک ایک معمہ لاینحل تھا اور حدیث ایک کلام ناقابل عمل، اوسے اپنے مذہب پر شرم آتی تھی اپنے نظام اخلاق سے وہ متنفر تہا۔ وہ سمجھتا تہا کہ دنیا کی ابتداء مغرب سے ہوئی اور اوس کی انتہا بھی مغرب ہی پر ختم ہوگی مغرب ہی کو وہ علوم و فنون کا مخزن اور حقائق و لطائف کا مرکز تصور کرتا تھا۔ اوس کا مطمح نظر خالد نہیں ولنگٹن، غزالی نہیں مل اور ہکسلے، ابن خلدون نہیں اسمتھ اور مارسڈن تھے۔ کاش وہ مغرب ہی کے حقیقی علوم سے باخبر ہوتا۔ اوس کی نظر محدود تھی انگلستان اور اوس کے سطحی اور تنک مایہ مصنفین تک بالخصوص اُن غریب کا عجلا تہنک جنکی لایعنی اور گمراہ کن تصانیف ادب و تاریخ کے نام سے درس میں داخل کردی گئی ہیں۔

ایک طرف یہ عالم دوسری طرف سیاست مذہب ہی سے نہیں اخلاق و معاشرت کے مسلمہ اصول سے بھی محروم کردی گئی۔ تعلیم جدید کا مرکز سیاست کا قائل ہی نہ تھا اگر اوس کے اصول میں سیاسی جد وجہد جائز تھی تو صرف اس حد تک کہ حکومت کے ارباب حل وعقد کو کس طرح راضی رکھا جائے اور روزمرہ کی زندگی میں اپنے حریف کو ارکان حکومت کی نگاہوں میں کس طرح رسوا کیا جائے۔ ترکی کی لڑائیاں سرسید کے وقت میں بھی ہوئیں اور اون کے بعد بھی۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سرسید اور اون کے گروہ نے اخوت اسلامی کا کبھی کوئی درس دیا ہے نہیں کیا انگلستان کے مقابلہ میں وہ ترکی کی ہمدردی کی ہمت رکھتے تھے؟۔ میں سرسید کو الزام نہیں دیتا صرف واقعات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اور حالات کی طرف ترکی کے خلاف اگر حکومت ہند نے سرسید اور اون کے ہمنوا مسلمانوں سے امداد طلب کی ہوتی تو نہ سرسید کو جھجک ہوتی اور نہ اون کے مرکز تعلیم کے مغرب پسند طلبا کو۔ ممکن ہے اس طرح کے واقعات پیش بھی آئیں ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا۔

ترکی کا سوال تو بعد کو آتا ہے ہندوستان کی سیاست خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سرسید کی تلقین یہ تھی کہ جادہ تسلیم و رضا سے ہٹ کر چلنا مذہب حکام پرستی میں کفر و ارتداد کے معنی رکھتا ہے مذہب اخلاق۔ ضمیر غرضکہ ہر خلش کو مٹا دینا چاہیے جب کبھی شکر و وفا کا مطالبہ حکمراں قوم کی طرف سے کیا جائے۔ آج وہ لوگ جو ہر موقع پر سرسید کا نام لیکر تعلیم وفا دیتے رہتے ہیں کس روش پر ہیں؟۔ یہ وہی شخصیتیں ہیں جنہوں نے موجودہ تحریک میں حق پسند انسانوں کو بھی مطعون کرنا چاہا اور اون کے خدا اور رسول کو بھی مجھے اون نادانوں پر افسوس آتا ہے جو بیسویں صدی کے ہنگاموں میں سرسید

کو اپنی بد توجہیوں کا پردہ بنانا چاہتے ہیں سرسید کسی کی بدکرداریوں کا عذر نہیں بن سکتے وہ ایک مستقل سیرت رکھتے تھے اور سیرت کی سعتیں۔ اون کے پاس قومی درد بھی تھا اور اس درد سے کام لینے والا دماغ بھی اگر مذہبی اور سیاسی حیثیت سے اونہوں نے لغزشیں کیں اوس کا بھی ایک عذر ہے اون کا زمانہ دوسرا تھا نہ آج کے سے احساسات تھے اور نہ آج کی سی سیاست اوس وقت یہ جذبات ہی موج زن نہ تھے جو آج ہر سینہ میں تلاطم برپا کر رہے ہیں۔ لیکن آج جو حق ناشناس ہستیاں سرسید کے نام کا ورد کرتی رہتی ہیں اون کے پاس کیا ہے؟ کیا وہ دل اور وہ دماغ! اون کے لئے کیا عذر پیدا کیا جا سکتا ہے؟ کیا سرسید کے دور کے حالات اور اوس کی مجبوریاں؟ ۔یہ کچھ نہیں صرف بدبختیاں اور گمراہیاں ہیں اون کا نام "سرسید کی پالیسی" رکھ لیا گیا۔

بدنام کنندۂ نکو نامے چند"۔ سرسید کی روح مضطرب ہے مگر کوئی متوجہ نہیں ہوتا

عین اوسی وقت جب سرسید اور اون کے رفقا اپنی امت کے لئے نظام تعلیم اور نظام اخلاق مرتب کر رہے تھے اونہیں کے ساتھ علی گڈھ کے اسی کمخانۂ علوم میں ایک ہستی فرائض معلمی انجام دے رہی تھی جس کا ہر نفس علم وحکمت کا ایک شاندار مستقبل پوشیدہ رکھتا تھا۔ خود اوس کو بہ خبر نہ تھی کہ اوس کی آیندہ زندگی مسلمانوں کے لئے سرچشمہ حیات ہوگی جس سے دور قدیم کے تشنگان علم اور دور جدید کے شیدایان حکمت دونوں سیراب ہوں گے۔ وہ اسلام کا ماضی بھی رکھتی تھی اور حال بھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مسلمانوں نے کونسی دولت کہو دی ہے اور یہ بھی کہ اونھیں کونسی نئی دولت حاصل کرنی چاہئے۔ مولانا شبلی مرحوم جب علیگڈھ میں تھے اون کی زندگی کا ہر لمحہ ماضی اور حال کی کشمکش سے عبرتیں حاصل کر رہا تھا۔ بالآخر وہ دور جدید کے خطرناک عناصر کے خلاف صف آرا ہوئے اور اس شان سے کہ "تعلیم یافتہ گروہ"، یہی اسلام کے تمدن اور مشرق کی عظمتوں کا قائل ہوگیا۔

مولانا وہ پہلے شخص تھے جن کی اہمیت اوس طبقہ نے بھی تسلیم کر لی جو سرسید کی مطابعت میں گروہ علماء میں سے ہمیشہ کے لئے بدظن اور ایک حد تک متنفر ہو گیا تھا۔ اس اعتبار سے مولانا کا اثر دور جدید کے نظام علم و اخلاق پر ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ مولانا کے مختلف مشاغل کا یہاں ذکر نہیں اس سلسلہ میں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ سرسید کی ابتدائی زندگی سے لیکر مولانا کے علمی نشو و نما تک جو تعصب اور صحیح تعصب علماء کے خلاف دور جدید کے بے پروا مسلمانوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اوس کو مولانا کی شخصیت نے ایک حد تک کمزور کر دیا اور اس کی گنجایش پیدا ہو گئی کہ صحیح علماء تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اپنی جامعیت سے متاثر کر سکیں۔ علم و حکمت میں جب دیرینہ نظام تعلیم کی حیثیت تسلیم کر لی گئی تو اس کا بھی امکان پیدا ہو گیا کہ مذہب و سیاست میں بھی علماء کی حیثیت متعین ہو جائے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ دفعتاً تمام مراحل ایک تنہا ہستی طے نہیں کر سکتی تھی جب طبقۂ علماء کی بد توجہیوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنے اقتدار کو برباد کر دیا تھا۔ گو مولانا شبلی مرحوم کئی حیثیتوں سے صحیح اسلام کو پیش کر رہے تھے۔ علم کو اجتہاد و تحقیق سے۔ عمل کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے تذکروں سے۔ اخلاق و سیاست کو مسلمانوں کی تواریخ و روایات سے لیکن یہ تمام کوششیں انجام کار کے لئے کافی نہیں تھیں۔ مولانا کی شخصیت نے دور جدید کے "روشن خیال طبقہ" میں صلاحیت و استعداد پیدا کر دی اب اس کی ضرورت تھی کہ حالات اور واقعات کا تسلسل قلب سلیم پیدا کر دے اور دماغ صحیح۔ مسلمانوں کی خوش نصیبی نے یہ سامان بھی فراہم کر دیا۔

سرسید اور اون کے معاونین کی افراط و تفریط سے طلباے علم جدید کے طرز معاشرت اور اصول اخلاق میں جو بے راہ روی پیدا ہو گئی تھی اوس کی اصلاح اوس مخلص او رغیرت مند مسلمان کی تعلیم و تلقین نے کر دی جس نے طلبا کے سامنے

اپنے قول و عمل سے اسلامی تمدن کا بہترین نمونہ پیش کر دیا تھا۔ آج اگر کوئی دورِ جدید کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تاریخ لکھنے بیٹھے وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ نواب وقار الملک مرحوم نے اپنی چند سالہ نظامت میں علیگڈھ کے طلبار کو کیا کیا سبق دیے اور اپنے طرزِ زندگی سے ان کو کیا کیا ہدایتیں کیں۔ علیگڈھ کالج جو دراصل موجودہ تمدن کا مرکز تھا۔ اور جس سے نکل کر "روشن دماغ" مسلمان تمدن جدید کی تبلیغ کیا کرتے تھے نواب وقار الملک کی عظمتوں سے غیرت قومی کا مخزن بن گیا۔ یہ نہیں کہ سرسید اور محسن الملک کی گود میں پلے ہوئے طلبار خود دار اور غیرت مند مسلمان بن گئے ہوں۔ گمراہ ہستیاں دفعتاً راہ راست پر نہیں آ سکتیں۔ البتہ یہ ہوا کہ سرسید کی تلقین وفا نواب وقار الملک کی تعلیم خود داری سے بدل گئی۔ تعلیم یافتہ طبقہ ضمیر و اخلاق سے بھی مانوس ہونے لگا اور مذہب و سیاست سے بھی۔ یہاں تک کہ جنگ بلقان نے لوگوں کے احساسات قومی اور جذبات ملی کو اس حد تک بیدار کر دیا جس کی امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ دنیا متعجب تھی کہ "پیرو فا" کی خانقاہ سے "مجاہدین اسلام" کا لشکر کس طرح نکلا۔ حکومت متحیر ہو گئی کہ "بروٹس نے بھی بالآخر حملہ کر دیا"۔ ارباب حل و عقد دھمکیاں دینے لگے سرسید اور محسن الملک کے تربیت دادہ "پیران نابالغ" نصیحتیں کرنے لگے کہ اخوت اسلامی کے بت پر اپنا امن و سکون اور حکومت کی شفقتوں کو کیوں قربان کر رہے ہو غرضکہ ہر طرح کی کشمکش پیدا ہو گئی لیکن احساسات جو بیدار ہو چکے تھے بیدار ہی رہے۔ مسلمانوں کی سیاست کا یہ پہلا باب تھا جو اس تمہید کے ساتھ شروع ہوا تھا نہ اس ہنگامہ کو نصیحتیں روک سکتی تھیں اور نہ دھمکیاں

ایک طرف تمدن جدید نے اس طرح کروٹ لی دوسری طرف ایک انسان کی وہ ہمہ گیر توفیق روبکار تھیں جن کی ہر جنبش کنگرۂ فرعونیت کو متزلزل اور وقار

نمود ینت کو پا مال کرسکتی ہی۔ مولانا ابو الکلام آزاد کا دماغ اون معجزات میں سے ہے جو کارکنان قضا و قدر کی حیرت انگیز کرشمہ طرازیون کو نمایاں کرتے رہتے ہیں "الہلال" نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانون کو اس طرح بیدار کردیا جس طرح نفخ صور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوے انسان زندہ ہو جائیں گے۔ مذہب وسیاست کا یہ حیرت خیز اتحاد ہندوستان میں آج تک کسی مسلمان کا دل و دماغ پیدا نہ کر سکا تھا اسی معجز نما شخصیت نے علمار کے گروہ کو اسلامی سیاست کے رموز بتلائے اور دور جدید کے مبلغین کو مذہب و اخلاق کی حقیقتیں۔ اس سے پہلے مختلف مصنفین نے مختلف مواقع پر ہندوستان کے مسلمانوں کو فرایض کی تلقین کرنی چاہی تھی لیکن نہ اون کے پاس یہ دماغ تھا اور نہ یہ دل نہ یہ الفاظ تھے اور نہ یہ قلم۔ جامعیت ہندوستان میں کبھی اس سطوت و جبروت سے نمایاں نہیں ہوئی تھی مولانا آزاد نے مذہب کی بھی تبلیغ کی اور سیاست کی بھی۔ "روشن خیال طبقہ" کو یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں غسل وطہارت کے علاوہ کائنات کے حقایق بھی پوشیدہ ہیں۔ انتک جس انداز سے علمار قرآن پاک کو پیش کیا کرتے تھے وہ کسی طور پر خوش آیند نہ تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ سمجھتا تھا کہ قرآن ختم ہے تنبیہہ و تھدید اور تکفیر و تعزیر پر۔ خود غرض اور تنک مایہ علمار نے اونھیں اسی طرح سمجھایا تھا۔ لیکن جب مولانا آزاد قرآن لیکر اوٹھے مسلمان مبہوت ہوگئے کہ تیرہ سو برس کے صحیفہ میں حال ہی کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے نکات وحقایق پوشیدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کی شخصیت اون بلند نظر شخصوں میں سے ہے۔ جن کی عظمتوں کا محاصرہ نہیں کیا جاسکتا دور جدید میں مذہب کو اگر کسی نے سیاست سے صحیح طور پر ملادیا ہے اور علمار کے کھوئے ہوے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرلیا ہی تو وہ تنہا مولانا ابوالکلام ہیں

اس سلسلہ میں ایک برگزیدہ شخصیت اور بھی ہے جو بظاہر گو دنیا سے اٹھ گئی لیکن حیات جاوید نے اوسے ہمیشہ کے لئے نمایاں کردیا ہے قرون اولیٰ کا اسلام اگر کسی نے عملاً دنیا کے سامنے اس صدی میں پیش کیا وہ مولانا محمود الحسن رح کی محترم ہستی تھی آج جب کعبہ سے کفر کا دریا امنڈتا چلا آرہا ہے دیار ہند کے ایک مسلمان نے خیر القرون کی یاد تازہ کردی۔ مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے مولانا مرحوم نے علمار کو نئے سرسے ہندوستان میں زندہ کردیا اور یہ اونھیں کا فیض اور انہیں کی برکات تھیں کہ موجودہ کشمکش میں علمار اور جہلار نے متحد ہوکر کذب و باطل کے مقابلہ میں حق و صداقت کا علم بلند کیا۔ گروہ علمار جو ایک زمانہ سے دور جدید کے مسلمانوں سے بیگانہ تھا اون سے آکر مل گیا اور وہ خدا ناشناس مغربیت جو مذہب کو ناقابل برداشت اور شعار اسلامی کو ناقابل عمل سمجھتے تھے خدا سے بھی مانوس ہوگئے اور اُس کے قوانین سے بھی۔ رہا یہ مسئلہ کہ عام طور پر گروہ علمار کی للہیت اور اون کا ایثار کس رنگ پر ہے اور آیندہ اوس کے کیا نتایج ہوں گے. علم و حکمت کا مذہب و اخلاق سے یہ مخلصانہ اتحاد کس منزل تک قایم رہےگا. یہ ایسے مباحث ہیں جن پر موجودہ حالات میں کوئی تبصرہ کرنا نہ ضروری ہے نہ قرین مصلحت۔

لیکن سب سے زیادہ عبرت انگیز اور حیرت خیز یہ واقعہ ہے کہ مذہب و سیاست کی حمایت کے لئے جو سب سے زیادہ جانباز ہستیاں ہتیلیوں پر سر لئے ہوے لیکن وہ علیگڈھ کے اوسی تبکدہ سے جس میں ہمیشہ وقار حکومت کی پرستش ہوتی رہی کل تک وہ ہی ہستیاں تمدن جدید کی دلدادہ تھیں لیکن آج کوئی نہیں جو سرفروشوں میں اون کا مقابلہ کرسکے خدا بھی اون پر نازاں ہے اور انسان بھی کل وہ تھیں کہ دور جدید کی حق فراموشیوں نے اونہیں جو تربیت دی تھی اور آج

وہ ہیں اون کی فطرت سلیم کا جو تقاضا تھا۔ خلیل کی پیمبری پر آذر یہ فخر نہیں کرسکتا
کہ خلیل نے اوسی کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس سے قبل کہ تمدن جدید کی
آگ اون پر گلستان بن گئی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی اسی آذر کدہ
کے سیمیں اور طلائی بت تھے جن پر علیگڈھ کے بت گروں کو بھی ناز تھا اور
دور جدید کے بت پرستوں کو بھی لیکن آج جب وہ توحید کا غلغلہ بلند کر رہے
ہیں خاندان آذری ماتم کر رہا ہے کہ اوس کے صدیوں کے تراشے ہوئے
بت توڑے جارہے ہیں اور روایات بت پرستی ہمیشہ کے لئے پامال کی
جارہی ہیں۔ درحقیقت دنیا کی تاریخ میں حال اور مستقبل کے لئے ہزاروں عبرتیں
اور ہزاروں ہدایتیں ہیں۔

سجاد انصاری

پیغمبر اسلام

ذیل کا مضمون صلاح خدا بخش صاحب کے
ایک آرٹیکل کا ترجمہ ہے جو کلکتہ ریویو کے اکتوبر
سنہ ۱۹۲۳ء نمبر میں شایع ہوا تھا۔

"مدیر"

ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و حرمت کا حق اُن کہنہ روایات سے ادا نہیں کر سکتے جو طرح طرح کے قصے کہانیوں اور بے بنیاد واقعات سے پُر ہیں بلکہ حقیقی عظمت جدید فن "تنقید اور ترقی یافتہ طرز تحریر کے ذریعہ کر سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان واقعات کی ٹھوس بنیاد پر بحث کریں جن کی تصدیق کے لئے ہمارے پاس بہ کثرت ایسی ثقہ شہادتیں موجود ہیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ آنحضرت صلعم کی ذات مبارک خود اعلیٰ ذہانت، عظیم الشان کامیابی اور ایک دائمی دلچسپی کی ایک مثال بے مثل ہے، پھر ہم قصہ کہانیوں یا غیر صحیح بیانات پر کیوں جائیں۔

آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ پر قلم اٹھانے کے لئے ناقدانہ طرز تحریر کا اختیار کرنا میری خیال میں زمانۂ حال کی اس روح جدید کا اظہار کرنا ہے۔ اس سے آیندہ کے لئے تاریخی تنقید و عام تحقیق و تفتیش میں مزید اصلاح و ترقی کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ امر بھی باعث مسرت ہے اس سے وہ غیر معقول تعصب جو عدم واقفیت کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا، عنقریب دور ہو جائے گا اور اس سے بھی مزید تر

یہ کہ اس سے اس اعتراض کی تردید ہوتی ہے جو غیر مسلم مصنفین کی طرف سے اکثر عاید کئے جاتے ہیں یعنی کہ اسلام جامد اور دشمن ترقی ہے، لیکن اسلام کی تاریخ شروع سے لیکر اخیر تک اس الزام کی تغلیط کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کبھی بھی ایسا نہیں رہا جیسا بیان کیا جاتا ہے۔ اور نہ شریعت اسلام میں کوئی اصول بھی ایسا ہے جو آگے چلکر مانع ترقی ہو۔

برعکس اس کے مسلمانوں اور ان کی سلطنتوں کے زوال کا باعث جیساکہ میرا خیال ہے عدل و مساوات، محبت و الفت، حق و صداقت کے اصولوں کو ترک کردینا ہے۔ جنہیں اسلام ساتھ لیکر آیا اور جن کی شارع اسلام نے سفر و حضر جلوت وخلوت ہر موقع پر تعلیم و تلقین کی۔ ہم اس واقع سے انکار نہیں کرسکتے اور نہ اس کے اعتراف کرنے سے وہ عظمت کو جو آنحضرت کی ذات کے متعلق ہمارے قلوب میں ہے ایک ذرہ بھی کم ہوسکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں جب آنحضرت صلعم مبعوث ہوئے ایک روحانی روشنی عرب میں نمودار ہورہی تھی اور بعض اشخاص بھی تھے۔ (ایک خود آپ ہی کے خاندان کے تھے) جو ملک کے موجودہ مذہب سے غیر مطمئن ہوکر ہر چہار طرف کسی ایسی شئے کی تلاش میں تھے جو سحر وجادو کے علاوہ زیادہ عقل سے لگتی ہوئی ہو اور روحانی ضروریات کے مطابق ہو لیکن سوال یہ ہے کہ اس تحریک کی کیا نوعیت تھی؟ اور اس کا دائرہ عمل کہاں تک تھا؟ قلت معلومات کی بنا پر ہم اس کے حدود کی تعین نہیں کرسکتے اور نہ اس کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ لہذا ہم اس سوال کا جواب کہ آنحضرت کہاں تک اس تحریک سے متاثر ہوئے؟ یا یہودیت و نصرانیت نے آپ پر کس قدر اثر ڈالا؟ فی الحال نظرانداز کردیتے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ آپ نے کچھ اثر ضرور لیا اور قرآن پاک میں اس کے صاف

اشارات موجود ہیں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضرت کے زمانۂ ولادت و طفولیت اور سن شعور کو پہنچنے تک عرب کے مروجہ دین کے خلاف خیالات برابر نشو و نما پا رہے تھے ظہور اسلام سے قبل کی شاعری میں برابر ان رہبانوں کی روشنی کا ذکر آتا ہے جو صحرا میں مسافروں کی رہنمائی کیا کرتے تھے اور قرآن کریم میں بھی جگہ جگہ پر یہودیت اور انجیل کے قصے آتے ہیں۔

لیکن وہ کونسی ذات تھی جس نے ایک بادیہ نشین، جنگجو، پُر نفاق قوم کو ایک قلیل عرصہ کے اندر ایک مضبوط، متحد اور ناقابل تسخیر قوم بنا دیا جسے مذہب کے ایک ایسے ولولہ و جذبہ سے پُر کر دیا جس کا تاریخ میں اس سے قبل کبھی پتہ نہیں اور جس نے ان کے سامنے ایک باقاعدہ مذہب اور ایک معقول، قابل عمل مجموعۂ اخلاق پیش کر دیا۔ یہ کونسی ذات تھی؟ وہ حضرت محمدؐ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات بابرکات تھی۔ ممکن ہے کہ آپ نے اپنے چند روشن دماغ اہل ملک سے کچھ روشنی حاصل کی ہو یہ بھی ممکن ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی کچھ اثر آپ پر پڑا ہو[۱] لیکن شرک کی بیخکنی اور اسلام کی ترویج آپ نے اور صرف آپ نے ہی کی۔

یہ صرف آپ کی ذات تھی جس نے اس دین جدید کو عالمگیر صورت میں پیش کیا۔ یہ صرف آپ ہی تھے جنہوں نے بت پرستی کی مذمت اس کے اصل معبد مکہ میں کی جو عربوں کی صنم پرستی کا مرکز تھا۔

پروفیسر دخوئے نے ایک عالمانہ مضمون میں نزول وحی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے پروفیسر موصوف کی رائے سے ہمیں خواہ اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ آپ کے دل میں اپنے نبی اللہ ہونے کا خیال بار بار پیدا ہوتا رہا۔ کئی مرتبہ آپ نے یہ خیال

---

[۱] "حضرت محمدؐ نے یہودیت سے کیا لیا" مصنفہ جیگر۔ "عرب میں عیسائیت کا ابتدائی زمانہ" مصنفہ رائٹ

بار بار پیدا ہوتا رہا۔ کئی مرتبہ آپ نے یہ خیال قایم کیا اور ترک کر دیا، یہاں تک کہ اسنے آخری صورت اختیار کی اور ہمیشہ کے لئے جاگزین خاطر ہوگیا۔ اس تمام عرصہ میں یہ عمل گو بتدریج لیکن نہایت ہی استقلال کے ساتھ ہوتا رہا۔ یہ نہ تھا کہ آنحضرت کو کبھی اپنے مقصد تبلیغ میں شک پیدا ہوتا البتہ مقصد کی مشکلات کا خیال ضرور آتا تھا اور بعض وقت ان مشکلات سے آپ جھجک اُٹھتے جس میں تبلیغ دین کی دشواریوں کے ساتھ خود آپ کی ذات بھی شامل تھی۔ اکثر آپ پریشان خاطر اور متشکک ہوتے کہ آیا میں اس طوفان مصائب کا جو تبلیغ اسلام کی وجہ سے اُٹھ رہا ہے، تنہا مقابلہ کر بھی سکونگا یا۔ نہیں؟

آپ اپنے اہل مُلک کو جانتے تھے نیز آپ اس سے بھی بخوبی واقف تھے کہ ان کا دین قدیم ایک ایسا رشتہ ہے جو ان کو ان کے آباؤ اجداد ان کی تاریخ و روایات سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اور وہ انہیں حب مال وحب قوت کی طرف بلاتا ہے اور ان کی دولت و ثروت سب کچھ اسی دین کی بدولت ہے۔

آنحضرت ان سب حالات سے بخوبی آگاہ تھے اور اسی وجہ سے یہ تامل بھی تھا لیکن نور حق آشکارا ہو چکا تھا، ضمیر اپنا فیصلہ دے چکا تھا اور عزم راسخ ہمیشہ کے لئے قایم ہو چکا تھا۔ آپ کی تمام تر زندگی اس عقیدہ کی ایک تفسیر ہے۔ ملک کی ساری قوت کے مقابلہ میں آپ اپنی عزم میں ثابت قدم اور اٹل رہے۔ کیا اس میں ضعف ارادہ و بے ثباتی عزم کا کوئی شخص ایک ہلکا سا نشان بھی بتا سکتا ہے؟

سب سے حال کا مورخ برنس کیٹینی نے اس الزام کی قطعی طور پر تردید کی ہے کہ آپ بھی دیوتاؤں کو مانتے تھے جو خالق و مخلوق کے درمیان وسیلہ ہیں مورخ مذکور نے اس تمام واقعہ کو جھوٹ ثابت کیا ہے۔

کوئی شئے آپ کو تبلیغ توحید کے فرایض اور اپنے گمراہ اہل ملک بلکہ ساری دنیا کی

ہوئی دنیا کو صراط مستقیم پر لانے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ وہ فرض تھا جسے آپ خدائے تعالیٰ کی طرف سے عائد سمجھتے تھے۔ صداقت مقصد میں یقین پختہ کے سوا کیا کوئی اور چیز بھی آپ کو ان مشکلات میں ثابت قدم رکھ سکتی تھی؟

مصنفین یورپ بھی واقعۂ ہجرت تک آپ میں کوئی عیب نہیں پاتے آپ کی ذات آپ کے معتقدات آپ کے طریقۂ تبلیغ اور آپ جس جذبہ کے ساتھ اپنے مقصد کے لئے لڑے ان میں سے ہر ایک کی مدح میں وہ سب کے سب رطب اللسان ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب آپ کے ہاتھ میں قوت آئی تو یہیں سے پانسہ پلٹا۔ کیا اس الزام میں ایک ذرہ بھی صداقت شامل ہے؟

جب آپ اسلام کے دینی و دنیوی پیشوا ہوگئے تو کیا آپ راہ حق سے بال برابر بھی ہٹے؟ کیا آپ نے اپنی طرز رہائش بدلی؟ کیا آپ نے جاہ و ثروت کی خواہش کی؟ کیا آپ نے درباریوں کی کوئی جماعت رکھی یا دنیا کی ظاہری شان و شوکت اختیار کرلی جن سے قدیم و جدید سلاطین خاص شوق رکھتے تھے؟ کیا آپ نے کوئی دولت جمع کی یا وفات کے بعد کوئی خزانہ چھوڑ گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی لحاظ سے بھی آپ میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ آپ عظیم الشان طاقت رکھتے تھے جس پر بڑے سے بڑے سلاطین کو رشک تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپ آخری دم تک سادگی، بے تکلفی، انکساری اور اعلیٰ ایثار و قربانی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

لیکن یورپ کے لئے یہ سمجھنا کہ زندگی و مذہب کے ساتھ مشرق کا ہمیشہ کیا رویہ رہا ہے، بہت ہی دشوار ہے۔ ایک مشرقی کے لئے اس کا ہر فعل مذہبی ہے اس کی تمام تر زندگی از مہد تا بہ لحد مذہبی اعمال کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس کے ہاں مذہب و سیاست میں کوئی حد فاصل نہیں۔ اس کے ہاں اس قسم کا کوئی حکم نہیں کہ جو کچھ قیصر کا ہے قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے خدا کو دو۔ بہم آنحضرت

ایک ہی وقت میں قیصر بھی تھے اور پاپائے اعظم بھی۔ آپ کے ذمہ مذہبی معاملات کی ادائیگی، صوم وصلوٰۃ کی انجام دہی، احکام شرعی کا نفاذ ہی نہ تھا بلکہ مسلمانوں کی مادی ضروریات کا پورا کرنا اوران کی سیاسی رہنمائی بھی پیش نظر تھی۔

اورکیا انبیائے اسرائیل تخت وتاج کے مالک نہیں ہوا کرتے تھے؟ مکہ میں آپ کے مشاغل کا دائرہ عمل تنگ تھا، مدینہ میں آکر رفتہ رفتہ منصب نبوت کے ساتھ ساتھ حکومت کے فرایض بھی داخل عمل ہو گئے۔ اسلام کسی خیالی مجموعہ اخلاق کا نام نہ تھا جس کو جامہ عمل پہنانے کے لئے آپ بھیجے گئے تھے بلکہ ایک ایسا مجموعہ تھا جو روزمرہ کی زندگی میں قابل عمل ہو اور اس قوم اور اس زمانہ کے اخلاقی معیار کے مطابق ہو۔ سیاست و مذہب دونوں میں بُعد المشرقین کا فرق ہے۔

اگر آنحضرتؐ سیاسی معاملات کو ایک تخیل کی طرح خیالی طور پر لیا ہوتا، تو آپ یکسر ناکام رہتے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے ساتھ آپ کا طرز عمل لواسے دقت کی روشنی میں دیکھو اور ہم میں سے کوئی بھی ہے جو اس پر انگلی اُٹھا سکتا ہے؟ موجودہ سیاست اس کے تدارک کے لئے کہیں زیادہ بیرحمانہ طریقہ اختیار کرتی۔ یہودیوں کو دوست بنانے کی آپ نے انتہائی کوشش کی۔ لیکن انھیں نہ بننا تھا اور نہ بنے۔ وہ غیر جانبدار بھی نہ رہتے تھے بلکہ کھلے میدان دشمنی پر کمربستہ تھے۔ وہ دشمنان اسلام سے خفیہ معاہدے کرتے اور انھیں مخفی طور پر امداد پہنچاتے۔ اس صورت میں کیا آپ کا فرض تھا کہ انھیں چھوڑ دیتے اور جس کام کو اس شفقت اور جانفشانی سے کر رہے تھے ان کے ہاتھوں یوں تباہ برباد ہوتے دیکھتے...... کوئی دوسرا تدبر اس طریقہ کے علاوہ جو آپ نے اختیار کیا اور کوئی دوسرا طریقہ عمل میں نہیں لا سکتا تھا۔

دوسری مثال فتح مکہ کے بعد آپ کے داخلہ شہر کی لو، جو صبر و تحمل کی

ایک نہایت ہی شاندار نظیر ہے۔ تمام عرب آپ کے قدموں کے نیچے تھا، مکہ مخالفت و عداوت کا گھر آپ کے رحم و کرم کا منتظر تھا۔ کیا آپ کے جذبۂ انتقام میں ذرا بھی حرکت ہوئی؟ آپ کے وہ اعدا جنھوں نے آپ کو بنا ہ تک دینا گوارہ نہیں کیا، آپ کو اپنا وطن مالوف ترک کرنے پر مجبور کیا آپ کے تذلیل و تحقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا آپ کو درد انگیز سخت سے سخت اذیتیں پہنچائیں۔

کیا آپ اگر چاہتے تو ان میں سے ایک ایک کا سر قلم نہ کر سکتے تھے؟ لیکن ان سب کے باوجود آپ کا ہر فعل ذاتی و شخصی جذبہ سے ہمیشہ پاک رہتا تھا شخصی عزت ذاتی وجاہت سے آپ ہمیشہ الگ رہے۔ رؤسائے قریش جب آپ کے پاس تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ "تم مجھ سے آج کیا توقع رکھتے ہو" اونھوں نے جواب دیا کہ "عفو" اس پر رحمت عالم نے فرمایا کہ "جاؤ" آج کے دن تم سب آزاد ہو"

آپ کی سادگی، آپ کا اخلاق، آپ کی کفایت شعاری، آپ کا صبر و تحمل آپ کا استقلال و ثبات عزم، آپ کا عجز و انکسار، ہر ذی روح پر آپ کے رحم، بچوں کے ساتھ شفقت آپ کا جذبہ عدل و انصاف۔ کیا تاریخ کوئی دوسری ایسی نظیر پیش کر سکتی ہے جس میں یہ تمام اوصاف و محاسن بہ تمام و کمال یکجا جمع ہوں؟

صدیوں کے اخفائے صداقت و ابطال حقیقت کے بعد آنحضرت کی شخصیت آج کے دن نہایت ہی اعلیٰ و ارفع نظر آ رہی ہے یہاں تک کہ غیر مسلم دنیا کو بھی خراج تحسین و عزت دے رہی ہے۔ آپ کی ذات ایک بڑے مضبوط اور اعلیٰ اخلاق کی مظہر ہے۔ آپ کی ذات کوئی نفس پرور، مطلق العنان بادشاہ کی سی نہیں کہ ذاتی ہی مفاد کا خیال رکھے بلکہ ایک کریم النفس حاکم ہیں جن سے

محبت و روشنی کے انوار چار دطرف پر تو فگن ہیں۔ آپ ابن الوقت نہیں بلکہ ایک رسول ہیں جن کے پیش نظر ایک متعین و مخصوص مقصد ہے اور جو اپنے ارادہ میں اٹل ہیں۔ یہ تمام اوصاف آج یورپ نے بھی تسلیم کرلئے ہیں اور کھلے دل سے تسلیم کیا ہے انگریزی زبان میں ہیجنس، ڈیون پورٹ، باسورتھ اسمتھ، اور کارلائل[1] جرمن زبان میں کرہل اور گریم کی تصنیفات موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی فاضلانہ تصنیفات ہیں جو تعصب سے خالی نہیں اور یہ کبھی دنیائے عیسایت کے دماغی نتائج تھے۔

ذیل میں ہم اعلیٰ الفاظ نقل کرتے ہیں جو ڈاکٹر گستاو ویل نے (جرمن) بانی اسلام کی شان میں لکھے ہیں۔

"حضرت محمد نے (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے سامنے ایک شاندار نمونہ پیش کیا۔ آپ کا دامن اخلاق پاک و صاف تھا۔ آپ کا مکان، آپ کا لباس وطعام ہر ایک میں بمثیل سادگی پائی جاتی تھی۔ آپ اس درجہ بے تکلف تھے کہ اپنے صحابہ سے کسی اظہار عزت کو قبول نہ کرتے اور نہ آپ اپنے غلام سے کوئی ایسی خدمت لیتے جسے آپ خود کرسکتے۔ اکثر آپ بازاروں میں سودا سلف لینے جاتے اپنے حجرہ میں کپڑے سیتے۔ یا کبھی بکریاں دوہتے نظر آتے۔ آپ ہر شخص سے اور ہر وقت ملتے تھے بیماروں کی عیادت کرتے۔ سب کے ساتھ مہربانی و ہمدردی سے پیش آتے۔ آپ کی فیاضی و دریا دلی کی کوئی انتہا نہ تھی اور ایسا ہی آپ کو اپنی

---

[1] یہاں پر ٹار اینڈرے (Tor andree) کی عالمانہ تصنیف "حضرت محمد کی شخصیت" مطبوعہ اسٹاکہام ۱۹۱۸ء قابل ذکر ہے۔

[2] "تاریخ اقوام اسلام" صفحہ ۲۷ مترجمہ خدابخش جو ڈاکٹر گستاو ویل کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

قوم کی فلاح و بہبود کا خیال تھا ۔۔ جو ہدایا و تحالیف آپ کے پاس آتے وہ سب کے سب آپ تقسیم کرڈالتے ۔ اور جو باقی بھی رہتا اوسے قوم کی ملک سمجھتے تھے ۔

آپ اگر انسانیت کے اس اعلیٰ ترین درجہ پر ہیں تو آپ کے کارنامے بھی غیر فانی ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ اسلام کی سیاسی طاقت دبگئی ہے لیکن اس کی روحانی قوت آج بھی ویسی ہی تازہ اور زبردست ہے جیسی آج سے تیرہ سو برس قبل تھی ہندوستان ، افریقہ، اور چین ہر جگہ اسلامی مبلغین کے سر کامیابی کا سہرا رہا ہے ۔ انھوں نے ایسے مقامات پر کامیابیاں حاصل کیں ہیں جہاں مسیحیت باوجو کثرت مال اور اعلیٰ تنظیم و ترتیب رکھنے کے بکسر ناکام رہی ہے ۔اس کی کامیابیاں صرف اونی طبقوں میں ہی محدود نہیں رہی ہیں بلکہ یورپ جیسے گہوارۂ علم و تہذیب میں اس نے اپنے جاں نثاران پیدا کرلئے ہیں ۔

آخر اس کامیابی کا راز کیا تھا؟ اس کی کامیابی مذہب کا پجاریوں اور پادریوں کی قیود سے آزادی، محیرالعقول رسوم اور عجیب و غریب عقاید مذہبی کے نہ ہونے میں مضمر ہے ۔ اسلام تمام آسمانی مذاہب میں سادہ ترین مذہب ہے جو تہذیب کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ مدارج میں یکساں طور پر کھپ سکتا ہے ۔ اس کی سادگی ایک بازاری شخص اور ایک عزلت گزیں فلسفی دونوں کے لئے یکساں کشش رکھتی ہے ۔ گوئٹے قرآن پڑھکر خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا، گبن نے اس میں وحدانیت کا جلوہ دیکھا ۔ ایمان بالتوحید رسالت محمدؐ (لا الہ الا اللہ و محمد الرسول اللہ) ہمارے تمام عقاید کا لب لباب ہے ۔ اس عقیدہ کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کی دانش و عنایت بھی شامل ہے ۔ یعنی صرف عقیدہ ہی کافی نہیں بلکہ تقویٰ و خلوص نیت ، انسانی ہمدردی و محبت بھی

شرط ہے۔ نجات قول و فعل، عقیدہ و عمل ہر دو کے باہمی لزوم پر مبنی ہے یہی وہ سبق ہے جسے ہم نے بھلا دیا، اور جس کے دہرانے کی آج پھر ضرورت ہے اگر ہم اس دین کے صحیح معنوں میں اہل بننا چاہتے ہیں۔

بہر صورت عقیدہ سے زیادہ عمل ضروری ہے۔ عبادت دراصل سبحہ و زنار میں نہیں ہے بلکہ حقیقی عبادت اپنے تمام قوائے جسمانی و دماغی کے نشو و نما کرنے اور فرائض کی انجام دہی میں اسی قدر ہے۔ جسقدر کہ خلوت کی یاد الٰہی میں مصروف رہنے میں ہے۔ مذہب کا یہی پہلو تھا جسے اسلام نے خصوصیت کے ساتھ چمکایا اور اسی کو ہمیں اپنے اندر پیدا کرنا ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ زندگی کی برکات سے متمتع ہوں اور تنازع للبقا میں جو بدقسمتی سے تمدن جدیدہ کی خصوصیت نمایاں بن گئی ہے کامیاب اتریں۔

پیئر لوٹی[1] لکھتا ہے کہ "ہم یورپینوں میں یہ عام طور ایک امر مسلم ہے کہ اسلام مانع اصلاح و ترقی ہے۔ یہ اقوام میں ایک جمود پیدا کر دیتا ہے اور ان کی شاہراہ ترقی میں یہ ایک روڑا ہے۔ یہ خیال نہ صرف ارشادات نبوی و تعلیمات اسلامی سے انکی عدم واقفیت کا ثبوت دیتا ہے بلکہ تاریخ سے ایک صریح چشم پوشی پر بھی دال ہے۔ اسلام ابتدائی زمانہ میں اقوام کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا اور ابتدائی خلفا کے عہد میں اس نے انسانی ترقی کے لئے جو سامان پیدا کئے، ان کا ذکر نہیں۔ دنیائے اسلام کا موجودہ انحطاط اس سے منسوب کرنا سخت حماقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک وقت معین ہوتا ہے ترقی و شان و شوکت کے زمانہ کے بعد غفلت و جمود اور انحطاط و تنزل کا

---

[1] "مصر" مصنفہ پیئر لوٹی صفحہ ۲۷۰

ور شروع ہوتا ہے۔ ایکدن کوئی خطرہ سر پر آن پہنچا ہے اور وہ اپنے خواب غفلت سے چونک پڑتی ہے۔ ممالک اسلامی کی یہ بےحسی کبھی مجھے بہت عزیز تھی۔ اگر مقصد یہ ہے کہ زندگی میں کم از کم مصائب اٹھائے جائیں، تمام سعی و کوشش حقیر سمجھی جائیں اور خوش آیند تو تعات لیکر جان دیجاوے تو اس لحاظ سے مشرقی اقوام سب سے زیادہ عقلمند ہیں۔ لیکن اب جبکہ حریص اقوام کا ہرطرف سے نرغہ ہے ان کا اس طرح خواب غفلت میں پڑے رہنا ممکن نہیں۔ اے کاش! وہ اب بھی بیدار ہوں!"

اور کیا ان کی بیداری کے آثار دن بدن ظاہر نہیں ہو رہے ہیں؟

آنحضرت دنیا میں کیا لائے؟ اور آپ کی غیرفانی خدمات نے انسانیت کے لئے کیا کچھ کیا؟

ایک ایسی قوم کو جو انتہائی شرک و بت پرستی میں مبتلا تھی، خالص توحید یعنی ایک خدائے خالق عالم پر ایمان لانا سکھایا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نعمت تمام بنی نوع انسان کے لئے تھی۔ یہ خیال کرنا سخت غلطی ہے اور جیسا کہ بعض مصنفین یورپ کا خیال تھا کہ اصل میں اسلام ملک عرب اور اس کی قوم کے لئے تھا۔ سورہ فاتحہ میں اللہ رب العلمین کا لفظ مذکور ہے اور یہ فرض کرنا خلاف عقل ہے کہ اس خدائے رب العلمین نے نور اسلام صرف بنی آدم کے ایک چھوٹے سے حصے کی ہدایت و اصلاح کے لئے بھیجا ہوگا۔ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس کا یہ مطلب ہو کہ اسلام کا روئے سخن صرف ایک عرب کے لئے ہے اور وہ تعاقب کچھ اور تبار رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک آج توحید ایک عام بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس وقت جب آنحضرت نے تمام عالم کو اس کی دعوت دی ایسا نہ تھا۔ عرب کے باطل مذاہب اور تحریف شدہ عیسائیت

میں دین اسلام ایک حدیدحق کی طرح نہایت آب و تاب کے ساتھ چمکا۔ تبلیغ توحید کی تبلیغ کرنا جیسی اسلام میں ہے اور ایک ایسی دنیا میں جس میں آنحضرت مبعوث ہوئے، کوئی معمولی ہمت و جوانمردی کا کام نہ تھا۔ جو بغیر امداد غیبی و ہدایت الٰہی کے ممکن ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے ایک مذہب آسمانی ہونے کا پختہ ثبوت دیا۔ لیکن اس نعمت عظمیٰ کے ساتھ اس نے ایک اور برکت بھی بخشی جو عقاید و اخلاق انسانی میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ آپ نے انسان میں یہ خیال پیدا کیا کہ بندہ کو اپنے خالق کے سامنے ایک دن اپنے تمام اعمال کا جوابدہ ہونا ہے۔ ظہور اسلام سے قبل عربوں میں حال' کا خیال تمام تر اہمیت رکھتا تھا۔ انھیں 'ماضی' و 'استقبال' کی مطلق فکر نہ تھی۔ قدیم مشرکین کی طرح وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے جو فکر فردا' اور دوسرے تردّدات سے پاک تھی۔ لیکن آنحضرت نے دنیا کی آنکھیں اس اس حقیقت سے کھولدیں کہ انسان بحیثیت اس کے کہ اسے عقل و تمیز عطا کی گئی ہے' ایک ذمہ دار ہستی ہے اور اسے اپنی نیکی و بدی کا ایک دن قادر مطلق کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ انسانی ترقی کی راہ میں کس قدر عظیم الشان واقعہ ہے! آج ہمارے لئے اس عقیدہ کی اہمیت کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اس کے بعد سے انسان پیکر اخلاق بنگیا بہ الفاظ دیگر انسانی تخلیق پھر سے عمل میں آئی اور اس بار انسان ایک ضمیر لے کر پیدا ہوا جس کی نگرانی و تصفیہ سے مفر نہیں۔

اس کے ساتھ ہم اخوت کے عقیدہ کو فراموش نہیں کر سکتے، جسے آپ نے پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کیا۔ کل مومنٍ اِخوۃ کی منادی کی۔ کوئی تفریق نہیں اور نہ کوئی امتیاز نسل و رنگ، اسلام نے جمہوریت عالم' کے اصول

کو بہترین طور پر سمجھا - میں اس واقعہ سے بھی بے خبر نہیں کہ یہ ایک خوش آیند اسکیم تھی جو عرصہ تک قایم نہ رہ سکتی تھی لیکن باوجود اس کے اس نے عجیب وغریب کامیابی حاصل کی یہ ایک اعلیٰ ترین نصب العین تھا جس کے حصول کے لئے سعی و کوشش کرنا اور جبتک بھی ضروری تھا۔ مسلم کے لئے تمام دنیا اس کا وطن ہے اور تمام بنی آدم اس کے اہل کنبہ۔

اس وسیع اور عالمگیر عقیدہ نے اس اعلیٰ جمہوریت میں اپنا جواب پایا جسے اسلام نے قائم کیا، اسلام کا دینی و دنیوی پیشوا جمہور اسلام کا نامزد کردہ ہوتا تھا جس کے فرایض و اختیارات بالکل صاف و صریح ہوتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ اور یزید ثالث کے قابل قدر اعلیٰ جمہوریت کی افتتاحیہ خطبے پڑھو۔ مشرق میں اس جمہوریت کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اور خود یورپ بھی مشکل ایسی اعلیٰ جمہوریت کی کوئی مثال پیش کرسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ جمہوریت بہت تھوڑے عرصہ تک قایم رہی لیکن جب تک بھی رہی اس کا وجود اسلام کی عظمت کے لئے ایک طرۂ امتیاز ہے۔ ایک فضائے نو پیدا ہوئی۔ جدید شاہراہ عمل وجود میں آئی اور روح تازہ کا ظہور ہوا۔ ماضی خاک میں ملگیا اور ایک جدید عرب پیدا ہوا ایک نئی قوم (عرب) وجود میں آئی تاکہ تاریخ عالم میں اپنی جگہ لے اور مشعل توحید ہاتھ میں لیکر گمراہ نوع انسانی کو راہ حق کی ہدایت کرے۔

اس نور و برکت، مسرت و خوشی، اطمنان و تسکین کے لئے جو آپ مصیبت زدہ، شکستہ خاطر انسان کے لئے لائے۔ اے نبی آپ پر ہزار بار درود۔

(باقی)

مترجمہ سعید انصاری متعلم جامعہ

لینن

۱۸۷۰-۱۹۲۴ء

انقلابات عالم کی تاریخ اگرچہ واقعات و حوادث سے پُر ہے لیکن صدیاں گزر جانے پر بھی انقلاب روس جیسا عظیم الشان واقعہ نظر نہیں آتا۔ انسانی دماغ کی آخری بلندی روحانیت و عرفان ہے۔ لیکن اس کی دنیاوی کوششوں کی آخری حد حکومت اور سلطنت، انہی دو متضاد و خاردار رستوں پر ہزارہا انسان کی قربانیاں ہوئیں، اور اس سے بھی زیادہ تعداد میں وہ بدنصیب انسان گزر گئے جن کو اس ابتدائی منزل تک بھی رسائی نصیب نہیں ہوئی۔

وہ جماعت جو دنیا میں انقلاب ہی کا خواب دیکھتی ہے انقلاب ہی کو تمام دنیاوی مشکلات کا علاج بتاتی ہے، جس کے نزدیک سیاسی پیچیدگیوں، دنیا کی مصیبت اور غریبوں کے درد دکھ کا واحد علاج انقلاب ہے، انارکسٹ یا نراجی کہلاتی ہے۔ ابتداءً ان کے مقاصد واضح نہ تھے، اُن کو حکومت اور طاقت کے فنا کر دینے کا ضرور خیال تھا۔ لیکن جماعت کی قوت کو مستحکم اور کارگر بنانے کا کوئی صحیح راستہ اُن کے خیال میں بھی نہ تھا۔ لیکن گذشتہ ربع صدی میں زمانہ نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اب آپ ہر سازشی انقلاب پسند سے اس کا معقول و مدلل نظام عمل حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ حکومت کے اجزا کیا ہیں مطلق العنان حکمرانوں اور خودسر و محدود جماعتوں میں یہ اجزائے حکومت کس طرح ظلم و تعدی

کا باعث ہو جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مطلق العنانی سے بھی زیادہ زبردست لعنت میں دنیا کو مبتلا کر دیتے ہیں اور یہ ہی اجزائے حکومت اگر ذمہ دارانہ اصول پر جماعت میں تقسیم کر دے جائیں تو مجموعی حیثیت سے حکومت کو اس رتبۂ بلند پر پہنچا دیتے ہیں جہاں حاکم و محکوم کا فرق اُٹھ جاتا ہے۔ اور حکومت ایک نظام معاشرت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جس کا نتیجہ عام فلاح اور سکون و راحت ہے۔

وادی ویگا کی ایک بستی سمبرسک میں ۱۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو لینن پیدا ہوا اس کا باپ استراخاں کا باشندہ تھا اور گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم کا ایک معزز افسر۔ اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر الگزنڈر کرنسکی کا بیٹا تھا۔ کرنسکی روسی سیاسیات کا اہم جزو تھا لینن کو اس کے اثر و اقتدار سے بالآخر جنگ کرنا پڑی اور اس کو اپنی انقلابی تحریک کی کامیابی کے لئے بالآخر کرنسکی کو شکست دینا پڑی۔ لینن اپنے زمانہ تعلیم میں ہی سیاسیات سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ قازان کی یونیورسٹی میں اس نے پوری مذہب کی تعلیم ختم نہ کی تھی کہ اس کا نام یونیورسٹی سے محض اس بنا پر خارج کر دیا گیا کہ وہ "سیاسیات میں نہایت غیر مناسب خیالات کا حامی ہے"۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کارل مارکس کے انقلابی اصول جدید روس کی غذا بنے ہوئے تھی۔ اور نوجوان اس انقلاب پسند مجدد اعظم کی تقلید کو اپنے لئے مایہ حیات سمجھتے تھے۔ لینن کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر اس کے بھائی کے سزائے موت کا ہوا جس کو حکومت روس نے سیاسی الزامات انقلاب پسندی کی بنا پر انتہائی سزا دی تھی اس وقت لینن کی عمر سترہ سال کی تھی اور اس واقعہ کے بعد ہی وہ قازان یونیورسٹی میں شریک ہوا جہاں سے نکالے

بالآخر اس نے پٹرسبرگ کے دارالعلوم سے "بیرونی" طالبعلم کی حیثیت سے ڈگری حاصل کی۔ اس مختصر عرصہ میں ہی لینن اپنے حلقہ میں مشہور و مقتدر ہو گیا تھا۔ انقلابی اصول حکومت اس کے لئے غذائے روح بن گئی تھی ایک مختصر جماعت اس کے ارادتمندوں کی پیدا ہو گئی تھی اور وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ سزائے موت یا جبر و تعدی انقلاب کو نہیں روک سکتے اور روس کا انقلاب صرف حکومت کا عزل و نصب نہ ہوگا بلکہ مزدور پیشہ جماعت اور سرمایہ دار طبقہ کی عظیم الشان جنگ قرار پائے گا۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب روس سے قبل ہی لینن نے ایک مختصر انقلابی جماعت قائم کر دی تھی اور اس کے مقاصد میں جس طرح حکومت وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا تھا اسی طرح دیگر انقلابی رہنماؤں کے اصول کی مخالفت بھی مدنظر تھی۔ حکومت نے فوراً ہی اس کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا اور ساتھ ہی دوسری انقلاب پسند جماعتوں نے بھی اس کی مخالفت میں کمی نہ کی۔ سائبیریا میں لینن کا زیادہ وقت سیر و شکار میں گزرتا تھا وہ نوجوانی کی بے پروائی کے ساتھ جنگلوں میں چلا جاتا تھا اور گھنٹوں شکار میں مصروف رہتا لیکن ساتھ ہی اس کے وقت کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی زبانوں کی تحصیل میں صرف ہوتا تھا جس میں بالآخر اس کو کامل مہارت ہو گئی۔ اسی زمانہ میں اس نے دو کتابیں بھی تصنیف کیں، لیکن علاوہ ان کاموں کے یہ زمانہ جلاوطنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ وقت تھا جب کہ روسی مستقبل عہد حاضر کی خاموشیوں میں اپنے انقلابی پر و بال حاصل کر رہا تھا۔ سائبیریا انقلاب پسندوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور خوش قسمتی یا بدقسمتی

سے ان انقلاب پسندوں میں بھی انتہا درجہ کا اختلاف خیال تھا۔ لینن کی جماعت اور پلیکہنو کے رفقا بالکل متضاد اصول پر کام کرنا چاہتے تھے۔ صبح و شام بحث و مباحثہ، تبادلہ خیالات، اظہار رائے، تجاویز و ترمیمات نے اس خیالی دنیا کو علمی سیاست کا سبق دینے دیا اور بالآخر یہ ہی وہمی تخیلات آگے چلکر حکومت روس بن گئے۔ یہ ہی وہ زمانہ تھا کہ لینن کے اخبار اسکرا (شعلہ) نے تمام روس میں ایک آگ لگادی تھی اور بالشویکی خیالات کی ابتدا کی تھی۔

سنہ ۱۹۰۵ء کے انقلاب روس نے لینن کا زمانہ جلاوطنی ختم کردیا وہ سنٹ پیٹرسبرگ واپس آگیا۔ لیکن اس کے نزدیک یہ انقلاب کامل آزادی اور امن کے لئے کافی نہ تھا۔ اس نے اپنے خیالات کی مختلف اشتراکی جماعتوں میں اشاعت کی اور بالآخر یورپ کا سفر اختیار کیا جہاں پیرس میں بیٹھ کر وہ مختلف اخبارات کے ذریعہ سے اظہار خیالات کرتا رہا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ یورپ شروع ہوئی تو لینن نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن مخالفت محض جنگ کی نہ تھی بلکہ اس کے نزدیک ایک دوسری جنگ کی ضرورت تھی جو ان اسباب کو فنا کرسکے جو اس جنگ عظیم کی محرک ہوئے تھے۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں روس کا عظیم الشان انقلاب ہوا۔ لینن اس وقت تک یورپ میں تھا۔ لیکن اس انقلاب کی اطلاع ملتے ہی وہ مضطربانہ روس پہنچنے کی فکریں کرنے لگا۔ بالآخر ایک سربمہر مال گاڑی میں چھپ کر وہ روس کو روانہ ہوا لیکن وہاں پہنچکر اسے محسوس ہوا کہ وہ ہنوز محفوظ و مطمئن نہیں ہے۔ برسر اقتدار طبقہ اور اس کے اپنے خیالات میں شدید اختلاف سے کچھ عرصہ تک وہ فنلنڈ میں روپوش رہا لیکن بالآخر اپنی جماعت کی رہنمائی

کے خیال سے اس کو پیٹروگراڈ واپس آنا پڑا - چونکہ یہاں ہر وقت گرفتاری کا خدشہ تھا اسی لئے مدتوں اس کو ایک جگہ قیام کا نصیب نہوا۔ مزدوروں کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں اس کا قیام تھا وہ بھی اس طرح کہ آج یہاں سے تو کل دوسری جگہ۔ لیکن نومبر ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس نے ایک دوسرا پلٹا کھایا۔ اب لینن کا اقتدار ناقابل انکار تھا اس کے ہمنوا لوں کی تعداد انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور اس نازک موقع پر تمام ملک میں اگر کسی شخص کے ذہن میں کوئی صحیح نظام عمل آیندہ حکومت روس کے لئے تھا تو وہ صرف لینن تھا جس طرح لینن کی بیس سال قبل کی پیشینگوئی انقلاب روس اور اس کی نوعیت کے متعلق حرف بحرف صحیح ہوئی اسی طرح آیندہ طرز حکومت اور عملی کام کے متعلق بھی اس کی رائے قطعی اور واضح تھی۔ لیکن یہ زمانہ انتہائی اضطراب و کشمکش کا تھا۔ مختلف اشتراکی انجمنیں اور متعدد با اثر گروہ اپنے اپنے اصول کے مطابق روز اعلانات کرتے تھے اور متعدد تجاویز و اصول حکومت تجویز ہو رہے تھے لیکن لینن خوش تھا اور باوجود انتہائی اضطراب کے کمال سکون سے ایام شماری میں مصروف رہتا تھا اس لئے کہ اس کے نزدیک انقلاب روس کو اگر اس عرصہ میں تمام دنیا نے تسلیم کر لیا تو پھر روسی حکومت کی خواہ کچھ ہی شکل ہو لیکن انقلابات عالم کے لئے صریح اور درخشاں مثال ضرور قایم ہو جائے گی۔

اس مرتبہ بھی لینن کی پیشینگوئی صحیح نکلی اور چار مہینہ کے مختصر عرصہ میں لینن کو ممالک روس میں وہ حیثیت حاصل ہو گئی جو کبھی زار کو انتہائی مطلق العنانی نہ دیکھے اور نہ نپولین کو اس کے محیرالعقول کارناموں نے بخشی۔ اس کا وجود روس کے چپہ چپہ پر حاوی تھا حالانکہ اس کے مخالفت اس وقت بھی اس کے رفقا

میں موجود تھی لیکن روس کے علاوہ تمام عالم میں لینن کا وجود ایک معمۂ لاینحل ہو گیا تھا۔ دنیا نے لینن کا نام کبھی کبھی سنا لیکن اس کو پہچاننے کی نوبت کبھی بھی نہیں آئی پھر دفعتاً جب انقلاب روس نے لینن کو اس عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان حاکم بنا دیا تو دنیا اس کے متعلق عجیب دغریب روایات تصنیف کرنے لگے۔ ع چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند یورپ ایک زمانہ تک لینن کو جرمن جاسوس سمجھتا رہا اس کے بعد اس کی حیثیت ان صاحبان فہم کے نزدیک ایک قزاق کی ہوگئی جس کا گروہ قتل و غارت کے لئے یکجا ہوا ہے۔ لیکن لینن کے متعلق سب سے زیادہ عجیب خیال یہ تھا کہ وہ اعتدال پسند ہے۔ حالانکہ واقعہ اس کے بالکل خلاف تھا۔ اس کو اعتدال پسندی سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ نہایت پختہ خیال اور پختہ عزم ہونے کے ساتھ ہی موقع و محل کو اس طرح پہچان لیتا تھا کہ بظاہر اس نے کبھی غلطی نہیں کی۔ اور جب موقع ہاتھ آجاتا تھا تو کام کرنے میں اس سے زیادہ کوئی دلیر نہ تھا۔

انقلاب لنن کا سرمایہ حیات تھا۔ یہ بھی اس کا عقیدہ اور مذہب تھا اس کے نزدیک انقلابات مصنوعی چیز نہیں۔ کسی جماعت یا سیاسی تحریک کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی ملک میں انقلاب پیدا کردے بلکہ انقلاب ایک لازمی و ناگزیر اجتماعی عمل ہے جو سیاسی و معاشی حالات کے اقتضار سے خود بخود وجود میں آتا ہے۔ مزدوروں میں انقلاب کہنے سننے یا تبلیغ و اشاعت سے نہیں بلکہ شرح اجرت و اشیار کی قیمتوں کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اگر چار برس قبل انقلاب روس کامیاب نہ ہوتا تو لینن اس ناکامی کو افراد کی کمزوری نہ تصور کرتا بلکہ اس کا جواب یہی ہوتا کہ یہ بھی اک موج تھی، لیکن طوفان پہلی اور دوسری موج سے نہیں پیدا ہوتا ہے اس کے لئے آخری موج کی ضرورت تھی جو ابھی تک نہیں آئی ہے۔

لینن کے ذاتی عادات و اخلاق موجودہ زمانہ میں آپ اپنی نظیر تھیں۔ وہ مغرب
کی مادیت میں حکومت کرتا تھا لیکن بے نظیر تھا۔ اس کی زندگی سادگی اور انکسار کی آخری
حد تھی، وہ بچوں سے کھیلتا۔ گھر اور باہر کے چھوٹے چھوٹے کام کرتا تھا۔
جب انقلابی خیالات کی تبلیغ شروع کی تو وہ تنگ و تاریک کوٹھریوں میں
غربا کے ساتھ زندگی گزارتا تھا اور جب اقلیم روس پر اسکی حکومت ہوگئی تب بھی
اس کی طرز معاشرت خیالات حالات اور دلچسپیوں میں کوئی فرق نہ ہوا۔

اشتراکی

ہندوستان کا افلاس

گذشتہ سے پیوستہ

لیکن درآمد کے اعداد پر اعتماد کرکے یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں قیمتی دھاتوں کی بہت کھپت ہے لہذا یہ ملک دولتمند ہے۔ بخلاف اس حقیقت کے کہ ہندوستان کی وسیع آبادی کا خیال رکھتے ہوئے قیمتی دھاتوں کی درآمد کی مقدار اتنی خطرناک نہیں جتنی کہ نظر آتی ہے۔ درآمد کا بہت بڑا سبب لوگوں کا ادنیٰ معیار زندگی ہے جنھیں مصنوعات کی احتیاج کے باعث اپنی شدید ضروریات حیات بھی باہر بھیجنا پڑتی ہیں۔ مزید برآں محض دولت کا مجموعہ اصل سرمایہ نہیں ہوتا۔ مورلینڈ صاحب کہتے ہیں دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی لوگوں کا دولت جمع کرنے کی طرف بردست رجحان ہے لیکن اور مقامات کی طرح یہاں ابھی دولت کے مجموعے کو بطور اصل استعمال کرنے کا میلان نہیں نیز ملک کی دولت کا بہت بڑا حصہ اصل نہیں ہے۔

ہندوستان کی حکومتیں بجز چند مستثنیات معاشرتی اصلاحات سے غافل ہیں یہ اصطلاح ہی بہت محدود معنوں میں استعمال کیجاتی ہے۔ اس کا مفہوم صرف انہی اصلاحات تک ہے جو سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہیں۔ لوگوں کی بہبودی کے لئے برائے نام چند ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ سڑکوں۔ ریلوں تار یا ڈاک کی قسم کے ذرائع کا ملک میں جال بچھانا حکومت کی سہولت کے لئے ہے۔ جن کو تاجرانہ اصولوں پر چلایا جاتا ہے۔ خانگی اصلاحات ارضی ترقیات ضعفا کی پنشنیں اصول حفظ صحت۔ گداگری کا سدباب اور کارخانوں کی ترویج ایسی اصلاحوں کا خواب بھی نہیں دیکھا جاتا۔

عمدگی کے مجسمہ اور بذریعہ طاقت[1] برطانوی فوقیت کے قیام سے گہرا تعلق ہونے[2]
کے باعث ہندوستان کی اعلیٰ حکومت لوگوں کی بہبودی کے
لئے کافی طور پر کچھ بھی صرف کرنے کے قابل نہیں۔ ہندوستانی ریاستوں
میں عامۃ الناس کی تعلیم اور طبی اعانت تک بھی زیبائشی چیزیں
ہیں۔ دونوں ہندوستانی حکومت اور دیسی ریاستیں بجز چند
مستثنیات لوگوں کی برائیوں سے درگذر کرنے کے عادی ہیں۔ مسکرات
کے اجارے کی آمدنی صرف اسی آمدنی سے کم ہے جو زمین پر ٹیکس
لگانے سے حاصل ہوتی ہے۔

صرف ریاست بڑودہ نے رعایا کے متعلق اپنے فرض کا کچھ
ثبوت دیا ہے۔ ریلیں ریاست کے ہر حصے میں پہنچائی گئی ہیں
بندرگاہوں کو ترقی دی جارہی ہے۔ اجناس خام اور معدنیات
دیسی ایجنسیاں پیدا کررہی ہیں۔ عوام الناس کی مفت لازمی ابتدائی
تعلیم۔ اور کتب خانوں کے قیام کے ذریعے تربیت ہو رہی ہے
دیہاتوں میں صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نمونتہً دیہاتوں نے ترقی
کی ہے۔ قوانین اور لوگوں کے ذریعے کئی ایک سوشل برائیوں
کا انسداد کیا جارہا ہے۔ پرانے ضوابط سے روپیہ ہٹا کر مفید کاموں میں لگایا
جاتا ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ ریاست میں پنچائتیں ایک قومی چیز بن رہی ہیں
میسور نے سر۔ ایم وشو سوریا کے ماتحت ریاست بڑودہ کی ہمسری ملکہ سبقت لے جانے
کی کوشش کی۔ لیکن ہزہائینس مہاراجہ سیاجی راؤ گائیکواڑ کی حکومت کے خلاف جو
جو خوش نصیبی سے ایک نسل کا زمانہ گذارچکی ہے سر ایم وشو سویا کی جدوجہد
جب انتہائی جوش میں تھی ماند پڑ گئی۔

افلاس اور تباہی دونوں کے سدّباب کے لئے حکومت اور باشندوں دونوں کو متحد و متفق ہونا چاہیے۔ اب پہلی غور طلب بات یا تو پیداوار بڑھاکر یا غیر ضروری اخراجات کم کرکے خرچ کرنے کے زیادہ وسائل مہیا کرنا ہے۔ دوسرے اس صورت سے پیداوار کا اضافہ لوگوں کی حالت سدھارے اور اون کی بہبودی کے لئے صرف کیا جائے!

اعلیٰ حکومت کو جو تجارتی رجحانات ایسٹ انڈیا کمپنی سے وراثت میں ملے ہیں اُن سے نجات حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ محض اوسی وقت وقوع میں آسکتا ہے جب ہندوستان کو خزانہ سرکاری (یا مالگزارانہ) خودمختاری دی جائے اور اوس کے نظام حکومت میں باشندوں کی موثر آواز ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مالیات کلیتہً برطانوی پارلیمنٹ کے ترجمان کے ہاتھوں میں ہے۔ انڈیا آفس کے خودسر حاکم سے نے ہندوستان کا پینتیس کروڑ روپیہ استحکام تبادلہ کی احمقانہ خواہش میں قبل اس کے کہ لوگوں کو واقع کا احساس ہو صرف کردیا۔ وہ انگلستان میں قرض لیکر ہندوستان کے لگان پر بار ڈالتا ہے۔ ہندوستان کا روپیہ جو انگریزی بیوپاروں میں لگایا گیا وہ ہمارے لئے سخت نقصان رساں ثابت ہوا۔

حکومت میں اصلاح کے بعد ہندوستان کو دو چیزوں کی ضرورت ہے اولاً اس بات کا احساس کہ ہر طریق پیدائش جس سے پیداوار میں اضافہ ہوسکے اختیار کئے جانے کے قابل ہے۔ دوسرے جو دولت اس وقت بیکار پڑی ہوئی ہے اُس کو لطور اصل کام میں لگانے کے طریقہ سوچے جائیں۔

ہندوستان کا سب سے بڑا پیشہ زراعت ہے۔ پنجاب کے رائے سر گنگا رام بہادر کی کامیابی ظاہر کرتی ہے۔ کہ کس طرح اس سے منافع بڑھائے جاسکتے ہیں جس

امر کی ضرورت ہے وہ مطالعہ اور اُس کی تعمیل ہے۔ حکومت نے اس طرف جو عملی قدم اُٹھائے ہیں وہ کام کی مقدار کے لحاظ سے ناکافی اور بلا اندازہ ہیں۔

دوسرا سوال زراعتی محنت کا ہے۔ یہ سوال ہندوستانیوں کی ایک کثیر تعداد پر اثر کرتا ہے۔ لیکن اس کی طرف کمترین توجہ کی گئی ہے۔ بعض جگہوں میں مزدور کام کی تلاش میں جو بھوکوں مر جاتے ہیں اور بعض جگہ مزدوروں کی قلت کی وجہ سے کام میں ہرج ہوتا ہے۔ اِن صورت حالات کے علاج کیلئے عملی معیشت کا ایک ماہر تجویز کرتا ہے۔ "اگرچہ ہندوستان کے خاص خاص مقامات گنجان آباد ہیں لیکن ہندوستان بحیثیت مجموعی آباد نہیں۔ لہذا ہندوستانی مدبرین کے سامنے آج یہ سوال نہیں کہ لوگوں کی تعداد کم کی جائے بلکہ ملک میں اُن کی برابر تقسیم اور پیداوار دولت کے اضافہ کا خیال ہے جو کچھ تو زراعتی ترقی اور کچھ اُن صنائع کی ترقی سے ہو سکتی ہے۔ جن کے اجرا کی وسیع گنجایش ہے اور جو اُس آبادی کو جو اس وقت زاید معلوم ہوتی ہے کاروبار اور غذا مہیا کرے گی۔"

کمیشن سے قبل کی ایک بڑی معتبر شخصیت سر ایچ ایس کننگھم نے اپنی صائب رائے ظاہر کی ہے "بلا واسطہ غور و خوض کے بعد صنعتی کاروبار کی تدریجی ترقی کچھ کم اہم فرض نہیں اور حکومت کی طرف سے۔ اُس کی منظوری میرا یقین ہے کہ ہندوستان جس انتظامی اصلاح کے قابل ہے اُن میں اہم ترین ہو گی۔"

اُس حکمت عملی پر جس کی گذشتہ دو پیروں میں تائید کی گئی ہے عملدرآمد مزدوروں کی حالت سدھارنے میں ناکام نہیں رہے گا یہ جرمنی کے تجربے سے ظاہر ہو سکتا ہے مثال کے طور پر مسٹر چارلس ٹاور اپنی کتاب "آج کا جرمنی" میں لکھتے ہیں "سلطنت جرمنی کی غلامی کا خاتمہ کرنے کے لئے صنعتی ترقی کی ضرورت تھی جبکہ دیہاتوں کو چھوڑ کر لوگ صنعتی مرکزوں میں دوڑ رہے تھے۔ یہ محض مزدوروں کا شہروں

میں جمع کر دیا ہی تھا اور اب بھی ہے جس کی بنا پر زراعتی مزدوروں کی حالت زندگی بہتر ہوئی اور ہو رہی ہے۔

زراعت چونکہ ایک موسمی پیشہ ہے کھیت میں مزدوروں (اصطلاح کے وسیع معنوں میں) کو اُنہیں موسموں میں کافی کام ملتا ہے بلنی وقت کاہلی میں کاٹ دیتے ہیں۔ جاپان میں ایسے موسموں میں وقت کو دستی مصنوعات بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے جو چھوٹی سے چھوٹی تقسیم کی بدولت بلکہ بعض اوقات مشین کی مصنوعات کے باوجود جاری رہتی ہیں۔ ہندوستان میں گوناگون اسباب کی بنا پر مشکل سے کوئی دستی صنعت باقی رہ گئی ہے۔ تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے چرخہ ہی اُن کی بہت سی بیماریوں کا علاج ثابت ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کثیر التعداد گداگروں کا بوجھ اُٹھاتا ہے جو زیادہ تر مذہبی تحریک کے ماتحت ہے۔

اگرچہ سردست برطانوی ہندوستان میں گداگری کے انسداد کے لئے کارخانوں کے قیام کے لئے نیز ضعیفوں کی پنشنوں کے لئے ذرائع اختیار کرنے کا ذمہ نہ لیا جا سکے تو ہندوستانی ریاستیں اِس شعبے میں آسانی سے مثال قائم کر سکتی ہیں۔ وہ مقابلہ کے خیال سے آزاد ہو کر وسیع معنوں میں اجتماعی اصلاحات کے رواج دینے میں اپنی قوتیں صرف کر سکتی ہیں۔ کم از کم چند ریاستوں کو معاشی آئین دو قوانین (*hold*ings) کی ترویج کا ذمہ لینا چاہئے جو زراعت زرعی کرنے کی حالت پر بہت ہی عمدہ اور بنیادی اثر ڈال سکتا ہے۔

ہندوستان کی ایک سب سے بڑی ضرورت فنون کا علم ہے۔ مفت لازمی ابتدائی تعلیم کے رائج کرنے سے اِس کے لئے راستہ طیار کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ

ہی ساتھ بچوں کی تعلیم کا کافی انتظام اور لوگوں کی تعلیم کا جو کسب معاش میں مصروف ہیں ہندوستانی حکومتوں کی تعلیمی جدوجہد بہت سے راستوں کی طرف راہنمائی نہیں کرتی بلکہ بہت ہی تنگ راہوں تک محدود کردی گئی ہے۔ اس طرح معدودے چند پیشے ہندوستانیوں کے لئے باقی رکھے گئے ہیں۔ جس چیز کی وہ خواہش کرتے ہیں وہ مواقع فنون اور علم ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ہندوستانی مزارع بطفیل اُس عملی تربیت کے جو نسلاً بعد نسلٍ سیکھتا چلا آیا ہے۔ اُسی کام کو اختیار کرتا ہے جو واقعی اوس کی پیداوار میں اضافہ کرے۔ اب اُسے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ محنت کیسے بچائی جاسکتی ہے اور فرصت کا وقت باقی پیدا آور مشاغل میں صرف کیا جائے۔

ہندوستان خوراک اور روپیہ نہ ہونے کے باعث تکلیف اٹھاتا ہے ان ہر دو ضروریات کو پورا کرنے کے طریقے رائج کرنا چاہئیں۔ زرعی ترقی اور غیر ملکی تجارت کی شکل میں تبدیلی خوراک کی ضرورت کو پورا کردے گی انجمن اتحاد باہمی کا کام روپئے کی ضرورت پورا کرنے کا ایک قومی ذریعہ ہے لیکن ان انجمنوں کے کام کو ابھی بہت وسیع کرنے کی ضرورت ہے قبل اس کے کہ وہ موجودہ حالت پر کوئی قابل داد اثر ڈال سکیں۔

آمدورفت کے آسان ذرائع کا اجرا اندرون ہندوستان میں زندگی کے موجودہ حالات رائج کردے گا۔ اب تک آمدورفت کے صحیح ذرائع شاہانہ اور تاجرانہ خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے مہیا کئے گئے۔ عمدہ سڑکیں اور خصوصاً ریلیں دیہاتوں بلکہ شہروں تک بھی نہیں پہنچیں۔ تجارت کے جدید مرکز قائم ہوجانے کی توقع کی بجائے لوگوں کو اپنے قدیم مرکزوں ہی میں رہنے دیا جاتا ہے۔ ورنہ دردناک نتائج کے ساتھ ویرانی شروع ہوجاتی ہے۔ سڑکوں اور ریلوں کے ذریعہ شہر

اور دیہاتوں کا تعلق خاص ریلوں کے ذرائع آمد ورفت سے پیدا کرنے کا انتظام باقاعدہ اختیار کرنا چاہیئے۔ برطانوی ہندوستان میں اس طرف کچھ توجہ بھی کی جاتی ہے اگرچہ لوکل بورڈز کے لئے روپیئے کی قلت بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

مرکزی با اختیار ہستیوں کو نہ صرف شہری بلکہ دیہاتی رقبوں کی ترقی کے لئے بھی علیحدہ طور پر باقاعدہ روپیہ جمع کرنا چاہیئے۔ ہندوستانی ریاستیں زیادہ تر اپنے دارالخلافوں کا خیال رکھنے کی عادی ہیں۔

خالص پینے کا پانی مہیا کرنا نہایت ضروری احتیاج ہے۔ صفائی مکان و دیگر ممد صحت اصلاحات کا رواج دینا چاہیئے۔ نہ صرف دیہاتوں کے آباد مقامات میں اصلاح کرنی چاہیئے۔ بلکہ جو کھیت اُن سے متعلق ہوں اُن کی طرف بھی توجہ درکار ہے صفائی اور دلاویز ماحول کی اہمیت سب کے ذہن نشین کرنی چاہیئے۔ اور جو ذرائع ان مقاصد کے حصول کی جانب رہنمائی کریں اُنہیں جبراً رائج کرنا چاہیئے۔

اگرچہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے پھر بھی وزیر ہند ایک بڑا زبردست ساہوکار ہے۔ اُس کے تمام بیوپار ملک کے باہر انجام پاتے ہیں حالانکہ اصل ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ایک اسٹیٹ بنک کے قیام کی بجائے پریزیڈنسی بنکوں کا ادغام قابل افسوس ہے۔ جب تک ہندوستان کی بیرونی تجارت میں کوئی مؤثر تبدیلی پیدا نہیں کی جاتی ہندوستانی بنک اور تاجر دلالی اور منفعت کے بھروسے پر گذارہ کرتے رہیں گے

چند انجمنان اتحاد باہمی زرعی زمین کا کام چلانے کے لئے موجود ہیں لیکن ان کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہیئے زیادہ تر اتحاد کے اصول پر۔ غیر مزروعہ زمینوں میں کام کرنے کے لئے جدید علمی طریقوں پر انجمنان اتحاد قائم کی جانی چاہئیں۔ پیداوار اور تقسیم میں اتحاد بہت حد تک ملک کی آسودہ حالی میں اضافہ کرے گا، لوگ اپنی مشکل کو آسان کرنے کے لئے خود بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ ملک کی تجارت درآمد و برآمد میں

دوسب سے بڑے مدیں کپڑے اور سوت کی ہیں اور چونکہ کپڑے کی ضرورت ہے اناج باہر بھیجنا پڑتا ہے۔ روئی باہر بھیجی جاتی ہے۔ کیونکہ ملک میں اُس کا تار نہیں بن سکتا۔ آبادی کے کم از کم ۸۰ فیصدی حصے کا سوت کاتنے اور بُننے میں ایک مزید مصروفیت کے طور پر شرکت کرنا جن میں عورتیں اور بچے بھی شریک کئے جا سکتے ہیں دولت کے اُس نکاس کو بہت حد تک کم کرنے میں ناکام نہ رہے گا جس (نکاس) کا ملک کی بیرونی تجارت کے متعلق متذکرہ بالا اعداد وشمار اظہار کرتے ہیں۔

لوگوں کو ایک سب سے بڑے خطرے سے جو مزید آسان ذرائع آمدورفت سے پیدا ہو گیا ہے۔ بچنا چاہئے اور وہ ارزاں اشیا اور غیر ملکی مصنوعات اور تعیشات کا اپنے گھروں تک لانا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جو صنعت کے لحاظ سے بہت پیچھے ہو موجودہ صورت حالات میں لوگوں کو سادہ طرز زندگی کی عادت ڈالنا چاہئے رہنماؤں سے لیکر نچلے طبقے کے لوگوں تک۔ سودیشی اشیا کے استعمال کی سختی سے پابندی ہونی چاہئے اگرچہ خود پرور دیہات کا خیال ملکی شاہراہ ترقی کے افتتاح کے ناموافق ہے تاہم وہ سامان جو استعمال اور دستکاریوں کی توسیع کے لئے مہیا ہو سکے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔

افلاس نے ملک میں ناامیدی پھیلا دی ہے۔ جس نے کاہلی پیدا کر دی ہے۔ صرف حسن کی پرستش کی اشاعت ہی ملک کو یاس کے گڑھے سے نکال سکتی ہے۔ حسن کی داد اُس کی بیش قیمت آزمایش پر منحصر نہیں ہے۔ حسن ایسی قیود سے آزاد ہے۔ وہ سادگی کے ساتھ ساتھ ہے۔ ہندوستان کے مذاہب اس کے عقائد کو راسخ کرتے ہیں۔ لیکن اب وہ (خیالات) بے جان ہو گئے ہیں۔ کسی شخص کے لئے وطن کی محبت سے بڑھ کر کوئی خوبصورتی نہیں۔ قدرت کے چہرے پر خوبصورتی جلی حروف میں لکھی نظر آتی ہے صداقت خوبصورت ہے۔ نیک خصائل سب ایسے ہی ہیں اور بدیاں بدنما

صفائی سب سے اعلیٰ حسن ہے۔

مصنفین کے خیال اور تجربے کے مطابق عامۃ الناس کو بلندی پر پہنچانے کے لئے دفتر کے دفتر لکھے جا چکے ہیں ہر کس و ناکس ان تمام خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے قابل نہ ہوگا لیکن سب خیالات کی ترویج اور بعض کو عمل میں لانا ہر شخص کے امکان میں ہے۔ ہندوستان کا موجودہ سوال تباہی روکنا اور ناداری کو کم کرنا ہے۔ بڑودہ کی مہارانی جمنا بائی کی کتاب "ہندوستان میں عورتوں کی حیثیت" اور وشوے وارح کی کتاب "تو تعمیر ہندوستان" ایسی کتابیں ہیں جو اس مقصد کی طرف صحیح راہنمائی کرسکتی ہیں۔

مترجمہ عبد القادر سیالکوٹی متعلم جامعہ ملیہ

نقد و نظر

جسٹس لارنس نے انگلستان میں ایک مقدمہ کے فیصلہ میں تجویز کیا ہے کہ کسی استاد کو مدرسہ سے اس بنا پر برخاست نہیں کیا جا سکتا کہ مدرسہ مذکور مالی مشکلات میں متبلا ہے برخاستگی کے لئے صرف ایک وجہ اور وہ خرابی تعلیم ہی ہو سکتی ہے۔

یہ تو انگلستان کی علمی و ذہنی ترقی اور آزادی کی مثال ہے، لیکن جہاں تجارت و کاروبار کا سوال ہے وہاں اس ملک کی تنگ نظری بجائے خود ایک تازیانہ عبرت ہے، حال میں ایک عدالت نے جس میں لارڈ چیف جسٹس بھی موجود تھے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ شخص جو ایک معین رقم سے کم معاوضہ پر اس لئے کام کرنے سے انکار کرتا ہو کہ اس کا یہ فعل "مزدوروں کی جماعت" کے منشار کے خلاف ہو گا اُس کا شمار "کاہل و بیکار" لوگوں میں کئے جانا چاہئے۔ اور اس جرم میں کہ اس طرح وہ جان بوجھ کر اپنے عیال و اطفال کی پرورش سے گریز کرتا ہے اس کو سزا بھی ضرور ملنی چاہیئے!

کوہ ہمالہ کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ کے شیدائیوں کا تیسرا سفر عنقریب شروع ہونے والا ہے۔ جنرل بروس نے ۱۹۲۲ء میں پہلا سفر کیا اور اس وقت وہ ۲۷۲۵۰ فٹ تک پہنچ گئے تھے۔ اس چوٹی کی انتہائی بلندی ۲۹ ہزار فٹ سے زیادہ خیال کی جاتی ہے۔

فرانس میں وکیل عورتوں نے آج سے بیس برس پہلے کام شروع کردیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت کامیابی سے کام کرتی رہی ہیں۔ انگلستان نے اس معاملہ میں "مغربی آزادہ روی" کی مثال کسی قدر دیر سے قائم کی اور صرف دو سال ہوئے کہ وہاں عورتوں کو وکالت کی اجازت دی گئی۔ البتہ ہندوستان کی دیویاں اس میدان میں ایک حیثیت سے انگلستان سے بھی سبقت لے گئیں۔ یعنی آج کلکتہ بمبئی اور مدراس میں عورتیں بیرسٹری کر رہی ہیں۔

حال میں مس ایم۔ اے ٹاٹا نے بمبئی میں وکالت شروع کی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ میرے حریف مردوں نے جس ہمدردی و محبت کا برتاؤ کیا ہے وہ نہایت حوصلہ افزا ہے۔ نیز عورتوں کو اس پیشہ میں بہت کامیابی کی امید ہے بشرطیکہ وہ اپنے کام کو سنجیدگی و محنت سے کریں اور محض اس کو اک مشغلہ تفریح نہ قرار دیں۔" ان کے خیال میں شمال ہند کی پردہ والی بی بیوں میں ان کی وکالت کے لئے زیادہ گنجائش ہے، گو ان کا قصد بمبئی میں قیام کرنے کا ہے۔

علم کیمیا نے حال میں جو ترقیات کی ہیں اُن کی اہمیت کا اندازہ اس بیان سے ہو سکتا ہے جو "لٹریری ڈائجسٹ" نے مسٹر ڈوینانٹ کی طرف سے شایع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "اگر ان چیزوں کو جو علم کیمیا کے ذریعہ انجام پا سکتی ہیں کوئی شخص بیان کرنے لگے تو یقیناً وہ خارج از عقل خیال کیا جائیگا۔ باوجود اپنی نسبت اس شدید بدگمانی کے احتمال کے جناب موصوف فرماتے ہیں کہ کیمیا کے ذریعہ سے طبی غذا، مصنوعی ادن، انسداد امراض کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نیند بہت کم کر دی جائے یا اس کی مطلق ضرورت ہی نہ رہے۔ ایسی روشنی پیدا کی جا سکتی ہے جس میں گرمی

مطلق نہ ہو سورج کی حرارت کو ایک جگہ جمع کیا جا سکتا ہے اور بہ آسانی نہایت سستا بنایا جا سکتا ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے۔ کہ انسانی زندگی میں دماغی و جسمانی قوت عمل میں بعید اضافہ ہو جائے۔

امریکہ کے اخبارات کا بیان ہے کہ حال میں وہاں ایک سیاہ رنگ (حبشی) استاد اسکول کو اس جرم میں برخاست کر دیا گیا کہ وہ نسل و رنگ کی تفریق کا قائل نہ تھا لیکن جیسا کہ اس کا بیان ہے اس نے کبھی اپنے اس عقیدہ کی تعلیم کلاس میں نہیں دی۔ اسکول کی جماعت انتظامیہ کے اس فیصلہ پر رائے زنی کرتے ہوئے جناب صدر نے تحریر فرمایا ہے کہ ہماری جنوبی تہذیب کے علمبردار یعنی ممبران جماعت انتظامیہ نے بلاشبہ اس استاد کو موقوف کرنے میں جس کے یہ خیالات تھے ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔ آزادی و مساوات کا یہ نمونہ جمہوریہ امریکہ کے لئے نیا نہیں ہے البتہ مغربی آزادی کے دلدادہ ہندوستانیوں کے لئے ضرور تازیانہ عبرت ہے۔

ایرانی مجلس نے ایک نئے قانون کو مرتب کر کے اجرا کیا ہے۔ جس کی رو سے ہر ایک سرکاری ملازم کو خواہ وہ افسر اعلیٰ مثل وزیر، گورنر، جج یا ڈپٹی ہی ہو ایران کا بنا ہوا کپڑا پہننا لازمی کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی ملازم اس قانون کی پابندی نہ کرے تو اس جرم میں اس کی تنخواہ کا نصف فیصدی سے لیکر ایک فیصدی تک اس پر جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔

(المومن)

حال میں لارڈ نب ماسٹر کی تحریک پر ایک قانون انگلستان میں اس

غرض سے منظور کیا گیا ہے کہ وہ بچے غیر نکاحی والدین سے پیدا ہوں اس حالت میں کہ بعد کو ان کے والدین نکاح کر لیں ان کی جائز اولاد قرار دئے جائیں۔

انگلستان میں جہاں ناجائز اولاد کا مسئلہ روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتا جاتا ہے اس قانون کا رائج ہونا ایک مبارک فال سمجھی جاتی ہے!۔ اس لئے کہ جو تعداد اس وقت ایسے بچوں کی ہے اور جس کثرت سے اس میں پچھلے دنوں اضافہ ہوا ہے وہ نہایت ہی تکلیف دہ ہے۔

"ناظر"

رفتارِ تعلیم

ریاستِ ٹراونکور کے ایک عہدہ دار مسٹر سبرامانیا آئر نے مسئلہ تعلیم پر حال میں اظہار خیال کیا ہے - موجودہ طرز تعلیم کے نقائص کو کسی قدر زیادہ صاف الفاظ میں ظاہر کرنے کی وجہ سے ان کے بیان میں وہ صداقت ہے جو ہمارے بعض معلمین تعلیمات کے لئے بھی سبق آموز ہونی چاہئے - وہ فرماتے ہیں کہ "ایسے ملک کو جو نہایت تہذیب یافتہ اور جو اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو ایسی بیکسی کی حالت کو پہنچا دیں جس میں وہ آج گرفتار ہے محض اس طرز تعلیم کا نتیجہ ہے۔
ہماری حالت اس غلام کی سی ہے جو غیر اقوام کے ٹکڑے اور مدد کا محتاج ہو جو غیر اقوام کی صنعت و حرفت کی بدولت اپنی روٹی کماتا ہو، اور غیر اقوام ہی اس کی تعلیم دیتے ہوں اور وہ بھی غیر زبانوں کے ذریعہ سے"۔

ڈاکٹر جگدیش چندر بوس مشہور بنگالی سائنٹسٹ آج کل پھر یورپ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں اپنی حیرت انگیز اکتشافات کو علمائے سائنس کے سامنے پیش کر رہے ہیں - آسٹریا کی مشہور یونیورسٹی پراگ میں آپ کا لکچر ہو چکا ہے اور جرمنی و سویڈن، ناروے، اور ڈنمارک کے دار العلوم و فنون نے آپ کو دعوت دی ہے - لندن میں آپ کا لکچر حال میں ہوا ہے۔

ڈاکٹر بوس کی جدید تحقیقات بھی اسی قدر حیرت انگیز ہے جیسی اس سے

نبل ہوئی ہیں۔ نیز آیندہ کسی زمانہ میں جس قدر عظیم الشان کام ان جدید انکشافات سے لیا جاسکتا ہے اس کا اندازہ تو اس وقت خود ڈاکٹر بوس کے لئے بھی دشوار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی جدید تحقیق یہ ہے کہ درختوں میں ہمہ وقت ایسی حرکت جاری رہتی ہے جیسی نبض کی رفتار اور اس حرکت کا نتیجہ یہ ہے کہ جڑوں کا پانی اوپر چڑھتا ہے یہاں تک کہ وہ درخت کی چوٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ اس جدید تحقیقات کو انہوں نے اپنے بنائے ہوئے ایک آلہ کے ذریعہ سے دکھایا جس میں یہ عمل صاف نظر آتا ہے اس آلہ کی عجیب وغریب نزاکت وقوت جس نے علمار سائینس کو حیرت میں ڈالدیا ہے اگر ذرہ برابر فرق بھی حرکت میں ہوجائے یا کسی قسم کی کوئی اور تبدیلی واقع ہو تو یہ آلہ فوراً بتادیتا ہے۔

ہندوستان میں اصلاح تعلیم کے سب سے بڑے مرکز جدید یونیورسٹیاں ہیں اور چونکہ سیڈلر کمیشن کے بعد ان کا وجود عمل میں آیا ہے اس لئے یہ توقع بیجا نہ ہوتی کہ ان درسگاہوں میں جدید اصول، آزاد تعلیم اور مفید درسیات کا اجرار ہوجائے گا۔ لیکن حقیقت حال برعکس ہے جس کی نہایت ہی عبرت انگیز مثال اس واقعہ سے ملتی ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی سینٹ نے ۱۹۲۱ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ امتحان میٹرک میں جوابات لکھنے کے لئے ہندوستانی زبان استعمال کی جائے لیکن آج ۱۹۲۴ء میں جبکہ فن تعلیم نے کافی ترقی کرلی ہے ہمارے معلمین کو ضرورت لاحق ہوئی کہ وہ اس فیصلہ کو "ایک غیر معین مدت کے لئے" ملتوی کردیں چنانچہ ملتوی کردیا گیا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ عبرت انگیز وہ وجہ ہے جس کی بنا پر پٹنہ یونیورسٹی

نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اور جس کے متعلق رائے زنی کی بجائے یہاں اس کا نقل کر دینا ہی کافی ہے وہ بجائے خود اک موج محیط ہے جس میں کتنے ہی طوفان پوشیدہ ہیں، اور وہ یہ کہ چونکہ گورنمنٹ کے پاس اس وقت اس قدر روپیہ نہیں ہے کہ وہ ایسے اساتذہ کی خدمات حاصل کرے جن کی اس تجویز پر عمل کرنے میں ضرورت ہو گی اس لئے اس کو ملتوی کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی استادوں کی یہ عجیب وغریب ہمت افزائی ہے اور ہندوستانی بیکسی کی انتہائی مثال۔

یورپ اپنی مایۂ ناز تہذیب کے ہاتھوں خون کے آنسو رو رہا ہے اور حیرت یہ ہے کہ باوجود چند باخبر نفوس کے صحیح علاج تجویز کرنے والے آج بھی نظر نہیں آتے لیکن علاج و دوا نصیب ہو یا نہ ہو بیمار کا کرب اور اس کا دماغی اختلال حرکت وبےچینی کے اظہار سے باز نہیں آسکتا۔ چنانچہ جنگ یورپ کے بعد ہی اک عام اضطراب، بےچینی اور سب سے زیادہ غیر اطمینانی کی کیفیت ہر طرف نظر آنے لگی ہے اور ہر شخص اپنے گرد وپیش متجسانہ نگاہ ڈال رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تہذیب جدید کے اجزا کیا ہیں؟ اس کی بنیادیں حقیقی ہیں یا مجازی؟ انسان کا تعلق اپنی جنس اور دنیا سے کیا ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دنیا کی دوسری آبادیوں میں جو فرق تہذیب وتمدن میں نظر آتا ہے اس کا اقتضا کیا ہے اور آیندہ کے لئے کیا توقعات رکھنی چاہئیں۔

اس تجسس و بےچینی کے تقاضے سے امریکہ کی یونیورسٹیاں اپنے یہاں خاص لکچروں اور مفید معلومات کے ذرائع کا اضافہ کر رہی ہیں اور اسی منشا سے بمبئی یونیورسٹی نے پروفیسر گڈیس کی نگرانی میں عام لکچروں کا ایک سلسلہ شروع

گیا ہے جس میں تہذیب جدید کے متعلق اس قسم کے مسائل پر علمی حیثیت سے بحث کی جائے گی۔ ان کا پہلا لکچر "موجودہ امریکہ" پر تھا۔

ہم اس قسم کی ہر تحریک کو جو اضافہ معلومات کا ذریعہ ہو ایک مبارک فال سمجھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی مساعی میں ایک اندیشہ یہ بھی رہتا ہے کہ ہمارے ہادیان تہذیب جدید اپنے مقدس فرایض میں بعض اوقات ملکی اور وطنی مقاصد کی تبلیغ کا بھی موقع نکال لیتے ہیں اور اس خدمت کو اس کمال اور خوبی سے انجام دیتے ہیں کہ عام نظروں سے ان کے دل کا بھید مخفی ہی رہتا ہے انگلستان کے نامور مصنف۔ ایچ۔ جی۔ ویلس کی شہرۂ آفاق و تازہ تاریخی تصنیف سے جو امیدیں تھیں وہ غالباً اسی وجہ سے پوری نہ ہو سکیں۔

بنارس ہندو یونیورسٹی نے حال میں اپنے یہاں ایک جدید شعبہ علم کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا ہے جس میں کان کنی اور دھات سازی کی تعلیم ہوگی چار سال مدت تعلیم ہے۔ ڈگری بی۔ ایس سی کہلائے گی اور کان کنی اور دھات سازی کے لئے آخری سال میں علیحدہ علیحدہ تعلیم دی جائے گی۔ دوسری یونیورسٹیوں کے۔ ایف۔ اے پاس طلبہ داخل ہو سکتے ہیں۔

یونیورسٹی مذکور کی جدید ترقیات دوسری درسگاہوں کے لئے قابل رشک ہیں۔

دہلی و پنجاب کی رپورٹ مردم شماری سے اس صوبہ کے متعلق بعض دلچسپ اعداد و شمار حاصل ہوئی ہیں۔ جن سے وہاں کی تعلیمی حالت کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے صوبہ پنجاب کے تعلیمی حالت

بہ اعتبار مذاہب و فرقہ اناث و ذکور واضح ہوتی ہے ۔ اعداد فی ...۱۰ کے تناسب سے ہیں۔

مذہب	۱۹۱۱ مرد	۱۹۱۱ عورت	۱۹۲۱ مرد	۱۹۲۱ عورت
جملہ مذاہب	۶۳	۸	۷۴	۹
ہندو	۹۵	۷	۱۱۳	۱۸
سکھ	۹۴	۱۲	۹۳	۱۳
جین	۴۶۴	۲۴	۵۰۶	۴۷
مسلمان	۲۷	۲	۳۷	۴
عیسائی	۲۳۵	۱۲۵	۱۴۰	۹۳

مذہب عیسوی میں تعلیم کی کمی ظاہر ہے دیگر مذاہب میں ترقی جاری ہے۔ لندن یونیورسٹی اب طبی تعلیم کے لئے بھی مشہور ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس فن کے لئے وہ دنیا کی بہترین یونیورسٹی ہے۔ حال ہی میں کان کے امراض کے لئے ایک خاص پروفیسر کے تقرر کا اعلان کیا گیا ہے۔ جس کے لئے ایک مخیر قوم نے پندرہ ہزار پونڈ کا عطیہ یونیورسٹی مذکور کو دیا ہے۔ اور ساتھ ہی اعلان کیا ہے کہ ایک رقم وہ بہروں کے علاج کے لئے بھی عطا کرنے والے ہیں۔

"معلم"

مطبوعات جدیدہ

مطبوعات کاویانی پریس۔ برلن (جرمنی)

نصاب الصبیان (فارسی) | تالیف ابونصر محمد بدرالدین فراہی قیمت عہ۔ تقریباً ستر صفحہ کی مختصر کتاب ہے جس میں علاوہ ایک مقدمہ کے متعدد دلچسپ (فارسی) نظموں کو لڑکیوں اور بچوں کے لئے جمع کیا ہے نظموں میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علم عروض کی تمام مشہور بحریں اس میں آجائیں اور آخر کی دو نظموں میں تو بحروں کے نام بھی گنا دئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ چھوٹے بچوں کو یہ تمام اوزان ذکروبیاد ہو جائیں۔ چند واقعات تاریخ اسلام کے، بعض مطالب قرآن کے اور چند معلومات عامہ کی مفید باتیں بھی نظم کی گئی ہیں۔ کتاب کی طباعت و کاغذ کی خوبی ایسی ہی ہے جیسی کہ یورپ کے کتابوں میں نظر آتی ہے۔

رہنمائے پسران | مترجمہ آقا مرزا محمود خاں۔ قیمت عہ۔ یہ رسالہ امریکہ کے ایک ڈاکٹر کی تصنیف ہے جس کی شہرت نے اس کو مختلف زبانوں کا جامہ پہنایا ہے۔ فارسی میں اس کا جو ترجمہ کاویانی پریس سے شایع ہوا ہے۔ وہ ہمارے پیش نظر ہے۔ فارسی جدید کی صاف و ستھری لکھی ہوئی کتابوں میں اس رسالہ کو شامل کرنا چاہئے بالخصوص اس لئے کہ اس میں فرانسیسی الفاظ کی وہ فراوانی نہیں جو فارسی جدید کیلئے ایک لعنت ہوگئی ہے۔ کتاب کا مقصد بچوں کو توالد و تناسل کی ابتدائی معلومات دینا اور مضر صحت اعمال سے متنبہ کرنا ہے۔ جو خطوط کے پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔

تلگراف بے سیم | تالیف م۔ حجازی

لاسلکی تار کے لئے تلگراف بے سیم بہتر لفظ ہے اور یہ پہلی مرتبہ اس فارسی رسالہ میں نظر پڑا جو مطبع کاویانی نے حال میں شایع کیا ہے اور جو اسی نام سے موسوم ہے تقریباً ۵۰ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہے۔ جس میں اس عظیم الشان اکتشاف کے اصول و عمل کو وضاحت سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جا بجا فارسی اصطلاحات نظر آتی ہیں۔ جو سائنٹفک مسئلہ کے بیان کے لئے ناگزیر ہیں نقشے تصاویر اور اشکال نے کتاب کو نہایت دلچسپ پُرلطف اور قابل فہم بنادیا ہے۔ ایرانی زبان میں علوم و فنون کی خدمت کا جو اہم کام مطبع کاویانی نے اپنے ذمہ لیا ہے اس میں یہ کی یہ کوشش نہایت قابل تحسین ہے۔

لغات المانی | تالیف مرزا خان

یہ فارسی و جرمنی (المانی) زبان کی لغت ہے جو نہایت مختصر جیبی تقطیع پر نہایت خوبی کے ساتھ چھپی ہے اگرچہ ہندوستان کے لئے دونوں زبانیں غیر ہیں لیکن علماء ہند کے لئے ایسی کتاب کا وجود نہایت قابل قدر ہوگا اور یقین ہے کہ یہ چیز اپنی حیثیت میں پہلی تصنیف قرار پائے گی۔

یہ تمام کتابیں ہندوستان میں مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ سے مل سکتی ہیں۔

"ناقد"

غزل

نوشتہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر جامعہ ملیہ

مولانا کی یہ غزل مسلسل صرف بادۂ شاعری ہی نہیں ہے بلکہ خمار چشم ساقی کا کیف بھی اس میں شامل معلوم ہوتا ہے۔

"مدیر"

غرورِ حسن و نازِ دلبری دیکھ
تماشائے بتانِ آذری دیکھ

رخِ گل خونِ بلبل سے ہے رنگیں
فریبِ حسن کی غارت گری دیکھ

قفس میں طاقتِ پرواز کھو دی
گرفتاروں کی بے بال و پری دیکھ

خدا کے بندے۔ اور بت کی غلامی
مسلمانوں کی شانِ کافری دیکھ

جواں ہوتا ہے پھر یہ عالم پیر
بدلتا ہے زمانہ داوری۔ دیکھ

اُفق خونِ شہیداں سے ہے گلرنگ
بہارِ گنبدِ نیلو فری دیکھ

فرشتے عرش سے لاتے ہیں قندیل
زمیں پر نور کی جلوہ گری دیکھ

طبق گردوں کے اُلٹے جا رہے ہیں
بنا ڈھلتا ہے چرخِ چنبری دیکھ

مری آنکھوں کے پردوں میں سما جا
جہانِ نو کی داماں گستری دیکھ

اُسے آئینہ دکھلایا یہ کہہ کر
کہ اس شیشہ میں اُتری ہے پری۔ دیکھ

نہیں یہ داستانِ قیس و فرہاد
مرا قصہ نہ اسلم سرسری دیکھ

کلام شاد

شب جوانی کے سونے والو، یہ خوابِ نوشیں نہیں ہے، سم ہے
اداسی کہتی ہے آسماں کی قریب ہے صبح، رات کم ہے

ہے منزلِ عمر جائے حیرت، قدم کہیں اپنا ڈگ نہ جائے
عجب دوراہے پہ میں کھڑا ہوں۔ اِدھر ہے ہستی اُدھر عدم ہے

رہِ محبت میں رکھ قدم کو ہوس نہ کر سیر کی جہاں کے
کہ اس میں جو نقش پا ہے غافل، نگاہِ عبرت میں جامِ جم ہے

تری خوشی کا ہے نام جنت، ترے غضب کا لقب جہنم
اسی میں تیری اگر رضا ہے تو ہم کو دوزخ بھی پھر ارم ہے

نہ پوچھ ساقی کی بزم کی کچھ، خدا جو پہنچائے جا کے پہنچوں
مباح ہے واں تو خم کا خم بھی یہاں تو قطرے کی بھی قسم ہے

"مولانا شاد عظیم آبادی"

شذرات

اس مہینہ میں مہاتما گاندھی کی رہائی ہندوستان کی تاریخ کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے، جس کا اثر ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا پر ہونا لازمی ہے۔ مہاتما جی کے لئے قید و بند کی سختی تو کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن مہاتما کی روح جو بلاشبہ امن و شانتی، آزادی اور مساوات کی روح ہے اگر دنیا سے ایسے وقت میں جبکہ تمام عالم امن کی جستجو اور شانتی کی تلاش میں سرگرداں ہے کچھ دنوں کے لئے میدان عمل سے جدا ہو جائے تو اس مصیبت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہی مصیبت تھی جس میں ہندوستان گرفتار تھا اور یہ ہی نعمت ہے جو مہاتما کی آزادی نے اس کو واپس دی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ کا جلسہ تقسیم اسناد ۹۔ مارچ ۲۴ء کو قرار پایا ہے یہ پہلا موقع ہوگا کہ اس تقریب میں بانی جامعہ مولانا محمد علی اور ان کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی بھی شریک ہوں گے۔

جامعہ نے اس عرصہ میں قومی تعلیم کی کامیابی اور اس کی مقبولیت کے لئے جو خدمات کی ہیں ان کے مفید ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن ان کوششوں کی کامیابی کی صحیح اہمیت اسی وقت نظر آتی ہے جب ان موانع اور دشواریوں پر بھی نگاہ ہو جو جامعہ کی راہ میں قدم قدم پر حائل تھیں اور ہیں۔

دنیا کے عظیم الشان انقلابات جب سلطنتوں اور اقوام کو زیر و زبر کرنے میں کامیاب ہو جائیں، خیالات و معتقدات اپنی صورت بدل دیں اور زمانہ کی سب سے بڑی طاقتیں سرنگو

اور گمنام و بہیست و پا جماعت برسرکار آجاتے ہے تب انگلستان بھی متاثر ہو جاتا ہے اور اس شدید ہیجان و اضطرار کا نتیجہ اسی قدر ہوتا ہے کہ وہ منزل ارتقار کی طرف ایک قدم اور بڑھاتا ہے۔ یہ ہی اس کی کمال ترقی کی دلیل، اس کی انتہائی شورش کا نتیجہ، اور اس کے "شدید انقلاب" کا انجام ہوتا ہے۔ حال میں، جب کہ سلطنتیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں، قدیم حکمرانوں اور زبردست قائدوں کا وجود باقی نہ رہا۔ بلکہ اون کی جگہ ایسے اشخاص نے لی جو چند سال قبل مہذب دنیا میں تہذیب یافتہ کہلانے کی بھی مستحق نہ تھے تو انگلستان میں بھی اس کا اثر اس قدر ہوا کہ قدیم استبدادی جماعت کو شکست ہوئی اور ان کی بجائے مزدور پیشہ جماعت کے رہنما برسر حکومت آگئے۔ لیکن اس طرح کہ لنن فشیٹی جماعت اٹلی، یا جرمنی اشتراکیئں، انٹرنیشنل (بین الاقوامی جماعت مزدوران) سے اُن کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ آئینی طرز حکومت اور تدریجی ترقی کے حامی ہیں اور اسی میں اپنے ملک کی نجات سمجھتے ہیں۔ انگلستان کی قومی سیرت کا یہ راز ہے کہ اس کی استبدادیت اور قدامت پسندی انقلاب و سیاسی ہیجان میں بھی قوم کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

لیکن باوجود اس قدامت پسندی کے زمانہ کا سیلاب انقلاب بھی اس قدر شدید ہے کہ اس کے اثر سے بچنا بھی آسان کام نہیں۔ مسٹر رمزے میکڈ انلڈ جو آج وزیر اعظم ہیں آج سے تا پنج سال قبل پارلیمنٹ کی ممبری بھی حاصل نہ کر سکتے تھے اور ان کے خلاف رایوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی۔ خود اس جماعت کی جو آج برسر حکومت ہے یہ حالت تھی کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں پندرہ نشستوں کے لئے امید وار مقابلہ پر آئے اور اُن میں صرف دو کامیاب ہوئے۔ لیکن سنہ ۱۹۱۰ء میں ۵۶ میں ۴۲ کامیاب ہوئے۔ آغاز جنگ کے زمانہ میں بھی یہ تناسب کچھ زیادہ نہیں بڑھا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۲ء میں ۴۱۴ امیدواروں میں ۱۴۲ کامیاب ہوئے اور سنہ ۱۹۲۳ء میں ۴۲۷ ۱۹۱ کامیاب رہے۔ ان ہی آخری کامیابیوں اور ساتھ ہی دوسری جماعتوں کی نا اتفاقی اور کمزوری نے بالآخر اس جماعت کو حکومت انگلستان تفویض کر دی۔

مہاتما گاندھی کو ہندوستان کی انجمن صحافیین (جرنلسٹ ایسوسی ایشن) نے اپنا صدر منتخب کیا ہے۔ مہاتما کا نام عزت و افتخار کے لئے نہ صرف اس انجمن کے واسطے بلکہ دنیا کی ہر انجمن کے لئے موزوں ہے اور اگر اس خیال سے اس جماعت نے یہ فیصلہ کیا تو بیجا نہیں لیکن ان کو اس سے زیادہ حق بھی حاصل ہے اور وہ یہ کہ مہاتما خود بھی ایڈیٹر ہونے کی حیثیت سے اپنی برادری میں شرکت کا پورا حق رکھتے ہیں۔ لیکن جس انجمن کی صدارت ان کو تفویض کی گئی ہے اس کے ارکان شاید اصول صحافت پر مہاتما جی کے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے اور نہ اس انجمن کے مقاصد میں اصلاح صحافت کو کوئی خاص مرتبہ حاصل ہے۔ مہاتما جی کے اخبارات "ینگ انڈیا" اور "نوجیون" جن اصولوں پر شایع ہو رہے ہیں وہ موجودہ دنیائے صحافت کے لئے ایک عجیب انوکھی چیز ہے اخبارات میں مذہب و اخلاق کی تعلیم یوں ہی کیا کم تعجب خیز ہے لیکن جب جدید صحافت کی دوسری خصوصیات مثلاً اشتہارات، خبروں کی اشاعت میں خاص اہتمام، اظہار رائے کے لئے خاص الفاظ نہ ہوں تو ایسی حالت میں یہ فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ لیکن مہاتما جی کی شخصیت باوجود اس بعد المشرقین کے مغربی دنیا میں اپنا اثر قائم کرتی جاتی ہے اور اس کا تازہ ثبوت ان کے اس انتخاب صدارت سے ملتا ہے۔

دنیا میں مختلف دور گزری ہیں۔ اگر مادیات میں عجیب و غریب تبدیلیاں اور انقلابات ہو گئے تو ذہنی ترقی اور علمی مدارج میں بھی بہت سے حیرت انگیز اثرات اپنا کام کرتے رہے، کبھی یہ تغیرات تدریجی اور ارتقائی حالت میں درجہ کمال تک پہنچے اور اس طرح نظروں سے پوشیدہ رہے اور کبھی ایک انقلابی حالت نے طوفان حوادث کو سامنے کر دیا کہ کچھ عرصہ کیلئے کائنات کے تمام اجزا درہم برہم نظر آنے لگے۔ اس قسم کے واقعات جب کبھی پیش آئے تو ان کا اثر ایک خاص حلقہ یا دایرۂ عمل تک محدود نہ رہا بلکہ دنیا کی تمدنی، معاشرتی، علمی و مذہبی ہر حیثیت میں یہ انقلابی رو دوڑ گئی اور اس کے نتایج ظاہر ہونے لگے۔
گزشتہ چند سال سے یہ کیفیت پھر دنیا میں نظر آئی ہے اور آج معتقدات، خیالات، اصول

تصانیف مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

تاریخ القرآن	جس میں قرآن حکیم کے ابتدائے نزول سے لیکر آج تک کے تمام تاریخی حالات اور اس کے متعلق ہر قسم کی معلومات اور لطیف علمی مباحث نہایت تحقیق اور اختصار کے ساتھ مختلف زبانوں کی مستند کتابوں سے اخذ کرکے لکھے گئے ہیں قیمت عہ، مجلد عہ
خواتین	ابتدائے اسلام سے آج تک کے تینتیس ۳۳ مشہور مسلمان خاتونوں کے معتبر تاریخی حالات قیمت عہ
حیات جامی	مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی نہایت مکمل اور مقبول سوانح عمری ہے قیمت ۸
حیات حافظ	مولانا حافظ علیہ الرحمۃ کے مکمل حالات زندگی کے ساتھ ان کے کلام پر نہایت دلاویز تنقید قیمت عہ
محجوب الارث	فقہ اسلامیہ کے مشہور مسئلہ پر اجتہادی رنگ میں دلچسپ بحث ہے قیمت ۴
الوراثۃ فی الاسلام	قانون وراثت پر مولینا کا مجتہدانہ کارنامہ (عربی) قیمت ۸
تاریخ الامت	اسلامی تاریخ کو پہلی مرتبہ مولانا نے مسلسل و صاف اردو میں بیان کیا ہے جس کے چار حصے سیرۃ الرسول، خلافت راشدہ، عہد بنی امیہ و بنی عباس تک شایع ہو چکے ہیں قیمت ہر حصہ کی جداگانہ ہے۔ مکمل عہ

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ

شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

کی

جدید مطبوعات

۱۔ تاریخ الدولتین (از مولانا نیاز فتحپوری) بنی امیہ و بنی عباس کے عہد کی سب سے زیادہ مؤثر دلکش قابل استناد تاریخ ایک جلد میں صرف اسی کتاب میں نظر آئیگی جو جرجی زیدان مصری کی شہرۂ آفاق تاریخ اسلامی کی بنیاد پر اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے۔ طرز بیان کی خوبی اور عبارت کی دلکشی کے لئے مولانا نیاز فتحپوری کا نام کافی ضمانت ہے۔ قیمت

۲۔ انتخاب کلام میر (مرتبہ مولوی نور الرحمن۔ بی۔ اے) اردو زبان کے بہترین شاعر استاذ الاساتذہ ہونیکی حیثیت سے میر کے ضخیم کلام کا انتخاب مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے۔ لیکن جس سوز و گداز نے میر کو خدائے سخن بنایا ہے اس کے صحیح نمونے صرف اسی انتخاب میں نظر آتے ہیں۔ جو نہایت مختصر ہونے کے ساتھ ہی میر کے تمام دیوان کا جوہر ہے ابتدا میں حالات زندگی اور ایک زبردست مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں اردو شاعری کی تاریخ محاسن کلام میر اور موجودہ فن تنقید کے اصول پر اس عہد کے شعراء کا موازنہ شعراء قدیم سے کیا گیا ہے۔ مجلد قیمت عہ

۳۔ عرض جوہر مولانا محمد علی مدظلہ کی غزلیات کا مجموعہ اس سے قبل شایع ہو چکا ہے لیکن زندان بیجاپور کے مکاشفات اس میں بھی نہیں ہیں **عرض جوہر** میں مولانا کا تازہ ترین کلام اور وہ بے نظیر غزلیں موجود ہیں جو صرف بیجاپور کے زندانی ہی کی زبان سے ادا ہو سکتی تھیں قیمت ۸

۴۔ الصراط المستقیم (تفسیر سورہ انفال و توبہ۔ از مولانا خواجہ عبد الحی صاحب) خواجہ صاحب کی تفسیر الحلالت کے بعد ایسی جدید تصنیف شایع ہوئی ہے جس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو خواجہ صاحب کا حصہ ہو گئی ہیں۔ مباحث قرآنی پر جس وضاحت و دلکشی کے ساتھ خواجہ صاحب نے قلم اٹھایا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت عہ

باہتمام عبد العلی خاں منیجر

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرّحمٰن

مطبع جامعہ ملّیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

مطبوعات شرکت کاویانی برلن (جرمنی)

(صرف مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ ہندوستان میں ان کتابوں کو فراہم اور فروخت کرتا ہی)

۱۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو | مع روشنائی نامہ وسعادت نامہ فارسی مصنف چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوا۔ اس عہد کے بلاد اسلامیہ کے چشم دید حالات نہایت دلچسپ وعبرت آموز جس میں مصنف کی دو غیر مطبوعہ نایاب مثنویاں فلسفہ حکمت پر شامل ہیں۔ سرورق وسرنامہ اصل ایرانی نسخہ کے مطابق مطلا ورنگین۔ کاغذ نہایت اعلیٰ دبیز چکنا سفید مثل چینی کی پلیٹ کے چمکیلا۔ طباعت نظر افروز قیمت [illegible]

۲۔ زاد المسافرین | حکیم ناصر خسرو کی یہ دوسری معرکۃ الآرا کتاب ہے جو عرصہ سے ناپید تھی اور اب مطبع کاویانی نے نہایت خوبی واہتمام کے ساتھ طبع کرائی ہے۔ فلسفہ وتصوف اور حکمت اسلامی کی یہ مستند کتاب ہے۔ قیمت [illegible]

۳۔ گلستان | شیخ سعدی شیرازی کی شہرۂ آفاق کتاب جدید قالب میں نظر آئی ہے کاغذ عمدہ طباعت نفیس اور سرورق خوبصورت۔ قیمت [illegible]

۴۔ تیاتر | از مرزا ملکم خاں ناظم الدولہ جنکی عملی وقلمی جدوجہد سے ایران دوبارہ زندہ ہوا۔ یہ ان کے تین نثر ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں گذشتہ صدی کے نظام حکومت ایران کی ابتری کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ فارسی جدید کے قدردان اس تحفہ کو بڑی قدر سے قبول کریں گے قیمت [illegible]

۵۔ موش وگربہ فارسی | از خواجہ عبید زاکانی۔ جو آٹھویں صدی کا ہجو گو اور مشہور شاعر تھا چوہے بلی کی جنگ کا قصہ میں ابنائے عصر کی ہجو ملیح ہے جو عہد حاضر کے لئے بھی یکساں برمحل ہے۔ ہر صفحہ رنگین ودلاویز تصاویر نظم نہایت دلچسپ ومہذب بچوں کے واسطے بھی نہایت موزوں ہے قیمت ۵

۶۔ تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء (عربی) | مولفہ حمزہ ابن الحسن اصفہانی ۳۵۰ھ ہجری میں لکھی گئی انتہائی کاوش کے ساتھ قدیم تواریخ فارس وروم۔ یونان مصر۔ عراق۔ شام وعرب کے متعلق تمام صحیح ومعتبر سنین کی تفتیش وتحقیق ہے۔ شائقین تاریخ کے لئے نہایت دلچسپ ومفید تحفہ ہے۔ قیمت [illegible]

۷۔ نصاب الصبیان | فارسی جدید کے شائقین اور طلباء کے واسطے بہترین مجموعہ نظم ہے قیمت [illegible]

۸۔ رہنمائے پسران | بچوں کو خط وکتابت کے پیرایہ میں عمدہ نصیحتیں کی ہیں [illegible]

۹۔ تلغراف بی سیم | فارسی میں وائرلیس ٹیلیگرافی پر قابل قدر تصنیف ہے جس میں متعدد نقشے تصویریں رنگا رنگ شامل ہیں قیمت

۱۰۔ لغات المانی بفارسی | فارسی وجرمن زبان کی لغت۔ قیمت [illegible]

مبادی معاشیات | علم المعیشت میں قابل قدر اور گراں مایہ اضافہ ہے جو اصول معاشیات پر تازہ ترین مباحث پر حاوی ہے از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب قیمت عہ، مجلد عہ

خطبہ صدارت شیخ الہند مرحوم | بہ تقریب افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ قیمت ۲ر

خطبہ صدارت مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم | بہ تقریب جلسہ اول تقسیم اسناد جامعہ ملیہ قیمت ۲ر

اسلامی تہذیب و قومی تعلیم | ڈاکٹر سر پی۔ سی رائے کا وہ مشہور و معروف خطبہ صدارت جو ممدوح نے بہ تقریب جلسہ دوم تقسیم اسناد جامعہ بزبان انگریزی پڑھا۔ جس میں مسلمانوں کی گذشتہ علمی خدمات کی تاریخ کا قابل دید مرقع ہے۔ مترجمہ مولوی محمد مسلم ایم۔ اے قیمت ۴ر انگریزی ایڈیشن قیمت ۸ر

ترکوں کی کہانیاں | محبت اسلامی و غیرت قومی کو جوش دلانے والی چند ترک بہادروں کی جانبازیوں کے نہایت سچے اور بصیرت افروز تاریخی واقعات زبان سلیس و عام فہم اور آسان۔ قیمت ۴ر

حقائق اسلام | فلسفۂ اسلام پر عقلی دلائل و براہین از مفتی انوار الحق صاحب ایم۔ اے نئی روشنی کے حضرات کے واسطے قابل قدر تحفہ ہے قیمت ۶ر

المدنیۃ والاسلام | فرید وجدی علامۂ مصر کی عربی کتاب کا بہترین و دلکش ترجمہ کہ اصل کتاب اور ترجمہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اسلامی اصول پر محققانہ اور دلچسپ مباحث۔ از مولٰنا رشید احمد انصاری مرحوم استاذ جامعہ و سابق پروفیسر مدرسۃ العلوم قیمت ۱۲ر

مکاتیب | نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر۔ دلچسپ۔ پُر از معلومات بہترین مجموعہ مرتبہ مولوی محمد امین صاحب زبیری مہتمم تاریخ بھوپال قیمت عہ

تصانیف خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی پروفیسر جامعہ ملیہ علیگڈھ

الفرقان فی معارف القرآن

قرآن حکیم کی اس سے بہتر زبان اردو میں کوئی تفسیر ملک میں موجود نہیں۔ مولینا کی یہ خدمت قابل قدر و ستایش ہے۔ آپ جن مضامین کو وقت و زمانہ کے لحاظ سے زیادہ ضروری و اہم خیال فرماتے ہیں۔ پہلے اونہیں کو ترتیب فرما رہے ہیں۔ اب تک دو حصے شایع ہو چکے ہیں۔

حصہ اول۔ الخلافۃ الکبریٰ — سورۂ بقر کی مکمل و مفصل تفسیر حجم ۲۲۴ صفحات قیمت للعہ مجلد صہ

حصہ چہارم۔ الصراط المستقیم — سورۂ انفال و توبہ کی مبسوط تفسیر۔ شروع میں مسئلہ جہاد پر ایک بصیرت افروز مقدمہ کا اضافہ ہے حجم صفحات کاغذ ولایتی سفید چکنا قیمت عہ

بصائر — حضرت موسیٰ اور فرعون کے واقعات، زمانہ حاضرہ سے تطبیق طبع جدید جس میں بعض مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے قیمت ۶ر

ان کتابوں کے علاوہ اردو زبان کے تمام مشہور مصنفین مولانا شبلی، حالی، سرسید، مولوی نذیر احمد، اور زمانہ حال کے مصنفین مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا نیاز فتحپوری، حضرت خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری وغیرہ وغیرہ کی جملہ تصنیفات اور مطبوعات انجمن ترقی اردو دارالمصنفین وغیرہ ہمہ وقت موجود رہتی ہیں۔

منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ علی گڈھ سے مفصل فہرست طلب کیجئے

فہرست مضامین

جلد سوم	ماہ شعبان ۱۳۴۲ھ ہجری مطابق ماہ مارچ ۱۹۲۴ء	نمبر ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد سوم | ماہ شعبان ۱۳۴۲ھ ہجری مطابق ماہ مارچ ۱۹۲۴ء | نمبر ۳

مسئلہ خلافت

مسلمانوں کے اوپر ملی اور قومی مصائب میں یوں ہی کچھ کمی نہ تھی کہ اس خبر نے ان میں اور بھی اضافہ کردیا کہ ترکوں نے خلافت کے منصب کو توڑ دیا۔

اگرچہ یہ خبر ابھی تک مبہم ہے اور اس کی اصل حقیقت اچھی طرح واضح نہیں ہوئی کہ کن وجوہات اور خیالات کی بنیاد پر ایسا کیا گیا۔ لیکن جو بھی اسباب ہوں لیکن یہ واقعہ نہایت افسوسناک ہے۔ اس سے اسلامی اقوام وملل کی مرکزیت منتشی ہو۔ اور تاریخ اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

ترکوں نے جب اپنی جمہوریہ قایم کرلی تھی تو ہر ایک مسلمان کو یہ توقع ہوگئی تھی کہ اب وہ مسئلہ خلافت کا صحیح حل نکالیں گے اور اس کو بہترین شکل میں قایم کریں گے۔ خود ان کے اعلانوں سے بھی یہ امر ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ صرف ترکوں کا خلیفہ نہیں بنانا چاہتے بلکہ تمام امت اسلامیہ کے انتخاب سے ایک جمہوری خلافت کا انتظام کر رہے ہیں۔ لیکن بجاے اس کے سال گذشتہ میں ان کا خود اپنے انتخاب سے عبد المجید کو خلیفہ بنا دینا۔ اور اس سال ان کو یکایک نکال دینا۔ اور اس کے ساتھ منصب جلیلۂ خلافت کو بھی توڑ دینا ایک ایسا لاینحل سیاسی معما ہے جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر ایک غلطی دوسری غلطی کی ممد ہوسکتی ہے تو یقیناً ان کی دوسری غلطی پہلی غلطی کا نتیجہ ہے کیونکہ جب ملک میں جمہوری حکومت قایم ہوچکی تھی۔ اور مجلس ملیہ کا صدر بھی منتخب ہوچکا تھا تو پھر کسی دوسرے شخص کا انتخاب خواہ خلیفہ ہی کے نام سے کیوں نہ ہو سراسر اصول سیاست کے خلاف تھا۔ ایک ہی ملک میں صدر جمہوریہ اور خلیفہ کی دو جداگانہ حکومتیں کیوں کر قایم رہ سکتی ہیں۔ دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں سازشیں اور جماعت بندیاں ہوئی ہونگی جن کی پاداش میں خلیفہ اور اس کا سارا خاندان نکالدیا گیا۔

ہم نہ خاندان پرست ہیں نہ کسی خاص خاندان کا حق خلافت تسلیم کرتے ہیں اس لئے عبدالمجید کے نکالنے پر نہ ہم کو حیرت ہے نہ ملال کیوں کہ ان معاملات میں ترک اپنے مصالح بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن نفس خلافت کو اس انتشار اور گھبراہٹ میں توڑ دینے کا مقصد ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ اس کا ترکوں کو کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ خلافت کچھ ان کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس منصب کو امت اسلامیہ نے اس دن قایم کیا ہے جس دن سرورپاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رحلت فرمائی ہے۔ کیونکہ امت کے لئے ایک ایسی ذات ناگزیر ہے جس کو بجائے نبی کے وہ اپنا مرکز بنائے۔ اسی وجہ سے اس منصب پر قایم ہونے والے کا لقب خلیفۃ الرسول یعنی نبی کا جانشین رکھا گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ۳۰ سال تک خلافت جمہوری اصول پر رہی۔ اس کے بعد بنی امیہ تغلب سے اس پر قابض ہوگئے۔ انہوں نے اگرچہ جمہوریت کو مٹا کر اس کو خاندانی سلطنت بنالیا لیکن پھر بھی مرکزیت کو قایم رکھا۔ خلافت کے فرایض ادا کرتے رہے اپنے تقریباً صد سالہ عہد حکومت میں اُمت کے شیرازہ کو بکھرنے نہیں دیا۔ اور سب کو ایک علم کے نیچے رکھا۔ ان کے زمانہ میں تمام عالم اسلام میں مشرق سے مغرب تک بجز خلافت کے کسی دوسری حکومت کا نام ونشان نہ تھا۔

سنہ ۱۳۲ھ میں جب سے بنی عباس تخت خلافت پر آئے امت میں افتراق اور انشقاق شروع ہوا۔ اور مرکز خلافت کو چھوڑ کر جداگانہ اسلامی حکومتیں قایم ہونے لگیں۔ تقریباً سو

سال تک خلافت عباسی نے اپنی قوت اور شوکت کی بدولت دوسری اسلامی حکومتوں پر اپنی فوقیت کو قایم رکھا۔ اور ایک قسم کی مرکزی حیثیت اس کو حاصل رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے بعد اس قدر کمزور ہوگئی کہ دوسری اسلامی حکومتوں مثلاً آل بویہ۔ اور آل سلجوق نے اس کو اپنے سایہ میں لیلیا آخر ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد بقایائے بنی عباس کی خلافت پھر مصر میں قائم ہو گئی۔ مگر وہاں حکومت ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔ محض رسماً یہ منصب باقی رکھا گیا تھا۔

۹۲۲ھ میں جب سلطان سلیم عثمانی نے غوری کو شکست دی تو مصر کی سلطنت کے ساتھ منصب خلافت بھی اس کو ملگیا۔ اور اُمت کی مرکزیت آل عثمان کو نصیب ہوگئی۔ اس پر وہ اس قدر خوش ہوا کہ جب خطیب نے خطبہ میں اس کے نام کے ساتھ خادم الحرمین الشریفین کہا تو وہ فوراً سر دربار میں اپنا جبہ جس کی قیمت پچاس ہزار اشرفی تھی اُتار کر اس کو بخشدیا۔ اس کے بعد اہل شام وعرب نے بلا جنگ محض خلافت کے نام سے اطاعت قبول کر لی اسوقت سے یہ منصب ترکوں کے ہاتھ میں چلا آتا ہے۔

عثمانی خلافت بھی خاندانی سلطنت تھی۔ شخصی حکومتوں کے جو لازمی نقائص ہیں وہ سب اس میں موجود تھے اور خلفاء عثمانیہ نے خلافت کے بہت سے فرایض نہیں ادا کئے۔ لیکن پھر بھی اسلام کی جو عظیم الشان خدمات انہوں نے انجام دیں وہ کسی طرح فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں سلطان سلیم ثانی اس وقت بھی میدان جہاد میں جانے سے نہیں رُک سکا جبکہ اس کے مرض سرطان میں اس قدر حدت تھی کہ مرغی رکھی جاتی تھی اور گل جاتی تھی۔

اس خاندان کی عظمت وشوکت کو خلافت نے بہت بڑھا دیا۔ اور تمام عالم اسلامی میں ان کو وہ وقعت نصیب ہوئی جو بلاخلافت کے کبھی نہیں ہوسکتی تھی۔

آج جبکہ ترکوں نے اسلامی اصول کے مطابق جمہوری سلطنت قایم کر لی تھی تو وہ سب سے زیادہ خلافت کے مستحق ہوگئے تھے۔ اگر سیاسی وجوہ یا رکاوٹیں تمام ملت کے انتخاب سے

خلافت نہیں قایم کرسکتے تھے تو کم سے کم اپنے صدر ہی کو خلیفہ بنا دیتے۔ جو تمام دنیائے اسلام کا نہ سہی لیکن ترکوں کا تو صحیح خلیفہ ہو جاتا۔ پھر عالم اسلامی بھی اسی کو تسلیم کر لیتا۔ لیکن تعجب ہے، کہ جس وقت وہ دستار خلافت کے صحیح طور پر اہل ہوئے۔ جس سے ان کی عظمت کو عروج ہوتا اس وقت اونہوں نے اس کو سر پر سے اُوتار کر پھینکدیا۔ اور ملت کے اس قدیم منصب اور امت کی مرکزیت کو فنا کر دیا۔

لیکن ابھی کوئی قطعی راے قایم کرنا قبل از وقت ہے۔ ترک سیاسیات میں اس قدر بودے نہیں ہیں کہ حیات ملی چھوڑ کر انفرادی زندگی اختیار کریں۔ علاوہ بریں اس مرکزیت سے بجز نفع کے ان کا کوئی نقصان نہیں تھا جس کی وجہ سے اس سے دست بردار ہوں۔ گو ترکی جمہوریہ کا صدر اس وقت خلافت کا اہل ہے لیکن اس کی مرکزی حیثیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ دیگر اسلامی جمہوریات ضروری حمایت اور امداد کے لئے تیار ہوں۔ اس لئے ممکن ہے کہ ترکوں کا مقصد یہ ہو کہ دنیائے اسلام اگر ہم سے خلافت کی خواہاں ہو تو ہم ان شرائط پر راضی ہوسکتے ہیں کہ دیگر ممالک کے مسلمان بھی اس کے فرائض کا جس قدر حصہ ان کے ذمہ عائد ہوتا ہو پورا کرنے کا عہد کریں۔ لہذا اصل حقیقت کے ظاہر ہونے کے لئے ابھی آیندہ حالات اور واقعات کا انتظار کرنا چاہیئے۔

محمد اسلم جیراجپوری

فلسطین

برطانوی سیادت میں

فلسطین کی مقدس سرزمین، ایشیا کے منتہائے مغرب میں، صحرائے شام اور سواحل بحر ابیض کے درمیان واقع ہے اس کا رقبہ ۲۷ ہزار کیلومیٹر مربع ہے جس کے اکثر حصے نہایت سرسبز اور زرخیز ہیں باشندوں کی تعداد ۵۰ لاکھ تک پہنچی ہے جن میں ۸۱ ہزار یہودی، ۷۰۰ ہزار عیسائی اور باقی سب مسلمان ہیں۔ یہ سرزمین دنیا کے تین بڑے بڑے مذاہب کی گہری عقیدتوں کا مرکز ہے، اور یہودی، عیسائی اور مسلمان، تینوں ایک دوسرے کے دشمن اور حریف ہونے کے باوجود اگر کسی چیز کے تقدس کو متحدہ طور پر تسلیم کرتے ہیں، تو وہ یہی ارض مقدسہ ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم کے ابتدائی ایام تک دوسرے عربی ممالک کی طرح یہاں ترکی حکومت تھی۔ اس حکومت کے نظام اور عربوں کے ساتھ اس کے برتاؤ پر کوئی تفصیلی بحث کرنا، اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے؛ البتہ مختصراً صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ترکی حکومت میں عربوں کو ان مصائب و شدائد کا ایک سواں حصہ بھی کبھی برداشت نہیں کرنا پڑا جو ہمیشہ ایک قوم کو دوسری قوم کی حکومت میں برداشت کرنے پڑتے ہیں، اور اس حیثیت سے یہ دعویٰ کرنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ اعراب فلسطین کے لئے ایک قومی حکومت کے بعد اگر کوئی نظام حکومت مشفقانہ و مربیانہ ہو سکتا تھا۔ تو وہ ترکی حکومت ہی کا نظام تھا۔ اس کی وجہ محض یہی نہیں کہ ترکوں اور عربوں کے درمیان اسلام کے مذہبی رشتہ نے اخوت اور بھائی چارہ قائم کر دیا تھا، بلکہ ترکی قوم کی تاریخ اس امر کی زبردست شہادتیں دیتی ہے کہ اس نے تمام غیر قوموں پر بلا امتیاز مذہب و ملت، ایسی شفقت و رواداری سے حکومت کی ہے، جس کی مثال اس بیسویں صدی کی مہذب ترین حکومتوں میں بھی ڈھونڈے نہیں ملسکتی۔ مگر عربوں نے ترکوں کی اس اچھی حکومت کو بھی اپنے اوپر ہمیشہ گراں سمجھا۔ اور وہ اپنی اس حریت پسندی کے باعث جو فطرت نے بہت مبالغہ کے ساتھ ان کی جبلت میں ودیعت کی ہے

ایک غیر قوم کی حکومت سے کبھی خوش نہیں رہے۔ پھر چونکہ عرب و ترک دونوں بہادر اور اپنی بہادری و شجاعت پر فخر و غرور کرنے والی قومیں ہیں، اس لئے فطرتاً عربوں پر ترکوں کا غلبہ و تسلط بہرحال عربی شجاعت کے لئے ایک چیلنج تھا۔ تاہم مذہبی رابطہ اور منصب خلافت کا اثر و اقتدار قومی جذبات سے بہت زیادہ قوی تھا اور عربی قوم کو کئی صدیوں تک خلیفۃ المعظم کا نہ صرف مطیع و فرمانبردار بلکہ وفادار و جاں نثار بنائے رکھا تھا

انیسویں صدی کے اواخر میں، جبکہ استعمار و استعباد کے لئے یورپین قوموں کی حریصانہ کوششیں اپنے پورے عروج پر تھیں، اور خصوصاً اسلامی ممالک کو غلام بنانے اور اسلام کی دنیوی طاقت کو توڑ دینے کی منفقہ سعی کی جارہی تھی، مدبرین یورپ نے نام نہاد "عربیت" کی تحریک ایجاد کی۔ ان دقیقہ رس مدبرین کی باریک نظروں نے اس خفیف سے شگاف کو دیکھ لیا جو خلافت کے مضبوط بند میں موجود تھا، اور اس چوہے کی طرح جس نے عرم کی تاریخی بند کو کھودا تھا رفتہ رفتہ اس شگاف کو فراخ کرنے لگے۔ انہوں نے عربوں کی رقابت کو جو محض بالقوی موجود تھی، ابھار کر عملی صورت میں لانا شروع کردیا، اور ان کے اندر حریت وخود مختاری کا جذبہ پیدا کرنے کے بعد اس خیال کی پرورش شروع کردی کہ خلافت در اصل ان کا حصہ ہے جسے ترکوں نے غصب کر رکھا ہے۔ نوجوان اور بیوقوف عرب جن میں مغربیت کی نئی نئی ہوا لگی تھی اور جو مغربی لجنت کی محض چیکدار اصطلاحوں پر مرتے تھے، ان عنایتوں کی اصل غایت تک نہ پہنچ سکے اور اپنے یورپین ہادیوں کو اپنی قوم کا نجات دہندہ سمجھ کر ان کے اشاروں پر حرکت کرنے لگے۔ آخر کار بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں عربی خلافت کی تحریک اپنے شباب کو پہنچ گئی۔ نوجوان عربوں میں ترکوں کے خلاف بغض و عناد پوری طرح مستحکم ہوگیا، عربوں نے اپنے یورپین رہنماؤں کی نگرانی میں تمام ممالک عربیہ سے ترکوں کو نکال دینے کے لئے خفیہ سازشیں شروع کردیں، اور اس شگاف نے جو برسوں سے خلافت عثمانی کے بند میں پھیلایا جارہا تھا، آخر کار رسنا شروع کردیا۔ فلسطین مسیحیت کے خداوند مصلوب کا مولد و مدفن ہونے کی حیثیت سے، ان تمام کوششوں کا ایک حد تک مرکز مقصود تھا۔

سنہ ۱۴ع میں جب اتحاد و ترقی کی حکومت نے تلوار سے موت وحیات کا آخری فیصلہ چاہنے کے لئے سنٹرل یورپ کا ساتھ دیکر جنگ میں شرکت کی تو اتحادیوں نے اپنے پرانے عزائم کی تکمیل کیلئے

اس وقت کو مناسب ترین وقت خیال کیا۔ تمام عربی قوم کو امیدیں دلائی گئیں کہ اگر انہوں نے اتحادی قوتوں کا ساتھ دیکر ترکی حکومت سے بغاوت کردی تو یہ امر ان کی نجات کا بہترین ذریعہ ہوگا، ان سے وعدے کئے گئے کہ فتح کے بعد ایک متحدہ عربی سلطنت قائم کی جائیگی، اور عربی قوم کے بچہ بچہ کو ان اعلانات کے ساتھ اپنی حق پرستی کا یقین دلایا گیا کہ اتحادی طاقتیں محض غلام قوموں کو آزاد کرانے اور استبداد کو نیست و نابود کر کے حق انتخاب حکومت کا زریں اصول دنیا میں رائج کرنے کے لئے جنگ کر رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۵ء کے معاہدہ کی رو سے عربی حکومت قائم کرنے اور عربوں کو پوری طرح آزاد کرا دینے کی ضمانت لے لی گئی۔

یورپین سیاست سے ناواقف اور ڈپلومیٹک چالوں سے نابلد عرب سمجھ بیٹھے کہ بس اب آزادی کی ضمانت مل گئی اور بجائے خود مطمئن ہوگئے کہ عربی خود مختاری کا خمیر ترکی خون سے تیار ہو جائے گا۔ مکہ میں شریف نے بغاوت کی، فلسطین کی حزب الوطنی نے لارڈ (اس وقت جنرل) ایلنبی سے ساز باز کیا اور شام و عراق کے عربوں نے اس مثال کی تقلید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۸ء کا خاتمہ گویا ممالک عربی سے ترکی حکومت کا خاتمہ تھا۔

اس حد تک ان اسباب سے بحث کرنے کے بعد جن کی بدولت عربوں کا رشتہ ترکوں سے ٹوٹ کر انگریزوں سے جڑا تھا، اب سلسلۂ کلام کو جوڑنے کے لئے فتح فلسطین کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ ترکی قوت اس محاذ پر نہایت مستحکم اور ناقابل تسخیر تھی۔ لارڈ ایلنبی کی تمام ابتدائی کوششیں اس کو توڑنے کے لئے بیکار ثابت ہوئیں۔ مگر اہل فلسطین نے برطانی وعدوں پر اعتماد کر کے ترکوں کے خلاف سازش کی اور ایسے نازک موقع پر جبکہ ان کے خلاف ایک زبردست دشمن بر و بحر سے حملہ آور تھا، دفعۃً اٹھ کھڑے ہوئے۔ جمال پاشا مرحوم نے بڑے تدبر اور ہوشیاری کیساتھ مدافعت کا سامان کیا تھا اور مشکل تھا کہ انگریزی فوجیں صحرائے سینا سے آگے بڑھ سکیں، مگر اس اندرونی بغاوت نے ان کو بالکل بے بس کر دیا اور آخرکار ارض مقدس کا ایک ایک انچ انہیں خالی کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۱۷ء کو دنیائے مسیحیت کی وہ آخری آرزو بھی پوری ہوگئی جس کے لئے اسلام کی گذشتہ ۱۲ صدیوں میں ہزاروں

مرتبہ خونریز کوششیں کی گئی تھیں، اور یروشیلم کی تسخیر اسلام پر مسیحیت کی آخری فتح کی صورت میں مکمل ہو گئی۔ یہ سب اعراب فلسطین کی اعانت کا نتیجہ تھا۔

بیت المقدس میں داخل ہوتے ہی لارڈ ایلنبی کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ انھوں نے عربوں کے اعتماد کو زیادہ استوار کرنے کی کوشش کی، اور ان ابلہ فریب اعلانات کی زیادہ پرزور لہجہ میں تجدید کی جن کی بدولت انہیں اس قدر عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک اجتماع عظیم کے سامنے جو انگریزی، ہندوستانی اور عربی فوجوں اور اہل بیت المقدس سے مرکب تھا انہوں نے منارۂ داؤد کے نیچے کھڑے ہو کر ایک تقریر کی جس کے صاف اور صریح الفاظ یہ تھے کہ:۔

"یہ جنگ اسلام پر حملے کی غرض سے نہیں بلکہ فلسطین کے باشندوں کو عثمانیوں کے استبداد سے آزاد کرانے اور انہیں خود مختاری دلانے کے لئے کی گئی ہے۔"

پھر تکمیل فتح کے بعد دوبارہ ایک اعلان کیا گیا اور فلسطین کی چھوٹی سے چھوٹی بستی تک یہ الفاظ پہنچائے گئے کہ:۔

"ہم خالص ملکی حکومت قائم کرنے میں تمہاری اعانت اور ہمت افزائی کریں گے۔ ہم نے اس ملک کو اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے نہیں لیا بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنی مرضی کے مطابق آپ حکومت کرو۔"

اعراب فلسطین بجائے خود مطمئن تھے کہ بس اب عنقریب آزادی کا سورج طلوع ہونے والا ہے، اور جنگ ختم ہوتے ہی ہماری غلامی کا خاتمہ بھی یقینی ہے، مگر عہد نامۂ التوائے جنگ پر دستخط ہونے کے بعد عین اس وقت جبکہ ہر دل توقعات سے معمور تھا، دفعۃً ۲۔ نومبر ۱۹۱۷ء کو رائٹ آنریبل مسٹر (اب لارڈ) بالفور نے فلسطین پر برطانی سیادت کا اعلان کر دیا، اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ یہ بھی اعلان کیا کہ فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن قائم کیا جائے گا اور تمام اطراف عالم سے بنی اسرائیل کو سمیٹ کر ارض مقدس میں بسایا جائے گا۔ یہ ایک بجلی تھی جس نے ایک آن واحد میں اعراب فلسطین کی چہار سالہ امیدوں کو پھونک کر رکھ دیا۔ پہلے تو وہ

بہت جھنجلائے، مگر وقت ہاتھ سے کھو چکے تھے اس لئے بہت جلدی ہی ان کا غصہ مایوسی سے بدل گیا
برطانی سیادت کے ظاہری الفاظ پر اگر غور کیا جائے۔ تو ایک ناواقف شخص یقین کرے گا
کہ ان میں اہالی کی اندرونی آزادی اور اُن پر محض برطانی نگرانی و ہدایت کے معنی پوشیدہ ہیں۔ اس
کے ساتھ اگر قبل جنگ اور دوران جنگ کے وعدوں اور تصریحات بالفور کے الفاظ کو پیش نظر رکھا جائے
تو یہ یقین وثوق کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ مگر امر واقعہ اور نفس حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں اس
استبداد سے بھی کچھ زیادہ شدید استبداد حکمراں نظر آتا ہے جو ترکوں کے زمانہ میں تھا۔ اور جس
سے عربوں کو "آزاد" کرانے کے لئے جنگ کی گئی تھی۔ ترکی حکومت گو اصطلاحاً ایک استبدادی حکومت
تھی، مگر اس میں عربوں کو ایک بڑی حد تک خود مختاری حاصل تھی۔ والی اور چند بڑے افسروں کے
سوا حکومت کی مشین اول سے آخر تک عربی پرزوں سے مرکب تھی۔ بلکہ بڑے افسروں میں
بھی چند افسر عربی ضرور ہوتے تھے۔ ٹرکی میں پارلیمنٹ قائم ہونے کے بعد عربوں کو بھی پورے نیابتی
حقوق حاصل ہو گئے تھے اور قسطنطنیہ کے دار المبعوثین میں فلسطین کے جائز طور پر منتخب کئے ہوئے نمائندے
پوری آزادی کے ساتھ اپنے ملک کی نیابت کر رہے تھے علاوہ رعایا کی دادرسی خود سلطان المعظم
فرماتے تھے اور عربوں پر ان کی شفقت و محبت تمام دوسری محکوم اقوام سے زیادہ تھی۔ مگر برطانی تسلط
کے بعد نقشہ بالکل بدل گیا۔ دوران جنگ کا ذکر نہیں، عہد امن قائم ہونے کے بعد جو نظام حکومت فلسطین
پر نافذ کیا گیا وہ ایک مکمل استبدادی نظام تھا۔ ہائی کمشنر تمام اہالی فلسطین کا مالک الرقاب تھا، اس
کو مشورہ اور رائے عامہ کے استرضا کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ اور اس کی زبان و قلم اپنی ایک ادنیٰ
جنبش سے اہل ملک کی قسمتوں کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ اس دور میں سر ہربرٹ سیمویل کی گرفت جمال پاشا
مرحوم کے فوجی پنجہ کی گرفت سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ پھر جب مجلس اقوام نے "باقاعدگی" کے
ساتھ فلسطین کو برطانی سیادت میں دیدیا تو یہ نظام ذرا بدلا گیا۔ اب اس مطلق العنان کو آئینیت
اور شورائیت کا لباس پہنانے کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ دنیا کی ظاہر بیں نگاہیں خوبصورت
کپڑوں کو دیکھ کر بدصورت جسم کی طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ چنانچہ ہز ایکسیلینسی سر ہربرٹ سیمویل

نے اعلان کیا کہ:۔

"اب فلسطین میں ایسی حکومت قائم کی جائیگی جو رائے عامہ کی مرضی کے مطابق حکمرانی کرے گی۔ میں ایک مجلس شوریٰ قائم کرتا ہوں جس میں ۱۱ نمائندے سرکاری ہوں گے اور ۱۰ نمائندوں کو میں خود ہر قوم میں سے نامزد کروں گا۔ یہ کونسل مختلف اوقات میں میرے زیر صدارت اجلاس کرے گی اور تمام اہم مسائل اس کے مشورہ سے طے ہوں گے"

یہ کونسل قائم کرکے گویا مدبرین سلطنت نے اہل فلسطین کو وہ حق انتخاب حکومت عطا کردیا جس کے وہ ترکی حکومت میں سخت محتاج تھے اور جسے ان کو دلانے کے لئے ایک عظیم الشان جنگ کی گئی تھی مگر سب سے بڑی مصیبت جو اعلان بالفور کی بدولت اہل فلسطین پر نازل ہوئی وہ یہودیوں کے قومی وطن کی مصیبت تھی اس وطن قومی کی تحریک نے ملک کے تمام اصلی باشندوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کردیا ہے اور وہ مالی، اخلاقی، جسمانی اور ہر حیثیت سے تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔

بالفور کے اعلان کی بنیاد یہ خیال ہے کہ فلسطین دراصل یہودیوں کا قدیم گہوارہ اور بنی اسرائیل کی پرانی بستی ہے اس لئے اب یہاں انہی کو آباد کرنا چاہئے۔ لیکن اگر اس دعوے کی حقیقت کو ٹٹولا جائے تو نہ کسی طریقہ سے یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے کہ فلسطین یہودیوں کا حق ہے اور نہ یہ حرکت کبھی حق بجانب ہوسکتی ہے کہ ملک کے موجودہ باشندوں کو نکالکر جو صدیوں سے یہاں رہتے ہیں، ان کے گھروں میں یہودیوں کو بسایا جائے جو صدیوں پہلے رہتے تھے۔ اگر تاریخی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہمیں نظر آتا ہے کہ آج اس سے دو ہزار سال پہلے اس سرزمین پر یہودیوں کے قبائل آباد تھے۔ ۴ سو برس سے کچھ ہی زیادہ مدت گذری ہوگی کہ رومیوں کا سیلاب آگیا اور بقائے اصلح کے قانون نے اسرائیل کی اولاد کو نکالکر رومی فاتحوں کے لئے جگہ خالی کرالی۔ آخر ساتویں صدی عیسوی میں عربی قوت ریگستان حجاز سے اٹھی اور مملکت فارس سے مصر تک پھیل گئی۔ اسی زمانہ میں فلسطین فتح ہوا اور ساتویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ تمام اہل ملک نے اسلام قبول کرلیا۔ پس تاریخ ۴۰۰ برس کے یہودی قیام کے مقابلہ میں ۱۳۰۰ برس کی اسلامی آبادی

کو پیش کرتی ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اول الذکر کی وطنیت پر آخر الذکر کی وطنیت کا تگنا ترجیحی حق ثابت ہوتا ہے۔ نسلی حیثیت سے اگر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے قبل یہاں عمالقہ آباد تھے جو عربی الاصل تھے پھر اسماعیلیوں نے یہاں اپنے خیمے لگائے اور ان کے بعد بنی اسرائیل آباد ہوئے بس بنی اسرائیل سے پہلے یہاں عرب کی سکونت ثابت ہوتی ہے۔ اگر آثار کو دیکھیں تو ہمیں فلسطین میں اسرائیلی آثار اتنے بھی نظر نہیں آئے کہ ان کی بناپر ملک کے کسی ایک ٹکڑے کو بھی خالص اسرائیلی کہا جا سکے۔ برخلاف اس کے مسلمان ہیں کہ اس سرزمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں جو اسلامی تمدن و عمرانیت کے آثار سے خالی ہو۔ حتیٰ کہ جب ایک سیاح کسی چھوٹے سے چھوٹے قریہ میں بھی داخل ہوتا ہے تو عہد قدیم کے اسلامی آثار اور عہد حاضر کے اعلام مقدسہ کو نمایاں دیکھتا ہے اور اسے اپنے گرد ایک ایسا ماحول نظر آتا ہے جس میں اسلامی تمدن، اسلامی روایات، اسلامی آثار اور اسلامی تہذیب کے سوا اور کچھ نہیں لیکن اگر ان تمام تاریخی و اثری شواہد سے قطع نظر کر کے ہم تسلیم بھی کر لیں کہ ان تمام حیثیات سے فلسطین ایک اسرائیلی ملک ہے تب بھی انصاف نہیں چاہتا کہ اس ملک سے ۱۳ سو برس کی عربی اکثریت کو نکال کر ان اسرائیلیوں کو تمام اقطاع ارضی سے لا لا کر بسایا جائے جو آج سے دو ہزار سال پہلے یہاں بستے تھے اور آج مذہبی روایات کے سوا فلسطین میں ان کے لئے اور کوئی جاذبیت ایسی نہیں جو انہیں اس کی طرف کھنچ جانے پر مجبور کر سکے۔ مسلمان یہاں ۱۳ صدیوں سے رہتے ہیں، آبادی میں ۹۰ فیصدی ان کا حصہ ہے، جائدادیں ۹۵ فیصدی ان سے تعلق رکھتی ہیں ملکی تجارت اور کاروبار میں ان کا سرمایہ اربوں تک پہنچتا ہے جو ثروت ملکی کا کم از کم ۹۲ فیصدی ہے، اسلامی اوقاف اس کثرت سے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں کہ صرف قدس شریف میں ان کے خرچ پر ۱۰ ہزار طالب علم دینی تعلیم پا رہے ہیں۔ اگر ان تمام مادی و اقتصادی اعتبارات کے مقابلہ میں محض تاریخی و اثری اعتبارات کو وزن دیا جا سکتا ہے، اور اگر صرف انہیں دلائل کی بنا پر عربوں کو ان کے گھروں سے محروم کر کے باہر کے یہودیوں کو ان کی جگہ آباد کیا جا سکتا ہے تو یقیناً ایسے ہی قوی دلائل پیش کر کے امریکہ کے موجودہ ساہوکاروں کو حبشیوں کے لئے جگہ

خالی کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے کینیڈا، اسٹریلیا اور نیوزیلینڈ وغیرہ برطانی مستعمرات کے آبادکاروں کو قدیم وحشی باشندوں کے لئے اپنی تجارتی کوٹھیاں چھوڑ دینے کا مشورہ دیا جاسکتا ہے، اور ہندوستان کی پوری سامی اور آرین آبادی کو بھیلوں اور گونڈوں کے حق میں اپنے اس نظام تمدن سے دست بردار ہو جانے کی رائے دی جاسکتی ہے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر آج یہی اصول دنیا میں رائج کر دیا جائے تو اس معمورۂ ارضی کی تمام جدید نسلوں کو پرانی نسلوں کے لئے جگہ خالی کرنی پڑے گی اور کچھ عجب نہیں کہ موجودہ نسلوں کو یہ کرۂ زمین چھوڑ کر کسی اور ویران کرہ میں اپنے لئے جائے قرار ڈھونڈنی پڑے۔

پس ہر ہوشمند انسان یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اعلان بالفر کی تائید میں تاریخی و اثری دلائل پیش کرنا محض ایک بہانہ ہے جس کی تہ میں اس مقصد کے سوا کچھ اور پوشیدہ نہیں ہو سکتا کہ یہودیوں کو اپنا رہین منت بنا کر انہیں خطرناک مسلمانوں کے بجائے سویز کے مضافات میں آباد کیا جائے۔ اگر اس اجمال کی تفصیل کی جائے تو بحث ضرورت سے زیادہ طویل ہو جائیگی اس لئے اختصار کے ساتھ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جب سے مصریوں کے وطنی جذبات برطانی حمایت (Protectorate) کے لئے اندیشہ ناک ہو گئے ہیں، اس وقت سے مدبرین برطانیہ کو ہندوستان کے راستہ پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے ایک ایسے مستقر کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو وادیٔ نیل سے زیادہ مستحکم ہو اور اگر کسی وقت سرزمین فراعنہ پر انگریزی سیاست کے لئے عرصہ تنگ ہو جائے تو ایسا نہ ہو کہ آبنائے سویز بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ ظاہر ہے کہ مصر کے بعد اگر سویز کی حفاظت کے لئے کوئی اور علاقہ موزوں ہو سکتا ہے۔ تو وہ فلسطین ہی ہے جو لیوانٹ کا نچلا حصہ ہے اور آبنائے کی سرزمین سے متصل واقع ہے چنانچہ اسی کو انہوں نے منتخب کیا ہے اور اب چاہتے ہیں کہ یہ پورا علاقہ ایک ایسی قوم سے آباد ہو جو ہمیشہ برطانیہ کی دوست اور خیرخواہ رہے اور کسی وقت مصر کی طرح خطرناک ثابت نہ ہو۔ یہی راز ہے جو یہودیوں کے وطن قومی کی تحریک میں پوشیدہ ہے اور اسی خواہش نے انہیں اس صریح ظلم پر آمادہ کیا ہے۔ اس داغ کو چھپانے کے لئے وہ تاریخ و آثار کے خوشنما لباس استعمال کر رہے ہیں، مگر انہیں پتہ نہیں کہ یہ کپڑے جالی دار ہیں جن میں سے

ان کا عیب بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔

فلسطین کے مسلمانوں نے بارہا اس امر کی درخواست کی کہ رائٹ آنریبل مسٹر بالفور یا ڈاؤننگ اسٹریٹ کے دوسرے ارباب حل وعقد نومبر ۱۹۱۷ء کے اعلان کی تشریح کردیں اور کھلے لفظوں میں بتلادیں کہ وطن قومی کا مقصد کیا ہے؟ اس کو قائم کرنے کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں گے اور موجودہ غیر یہودی اکثریت کی قسمت کا کیا فیصلہ ہوگا۔ مگرچہ یہ فن سیاست کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ حکومت کی پالیسی اور اس کے احکامات کبھی استدلال وتشریح اور توضیح وتفصیل سے آلودہ نہ کئے جائیں۔ کیونکہ الہام نہ صرف دغا کا ایک خوبصورت آلہ ہے، بلکہ اس کی بدولت عمل کا میدان وسیع رہتا ہے۔ اور سلطنت کے قوائے عملی کے لئے کوئی روک اور بندش نہیں رہتی۔ لارڈ بالفور اور برطانی سیاست خارجہ کے دوسرے ارباب حل وعقد ان لوگوں میں ہیں جو موجودہ فن سیاست کے ائمہ کاملین شمار کئے جاتے ہیں، پھر کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے اعلان کی کوئی تشریح کرتے۔

مگر ہمارے پاس صہیونی لیڈروں کی تصریحات موجود ہیں جو پورے اعلان کے ساتھ کی گئی ہیں اور کم ازکم ان وعدوں پر مبنی ہیں جو وطن قومی کی تعمیر اور اس کی نوعیت کے متعلق ان سے کئے گئے ہیں، ان کی تقریریں اور تحریریں پڑھکر ہمیں پوری طرح ان مقاصد کا علم حاصل ہوجاتا ہے جو وطن قومی کے موسسین کے پیش نظر ہیں۔ مثال کے طور پر کارلسباڈ کانفرنس کی تقریریں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں ہر یہودی مقرر نے کھلے الفاظ میں اس مفہوم کو دہرایا تھا کہ "اب فلسطین یہودیوں کا ہے اور غیر یہودی کے لئے وہاں ایک انچ زمین بھی نہیں مل سکتی"۔ ورسیلز کانفرنس میں صہیونی کانگریس کے صدر ڈاکٹر وائزمین نے علی رؤس الاشہاد یہ الفاظ کہے تھے کہ:۔

"بالفور کے اعلان کا مقصود حقیقی یہودیوں کے لئے فلسطین کے دروازے کھولدینا ہے تاکہ کم سے کم مدت میں وہ اسی طرح ان کا وطن بنجائے جس طرح انگلستان انگریزوں کیلئے اور امریکہ امریکنوں کیلئے ہے"۔

ؔ۱ یہودیوں کی ایک جماعت ہے جسے انگریزی میں (Zionist) کہتے ہیں یہ دوسرے معنی میں قوم پرست یہودی ہیں اور وطن قومی کی تحریک کے روح رواں ہیں۔ ؔ۲ یہ کانفرنس اواخر ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔

صیہونی کانگریس کے وکیل ڈاکٹر ایدر نے اضطرابات یافا کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے نہایت زور سے کہا تھا کہ:۔

"فلسطین میں ایک قوم کے سوا کسی اور کا وطن بننے کی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں۔ وہ یہودیوں کا ہو چکا ہے" "اور اب یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ مسلمانوں کو برابر کے حقوق دئے جائیں"

ایک اور صیہونی لیڈر مسٹر زنکویل جو صیہونی کانگریس کا نہایت ممتاز رکن ہے اپنے مضمون میں لکھتا ہے کہ

"مسلمانوں کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ارض مقدس سے بوریا بستر اٹھا کر کسی اور جگہ اپنا گھر بنائیں"

سر الفرڈ مونڈ ایک اور سربرآوردہ لیڈر بڑے پُر زور لہجہ میں کہتا ہے کہ:۔

"میں اپنی زندگی کے آخری ایام مسجد اقصیٰ کی جگہ ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کرانے میں صرف کروں گا"

ان صاف اور صریح بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی قوم پرست فلسطین میں ایک خالص یہودی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور انہیں اس مقصد میں کامیابی کا پورا پورا یقین ہے صرف اسی پر بس نہیں بلکہ صیہونی تحریک کی تاریخ اور اس کے مقاصد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے عزائم فلسطین کے حدود سے گذر کر عراق و شام اور اطراف جزیرہ تک پھیل رہے ہیں اور ان کی لالچی فطرت تمام مشرق ادنیٰ کو گھیر لینا چاہتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ جب تمام معمورۂ ارضی کے کونہ کونہ سے یہودیوں کو جمع کر کے ایک مرکز پر اکٹھا کیا جائے گا تو فلسطین ان کے ایک دسویں حصہ کو بھی مشکل سے جگہ دے سکیگا۔ کیونکہ اس میں حد سے حد ۱۰ لاکھ آدمیوں کی گنجائش ہے اور یہودیوں کی مجموعی آبادی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ سے کسی طرح کم نہیں۔ اسی لئے یہودی لیڈروں نے اپنے پاؤں ابھی سے پھیلانے شروع کر دئے ہیں اور فلسطین کے حدود کھینچ کھینچ کر مشرق ادنیٰ پر محیط کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ایک لیڈر ڈاکٹر اوسیکشن نے جو صیہونی کانگریس کی شاخ فلسطین کا صدر ہے، ایک موقع پر حکومت انگلستان کو سخت ملامت کی تھی کہ وہ ماوراے

اردن کو فلسطین کا ایک ٹکڑا کیوں نہیں تسلیم کرتی! اسی طرح ان کے چند لیڈروں نے متحدہ طور پر دعویٰ کیا ہے کہ توراۃ کی رو سے اصلی فلسطین کے حدود موجودہ جغرافی فلسطین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع ہیں اور ان میں حوران اور عراق و شام کے بعض حصے داخل ہیں۔ ان کے اس دعوے کو تو شاید کوئی تسلیم نہ کرے مگر یہ حقیقت بالکل ناقابل انکار ہے کہ ان کی حرص و آز کے حدود اس سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہیں۔

(باقی آئندہ)

"ابو الاعلیٰ مودودی"

یورپ کی موجودہ حالت

یورپ آج اضطراب اور پریشانی کی حالت میں ہے، اور اس کے قدم ایک غار کی طرف اُٹھتے جا رہے ہیں، محاربۂ عظیم جس میں تہذیب وشائستگی کا مقابلہ بربریت اور مطلق العنان فوجی قوتوں سے ہوا تھا عرصہ ہوا کہ ختم ہو گیا اور اس خونیں انقلاب کے ساتھ تاریخ بنی نوع انسان کی سب سے بڑی جنگ کا بھی خاتمہ ہوا۔ اب وہ تمام ناانصافیاں جو مدت مدید سے انسانیت کا خون کر رہی تھیں آج اُن سے نجات پانے کے لئے ہر طرف سے صدائیں آ رہی ہیں اور دُنیا کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی ہیں کہ ایک زمانہ کے پروردہ مظالم اور ناانصافیوں کی کیوں کر اصلاح کی جاتی ہے۔ جس آرام وسکون کے لئے ہر انسان اس قدر بےچینی سے انتظار کر رہا تھا آج بھی کہیں نظر نہیں آتا اور نہ ایک عرصہ تک کوئی امید ہے۔ جنگ کو فتح کرنا دشوار تھا لیکن امن وصلح کو قائم کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہو گیا۔

اس مضمون سے میرا مقصد یہ ہے کہ دُنیا کی معاشی حالت پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ صحیح طور پر دُنیا کے تمام علائل سمجھ میں آجائیں اور یہہ بھی ظاہر ہو جائے کہ ان کا ازالہ دائمی اور موثر طریقہ پر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ دُنیا کی معاشی صورت حال یقیناً اصل راہ سے دور جا پڑی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ روز بروز بدتر ہوتی جاتی ہے، چنانچہ اگر جلد سے جلد اس حالت کی اصلاح نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ بُرے سے بُرے نتائج ظہور پذیر ہوں گے اور دُنیا تباہ ہو کر رہے گی۔ یہ الفاظ یقیناً سخت ہیں لیکن اگر صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تو واقعات خود ان الفاظ کی تصدیق کریں گے۔

لارڈ مارلے نے ایک مرتبہ فرمایا تھا" کہ معاشی معاملات میں قوانین غلط طریقہ پر بنے جاتے ہیں جس کا اثر جماعت کی زندگی اور اس کے رگ وریشہ تک میں سرایت کر جاتا ہے۔ معاشی قوانین میں کبھی کوئی فریب نہیں ہوتا۔ دُنیا کے ہر ملک کی اقتصادی حالت نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس

ہر اس چیز کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ جس کو انسان عزیز رکھتا ہے اور جس کے لئے وہ گراں سے گراں معاوضہ دینے کو تیار ہے۔ اس لئے ان مسائل کا جو آج درپیش ہیں فوراً حل کرنا ضروری بلکہ ناگزیر ہے، یہ امید کی جاتی ہے کہ تدبر اور تدبر سے زیادہ نیک نیتی آج دنیا سے بالکل مفقود نہیں ہے۔ اور انشاء اللہ اسی کی وجہ سے دنیا میں حقیقی صلح اور امن قائم ہو جائے گا۔ تمام دنیا میں ہر طرف سے اسی کی پکار ہے۔ خدا ان آرزوں کو جلد پورا کرے!

معاملات کو سمجھنے کے لئے ہم پہلے دنیا کی موجودہ معاشی حالت پر ایک نظر ڈالیں گے اور اس کے خصوصی پہلو جو غور طلب ہیں اُن کی تقسیم حسب ذیل سرخیوں پر ہو سکتی ہے:-

(الف)۔ مالی حالت | جنگ عظیم محض ایک مالی جنگ تھی اور شروع ہی میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ جس کے پاس زیادہ سے زیادہ خزانہ ہوگا اُسی کی آخر فتح ہو گی۔ محاربین کا مجموعی خرچہ جنگ یومیہ چالیس ملین پونڈ تھا اس کے معنی یہ ہوئے کہ جنگ کو ساڑھے چار سال تک جاری رکھنے کیلئے اتنا بڑا افارونی خزانہ موجود ہو جس کا جمع کرنا دنیا کی دولتمند سے دولتمند ممالک کی قوت سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے جنگ کو جاری رکھنا تھا اور ہر ملک یہ سمجھتا تھا کہ اس کے لئے صرف دو ہی راہیں کھلی ہیں یا موت کی یا فتح کی، اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا، چنانچہ ایسی نازک حالت میں جبکہ حیات وممات کا سوال پیش تھا کوئی قربانی اس کے لئے زیادہ نہ تھی اور کوئی بھی طریقہ کار جائز ہو یا ناجائز اسوقت اختیار کیا جا سکتا تھا، جنگ کے لئے بہرحال روپیہ کی ضرورت تھی، اگر جائز طریقوں سے ناکامی ہوئی تو جنگ کو فتح کرنے کے لئے حکومتوں کو دوسرے ذرائع لا محالہ اختیار کرنے پڑے، غرض اس طرح قریب قریب ہر ملک میں نہایت ہی غیر محتاط نظام مالیات کی ابتدا ہوئی، مزید زر پیدا کرنے کے لئے مطبع کام میں لائے گئے اور لاتعداد کاغذی زر جنگی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ مزید براں تمام حکومتوں نے زیادہ اپنے خزانہ سونے اور چاندی سے ہر وقت پُر رکھنے کے لئے غیر ممالک سے بڑے بڑے قرضہ لئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ملک میں مصنوعی زر ضرورت سے زیادہ ہو گیا، اور اُس کے مقابلہ میں دولت اور کاروبار زر میں جس پر اُس کی قدر مبادلہ کا

انحصار ہے بجائے زیادتی کے کمی ہوتی گئی۔ اس قسم کے مصنوعی اور ضرورت سے زیادہ زر کے اجراء سے کبھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا، ممکن ہے کہ عارضی طور پر کسی ایک طبقہ کو اس سے کچھ نفع پہونچ جائے لیکن بالآخر ملک کی مجموعی اور اصلی قوت خرید میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے، کہ زر کی ہر اکائی کی قوت خرید کم ہوجاتی ہے۔ یہ ناجائز قرضہ غیر متبدل کاغذی زر دیکر زبردستی وصول کیا جاتا ہے، اور شاید تمام جبری قرضوں میں بدترین قسم کا قرضہ یہی ہے۔ زر کی تعداد بڑھانے کی ذمہ داری تمام محارب ممالک پر عائد ہوتی ہے اور باوجود مسٹر لائڈ جارج کے اعلانات کے جب انھوں نے دارالعوام میں یہ یقین دلانا چاہا تھا کہ "انگلستان نے ازدیاد زر کے اس سراب کی جانب ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جس میں پڑکر یورپ اب تباہ ہونے والا ہے" کافی ثبوت اور دلائل موجود ہیں کہ انگلستان بھی ازدیاد زر میں گرفتار ہے حالانکہ یہ بھی ساتھ ہی ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگلستان نے اپنے یہاں نظام زر کو فوراً ہی درست بھی کرلیا۔

اس تمام قمار بازی کا نتیجہ ضروری تھا کہ جلد ظاہر ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ حقیقی نظام زر کو ان اصولوں پر چلایا جاتا۔ ہر ملک میں نظام زر درہم برہم ہوچکا تھا، زر کی قیمت گرتی جاتی تھی اور اس کی قوت خریداری میں ایک عام کمی واقع ہوگئی تھی، قدر زر کا مسلسل گرتے رہنا زر کی قیمت ہی سے یکقلم انکار کرنے کے برابر ہے۔ زر طلائی جس کی وجہ سے مختلف ممالک کے نظام زر میں معاشی رشتہ نہایت ہی موزنیت سے قائم تھا ایک ایک کرکے چھوڑ دیا گیا اور اس کی بجائے کاغذی زر کا ایک غیر معین نظام قایم کیا گیا جو نہ تو ایک طرف زر طلائی سے کوئی مناسبت رکھتا تھا نہ دوسرے ممالک کے زر کاغذی سے جدید کاغذی زر کے معیار بالکل جدا گانہ تھے اور ایک دوسرے سے بالکل غیر متعلق اس لئے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ حشر ہوا، نظام مبادلات خارجہ کو اس سے بہت بڑا نقصان پہونچا۔ چنانچہ جرمن "مارک" کی تباہی صرف جرمن ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کی معاشی زندگی کا سنگین ترین حادثہ ہے تجارتی اور صنعتی کاروبار کی جائز ترقی

قدر مبادلہ کہ تنزلزل کی حالت میں غیر ممکن تھی، چنانچہ اس کے بجائے تخمینی اور قمار بازی شروع ہوگئی بعض لوگوں نے بیٹھے بیٹھے لاکھوں روپیہ تخمین بازی سے پیدا کرلئے، لیکن اصل تجارت کو حد سے زیادہ نقصان پہونچا موجودہ صورت حال ایک سرکاری مراسلہ میں اجمالاً یوں بیان کی گئی ہے۔

"۱۔ بحساب جنس زر کی قیمت ہر ملک میں گر گئی ہے۔ ۲۔ اکثر ممالک میں زر کی قیمت بحساب طلائی زر بھی گھٹ گئی ہے۔ ۳۔ زر طلائی کی قیمت بھی بحساب جنس گھٹ گئی ہے۔ ۴۔ بعض ممالک مثلاً جرمنی میں زر کی ملکی اور بیرونی قیمت میں بحساب جنس بہت تفاوت ہے۔ ۵۔ ہر جگہ نظام زر کی درہمی برہمی تجارت کے سر نو تعمیر میں حارج اور سد راہ ہو رہی ہے۔ بعض ممالک میں جن اسباب کی وجہ سے نظام اشتراکی اور معاشی کی یہ حالت ہے ان میں سب سے جزیہی ہے۔"

غرض تمام دنیا کے نظام زر کی یہ نازک حالت ہے، اب ہم اس صورت حال کے دوسرے جزو پر توجہ کرتے ہیں۔

(ب) محدود پیدائش ازدیاد زر کے ساتھ ساتھ جنس کی رسد میں بے حد تخفیف واقع ہوتی ہے اور اس کے اسباب بالکل صاف اور ظاہر ہیں، اس لئے کہ یورپ آج بھی ایک مسلح چھاؤنی کی مانند ہے۔ جنگ عظیم ختم ہوگئی لیکن اس کی بجائے یورپ اور ایشیا کے مختلف حصص میں چھوٹی چھوٹی مقامی جنگیں چھڑ گئیں۔ اور ایک عرصہ تک ایشیا کوچک، بلقان، روس اور ایشیائی روس محاذ جنگ بنے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ علاوہ مال اور محنت کے ضائع ہونے کے ان ممالک میں ایسی منتشر اور غیر منظم حالت پیدا ہوگئی جس سے پیدائش دولت کے لئے صنعت اور تجارت پر کوئی توجہ نہ ہوسکتی تھی مزدور جو کاروبار میں لگے ہوئے تھے فوجوں میں بھرتی کئے گئے اور جنگ پر بھیجدئے گئے، اگر جنگ نہ ہوتی تو یہی لوگ پیدائش دولت کے ذرائع وسیع کرنے میں مصروف رہتے۔ عمل پیدائش کے لحاظ سے روس عرصہ سے از کار رفتہ ہوگیا ہے عام فوجی بھرتی صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے، مہارت یافتہ مزدوروں کی محنت بیکار صرف ہوتی ہے۔ اہم ترین ضروریات زندگی کی پیدائش کے لئے محنت اور سرمایہ کی مانگ ہے لیکن

اس سے سامان جنگ تیار کیا جاتا ہے ، اس سب پر مستزاد یہ ہے کہ ہر ملک میں ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے جو اس جنگ عظیم کی وراثت ہے - یہ اور بھی عمل پیدائش میں حارج ہے، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش شروع ہوگئی ہے - جو ان دونوں کے لئے نیز تمام دنیا کے لئے فال بد ہے ہڑتالیں اور مزدوروں کی بیکاری روز کی بات ہوگئی ہے جس کے نتایج عموماً ہنگاموں اور بلووں کی صورت میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں - جم لدرکن کی صدائیں آج پھر ہمارے کانوں میں گونج رہی ہیں بن ٹلٹ نے عوام میں شہرت حاصل کی اور سورما بن گیا! مزدور آج شاہ بنے ہیں اور اپنی قوت کو محسوس کرتے ہوئے نظام سرمایہ داری کے خلاف تمام دنیا میں جد و جہد کر رہے ہیں ایک معمولی مزدور بھی ملک میں اپنی قوت رکھتا ہے، بن ٹلٹ نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ یہ لوگ باوجود اپنی ہیچمقداری کے اگر چاہیں تو تمام دنیا کا کاروبار بند کردیں، یہی لوگ جہازی بیڑہ کو کوڑہ کرکٹ کے برابر بنا سکتے ہیں، یہی لوگ جدید سے جدید کارخانوں کو بند کر سکتے ہیں نیز رفتار انجنوں کو بلکہ تہذیب و تمدن کی چلتی ہوئی گاڑی کو بھی روک سکتے ہیں -

علاوہ ازیں پیدائش محدود کرنے کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں، مسئلہ تاوان جنگ کو حل کرنے میں اتنی تاخیر پھر مارک، کرونے، نیز دوسرے مبادلات زر کی شکستہ حالی، فرانس کا جرمن علاقوں پر قبضہ، بالشویک اصول کی تمام دنیا میں ترویج و اشاعت، کسانوں کا ہر ملک میں سرمایہ داروں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا - یہ نیز دوسرے اسباب کا ملکر مجموعی اثر یہ ہوا کہ نصف دنیا آج جتنا صرف کرتی ہے اس سے کم پیدا کرتی ہے پھر یہ کونسی تعجب کی بات ہوگی اگر دنیا بھر میں ہلچل مچی ہوئی ہے -

قیمتوں میں اضافہ | جنگ سے قبل دنیا میں اجناس کی جتنی مجموعی تعداد تھی اسی کے لحاظ سے رسد زر بھی ہوتی تھی اس طرح مبادلہ میں توازن قایم رہتا تھا اور قیمتوں میں بھی ایک حد تک قرار رہتا تھا لیکن جب جنگ شروع ہوتی ، تو تمام ممالک نے نقد او زر حد سے زیادہ

بڑھادی جس کے اسباب ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں، اگر اجناس کی پیداوار اُتنی ہی رہتی جتنی جنگ سے پہلے تھی پھر بھی رسدِ زر میں غیر معمولی اضافہ مجموعی پیداوار کی نسبت سے بہت زیادہ تھا اور لامحالہ قدرِ زر کا گھٹنا اور قیمتوں کا بڑھنا ضروری تھا، لیکن اس پر مستزاد یہہ ہوا کہ زر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ پیداوارِ اجناس میں تخفیف ہوتی گئی، غرض جب رسدِ زر اُس سے کہیں زیادہ بڑھ گئی جتنا کہ کاروبار کے لئے درکار تھی اور اجناس کی رسد میں کمی ہو گئی تو قیمتوں میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ ازدیادِ زر ہی ایک بہت بڑی غلطی تھی لیکن اُس کے ضرر رساں نتائج کا ازالہ پیداوار میں برابر کا اضافہ کرنے سے ہو سکتا تھا کیونکہ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے زائد زر کو کام میں لگایا جا سکتا تھا، لیکن زمانہ کی تنگ نظری نے یہہ فراموش کر دیا کہ حقیقی دولت اور خوشحالی ازدیادِ زر سے نہیں بلکہ پیداوار سے ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب قیمتوں کے بڑھ جانے کے ہیں مثلاً جنگی کارروائیوں کی وجہ سے تجارتی جہازات میں کمی جس کی وجہ سے باربرداری کے اخراجات میں اضافہ ہو گیا۔ درآمد پر نیز آزاد تجارت پر ہر ملک میں بندشیں لگائی گئیں اور طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی مانگ اور اجرت بھی یکبارگی بڑھ گئی لیکن یہ تمام اسباب اُن دونوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

قیمتوں کے بڑھ جانے کے تمامتر نتائج ظاہر ہیں، یہ ایک قسم کا پوشیدہ ٹکس ہے غریب لوگ بھوکوں مر رہے ہیں متوسط درجہ کے لوگوں کے لئے گذر بسر کرنا بھی دشوار ہو گیا ہے، سب سے زیادہ افسوسناک حالت آسٹریا اور جرمنی کی ہے۔ جہاں پہنچکر افلاس اور غربت کی دردناک حالت آنکھوں سے دیکھی نہیں جاتی شیرخوار بچے دودھ کے ایک ایک گھونٹ کے لئے بلکتے ہیں، اور سن رسیدہ شدتِ گرسنگی سے گھُل گھُل کر مر رہے ہیں روس اور آسٹریا میں خدا کے لاکھوں بندہ ایک ایسے ہولناک قحط میں مبتلا رہے جس سے صرف موت ہی نجات دلا سکتی تھی۔ آسٹریا کی حالت تو اس قدر نازک اور ابتر تھی کہ شریف عورتیں اور نوجوان لڑکیاں خود اور اپنے بچوں کو مسلسل فاقہ کشی سے بچانے کے لئے عین پریشانی کی حالت میں خدا جانے کیا کیا کرنے پر

تہیں مجبور نہ ہوئیں! جرمنی بھی اس راستہ پر پھسلتا جا رہا ہے۔ ان حالات کو مدنظر رکھکر اگر کسی بات پر یقین کیا جاسکتا ہے تو صرف یورپ کے تاریک مُشکل مستقبل پر۔ اور خدانخواستہ اگر موجودہ صورت حال میں کوئی کایا پلٹ نہ ہوئی تو پھر نتیجہ ظاہر ہے۔

قومی بار| گذشتہ چند سالوں کے اندر ہی اندر قومی گراں باری بھی بہت بڑھ گئی ہے اور محاربین یورپ کے کل بیرونی قرضہ اگر روپیہ کے حساب سے شمار کئے جائیں تو حسب ذیل ہوں گے۔

سنہ ۱۹۱۴ء	۱۵،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ روپیہ
سنہ ۱۹۲۰ء	۴۶۵،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ 〃

آغاز جنگ کے بعد سے قرض عامہ کا اضافہ کل آبادی پر بحساب فی کس حسب ذیل ہوتا ہے۔

۱۔ ریاستہائے امریکہ	۴۳۲ روپیہ
۲۔ انگلستان	۲۳۶۲ 〃
۳۔ اٹلی	۱۰۹۵ 〃
۴۔ فرانس	۱۷۱۸ 〃

بین الاتحادی اور تاوانی قرضہ| بین الاتحادی اور تاوانی قرضہ کا مسئلہ دوسرے تمام مسائل سے زیادہ اہم اور مشکل ہے اس مسئلہ کے دو حصہ کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ جنگ کے لئے فرانس، بلجیم، اٹلی نیز دوسرے ممالک نے پہلے تو انگلستان سے پھر امریکہ سے بڑی بڑی رقمیں قرض لیں۔ لیکن امریکہ نے بعض حالات میں بغیر انگلستان کی ضمانت کے اتحادیوں کو قرضہ دینے سے انکار کیا، چنانچہ انگلستان پر امریکہ کا زیادہ تر قرضہ اس صورت کا ہے جو فرانس، اٹلی اور بلجیم کی طرف سے لیا گیا تھا۔ انگلستان کے خاص خاص قرضہ دوسرے ممالک پر جولائی سنہ ۱۹۲۲ء میں حسب ذیل تھے۔

فرانس	۵۵۷،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ
روس	۵۶۱،۰۰۰،۰۰۰ 〃

اٹلی	۴۷۶,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ	
بلجیم	۱۰۳,۰۰۰,۰۰۰ "	ان دونوں سے کوئی سود نہیں لیا جاتا ہے
سرویا	۲۲,۰۰۰,۰۰۰ "	

انگلستان کا مجموعی قرضہ جنگ اسی وقت ۱,۸۰۶,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ تک پہونچگیا تھا۔
اب دوسری طرف امریکہ کا جنگی قرضہ دوسرے ممالک پر حسب ذیل تھا۔

۱۔ بلجیم	۴۰۹,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر
۲۔ فرانس	۳,۶۳۴,۰۰۰,۰۰۰ "
۳۔ برطانیہ	۴,۵۷۳,۰۰۰,۰۰۰ "
۴۔ اٹلی	۱,۸۰۹,۰۰۰,۰۰۰ "
۵۔ پولینڈ	۱۳۵,۰۰۰,۰۰۰ "
۶۔ روس	۲۱۱,۰۰۰,۰۰۰ "

ان تمام قرضوں کی کل میزان ۱۱,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر ہوتی ہے۔

(۲) اتحادیوں نے جنگ فتح کی تھی اس لئے انھوں نے جرمن اور اس کے حلفاء سے اپنی ہی شرائط پر صلح کی جس میں تاوان جنگ کے نام سے بڑی بڑی رقمیں اُس سے طلب کیں۔ صلحنامہ ورسیلز پر ۲۸۔ جون ۱۹۱۹ء کو دستخط ہوئے تھے۔ اس صلحنامہ کی دفعہ ۲۳۲ کی روسے جرمنی نے تمام نقصانات کا معاوضہ یا تاوان دینے کا عہد کیا تھا۔ اسی دفعہ کی روسے ایک تاوانی کمیشن نقصانات کا اندازہ کرکے تاوانی رقم معین کرنے کے لئے نیز اس رقم کی جس کے اندر اندر ادائیگی کی صورتیں اور ذرائع تجویز کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اس صلحنامہ کی دفعہ ۲۳۵ میں ۱,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ کی رقم کا ابتدائی مطالبہ بھی کیا گیا تھا جس کی ادائیگی یکم مئی ۱۹۲۱ء تک جرمنی کو کردینا چاہیئے تھا۔

جرمنی سے وصول ہونے والی جملہ تاوانی رقم کے مختلف اندازہ کئے گئے ہیں، مسٹر کینز نے اتحادیوں کے مطالبات کی بنا پر اس کا اندازہ ۸,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ کیا ہے۔ برخلاف اس کے

موسیو کلائزنے ....۱۵ پونڈ اندازہ کیا ہے۔ بہرحال مجموعی رقم کے متعلق بالآخر جو فیصلہ ہوا ظاہر ہے کہ اتحادیوں نے نہایت بیدردی سے زیادہ سے زیادہ مطالبات کا بوجھ جرمنی پر ڈالدیا۔ مسٹر لائڈ جارج نے فرمایا تھا کہ جرمنی زیادہ سے زیادہ جتنا برداشت کرسکتی ہے اُتنا تاوان جنگ اُس سے لیا جائیگا، لیکن مسٹر ایرک گڈیز اس معاملہ میں سب سے بڑھ گئے جب اُنھوں نے گلڈ ہال کیمبرج میں تقریر کرتے ہوے فرمایا کہ "ہم جرمنی کو اتنا دبوچینگے کہ تم لوگ اُس کی چیخ پکار سنوگے۔ ......ہم اُس کو صفحۂ ہستی سے اسی طرح مٹائیں گے جیسے اُس نے بلجیم کو مٹانا چاہا تھا۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ انگلستان نے اپنا معاندانہ طریق عمل چھوڑ دیا اور ذمہ دار اصحاب کے رویہ میں بہت کچھ تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اب قبل اس کے کہ ہم اصل مسئلہ پر توجہ کریں، ایک معاملہ کو فوراً واضح کردینا ضروری ہے۔ وہ یہہ کہ امریکہ نے یکبارگی انگلستان سے اپنے تمام قرضہ کا مطالبہ کردیا۔ اس واقعہ نے انگلستان کو مجبور کیا کہ وہ بھی اتحادیوں سے اپنے قرضہ کا مطالبہ کرے۔ اس میں شک نہیں کہ امریکہ اپنے ایک جائز حق کا استعمال کر رہی ہے۔ لیکن یہ کہاں تک درست ہے کہ ایک حصہ دار تو اپنا پورا قرض وصول کرے اور دوسرے کو جتنا قرض لیا تھا وہ تو دینا پڑے اور جو دیا تھا اس میں سے ایک پائی وصول نہ ہو۔ اور خاصکر ایسی حالت میں جب برطانیہ کے ذمہ امریکہ کے قرضہ کا زیادہ تر بار وہ ہے، جو فرانس اٹلی اور بلجیم کی طرف سے لیا گیا تھا۔

غرض اس معاملہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد سلسلہ کی تمام کڑیاں ترتیب پاگئیں۔ چونکہ امریکہ انگلستان سے ادائگی کا مطالبہ کر رہا ہے اس لئے انگلستان فرانس سے مطالبہ کرتا ہے اور فرانس جرمنی سے تاوان جنگ کی ایک ایک پائی تک وصول کرنے پر اڑا ہوا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ جرمنی کا تمام نظام معاشیات غیر معمولی اور انتہائی گرانباری کی وجہ سے تباہی کے مُنھہ میں ہے۔

مسٹر کینز نے فرانس کی حالت کا بہترین خاکہ کھینچا ہے، اُن کے نزدیک فرانس جانتا ہے کہ گذشتہ جنگ میں معاشی قوت کا ایک طریقہ پر امتحان تھا۔ محض امریکہ اور انگلستان کی مدد سے وہ کامیاب ہوسکتا تھا، لیکن یہہ آخری جنگ نہ تھی اور اس کے بعد اور بھی جنگیں یقینی طور پر ہونوالی

ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ بھی اس کو انگلستان اور امریکہ کی مدد ملیگی - جرمنی کی آبادی بڑھتی جاتی ہے اور فرانس کی آبادی دوسری طرف گھٹتی جا رہی ہے - جرمنی اپنے سازوسامان، کی بنا پر بہت ممکن ہے کہ جلد ہی اُٹھ کھڑا ہو اور فرانس کے خلاف تیغ انتقام بے نیام کرے - چنانچہ فرانس کو اسی کا خطرہ ہے اور اُس سے محفوظ رہنے کے لئے سامان کرنا چاہتا ہے - اسی غرض سے ایک طرف وہ جرمنی کی تجارت اور صنعت و حرفت کو بالکل تباہ کرنا چاہتا ہے، دوسری طرف معاشی ذرائع کو توڑنا چاہتا ہے، اور پھر تاوان جنگ کی ایک ایک پائی مار کر وصول کرنا چاہتا ہے -

لیکن ایک لمحہ کے لئے ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیئے، کہ جرمنی اتنی بڑی تاوانی رقم ان حالات میں کیوں کر ادا کر سکتا ہے - ؟ تین ہی ذرائع اس کی ادائیگی کے ہو سکتے ہیں خدمات سے یا طلائی زر سے یا سامان سے - ان کے علاوہ کوئی اور چوتھا ذریعہ نہیں نکل سکتا، اب ہم ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ نظر ڈالیں گے -

(۱) جہاں تک خدمات کا تعلق ہے، انگلستان تو اُس سے کچھ بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اور فرانس کو اس حالت میں دو اہم مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا - اوّل یہ کہ اس کی وجہ سے بیکاری فرانس میں اور بڑھ جائیگی دوسرے یہ کہ اگر جرمن مزدوروں کو فرانس میں کام پر زبردستی مجبور کیا گیا تو ایک طرح پر ہم لوگ ایسے نظام کا دوبارہ آغاز کریں گے جو غلامی کی محنت سے بہت مشابہ ہے، اور اُس میں یہ خطرہ بھی ہے، کہ یہ مزدور ہمیشہ اپنے مخالفانہ طرز عمل سے ہڑتالیں اور دوسری اشتعال انگیز حرکتیں کرتے رہیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ فرانس کو ایک اور فوج ان مزدوروں سے کام لینے کے لئے مقرر کرنا پڑے گی -

(۲) اس وقت جرمنی میں زر طلائی کی مقدار کاغذی زر کے صرف ایک فیصدی کے قریب ہے تو اُس سے مارک کی رہی سہی قیمت بھی ختم ہو جائے گی جس سے تمام یورپ (جس میں فرانس بھی شامل ہے) کے معاشی نظام پر بہت برا اثر پڑے گا -

(۳) تیسرا ذریعہ سامان یعنی ملکی مصنوعات اور دیگر اجناس کی برآمد سے ادائیگی کا ہو سکتا

ہے۔لیکن اس میں اور بھی اہم دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً اگر جرمنی اپنا تمام قرضہ فاضل سامان برآمد سے ادا کرنا چاہے تو اُس کے پاس اتنا سامان کہاں موجود ہے ؟ چار سال تک سخت جنگ میں مبتلا رہا جس کے دوران میں اُس پر طرح طرح کی معاشی مشکلات کے پہاڑ ٹوٹے اب حالت یہ ہے، کہ اگر بالفرض درآمد بالکل بند کردی جائے اور اتحادی اُس کی تمام برآمد پر بھی قابض ہو جائیں پھر اُس سے تاوانی قرضہ کی ادائیگی ناممکن ہے۔

لیکن اگر بغرض استدلال تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ جرمنی مزدور زیادہ سامان تیار کرنے پر مجبور کئے جاسکتے ہیں جس سے برآمد بڑھ جائیگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمنی اپنے سامان کو انگلستان اور فرانس کے مقابلہ میں کم قیمت پر تیار کرے گا اور تمام دُنیا کے بازاروں میں انگلستان اور فرانس کے مقابلہ میں کم قیمت پر فروخت کرے گا۔ اس طرح اُن کی بیرونی تجارت معرض خطر میں آجائے گی۔ اب اگر اتحادی جرمنی کو آخری الذکر طریقہ پر قرضہ ادا کرنے کے لئے مجبور کریں گے تو تجارتی نقصان اُنھیں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ ابھی سے انگریزی مالکین معدنیات نے جرمنی کوئلہ کی درآمد کے خلاف احتجاج اور شورش برپا کردی ہے اور جب ٹائمز نے یہ تجویز پیش کی کہ تاوان کی مد میں انگلستان میں تعمیرات کا کام جرمنی کے ذمہ کردیا جائے تو انجنیروں کی انجمن نے فوراً اس کے خلاف احتجاج کیا۔ پیرس کے ایوان تجارت نے بھی یہی طرز عمل حکومت کے خلاف اختیار کیا اور معاہدہ وسباڈن سے گوکہ ایک حد تک مالی مفاد کی امید تھی لیکن اس سے فرانس کی صنعتی اور حرفتی ناقابلیت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا اس لئے اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ غرض ماحصل یہ ہے کہ جرمنی کو تاوان ضرور ادا کرنا پڑیگا لیکن اس کو اُس ذریعہ سے ادا کرنے نہ دیا جائیگا جس ذریعہ سے وہ صرف ادا کرسکتا ہے۔

اس کے بعد پھر وہ مشکلات ہیں جو محصولات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ قریب قریب تمام ممالک نے غیر ملکی مال پر محصولات لگادئے ہیں، اس میں امریکہ، انگلستان اور فرانس سب ایک طریق عمل ہے اس کے وجوہات بھی ظاہر ہیں، اول دیسی تجارت کی حفاظت دوسرے جنگ

لی وجہ سے حکومتوں کے اخراجات میں حد سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اُس نے مالیات
یں توازن قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے، کہ ہر ممکن ذریعہ سے روپیہ فراہم کیا جاے۔ انگلستان
صنعتوں کی حفاظت کا ایک قانون پاس کیا ہے، اس کا مقصد سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ جرمنی کا سامان انگلستان میں آنے نہ پائے

اب ظاہر ہے کہ اتحادیوں کے طریق عمل میں کس قدر بے ربطگی پائی جاتی ہے، معلوم ہوتا ہے
اُن کو اپنی صحیح حالت کا خود اندازہ نہیں ہے ایک طرف تو جرمنی سے قرضہ کی ادائگی کا مطالبہ کرتے ہیں
رمنی صرف سامان سے ادا کر سکتا ہے، لیکن جرمنی مال پر بڑے بڑے محصولات لگائے جاتے ہیں
در برآمد بند کی جاتی ہے۔ غرض اتحادیوں کی یہ مشکلات ہیں جس سے کوئی مفر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ
اوان اور زیادہ سے زیادہ محصولات کی حکمتیں دونوں غیر محکم ہیں جس کا نتیجہ صرف تباہی ہے۔ کیونکہ
ب تک تجارت آزاد نہ کروگے تاوان وصول نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تجارت آزاد کروگے تو جرمنی تم
ے مقابلہ کرکے تمہاری تجارت کو تباہ کردے گا۔

غرض ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟

آخر میں جرمنی کی قوت ادائگی کا سوال آتا ہے، بہت سی رائیں اس پر متفق ہیں کہ جرمنی میں
ائگی کی سکت باقی نہیں رہی امریکہ اور انگلستان میں اسی طرف رائیں پلٹتی جارہی ہیں مسٹر کینز
خیال ہے کہ برطانیہ بھی جو دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند ہے ۱۹۲۰ء میں یعنی اپنے عروج کے
مانہ میں بھی ان مطالبات کا صرف ایک تہائی ادا کر سکتا تھا جو آج جرمنی سے مانگا جاتا ہے۔ غیر
ملک میں جرمنی املاک کے قبضہ یا تاوانی دستاویزوں سے بھی ادائگی کی کوئی امید نہیں پھر
منی کیونکر اتنی بڑی رقم اتحادیوں کو نقصان پہنچائے ہوئے ادا کر سکتی ہے؟

ممکن علاج | یہاں تک ہم نے دنیا کی موجودہ صورت حال کے خصوص واقعات کو مفصل
یقہ پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم چند تدابیر بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جن پر عمل کرنے
ے اس صورت حال کو بدلا جا سکتا ہے اور دنیا کی معاشی اور اشتراکی زندگی بحال ہو سکتی۔

(۱) پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ آج دنیا جس چیز کی محتاج ہے وہ حقیقی اور عالمگیر امن ہے۔

چھوٹی چھوٹی مقامی جنگوں کا خاتمہ ہونا چاہیے ۔ اور وہاں کے اس پار جو کبھی کبھی تلواروں کی جھلکار اٹھتی ہے وہ بھی بند ہونا چاہیے ۔ صلح اور امن سے فوجی اخراجات گھٹ جائیں گے میزانیات میں توازن قایم ہو جائے گا ٹیکس میں تخفیف ہو جائے گی صنعت و حرفت میں کام کرنے والے مزدوروں کی بڑی تعداد کو فوجی خدمت سے آزادی ملیگی اور وہ مشاغل پیدائش میں لگ کر دنیا کی مجموعی پیداوار کو افزوں کریں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمتیں گھٹ جائیں گی اور اس سے لاکھوں بلکہ کروڑوں غریبوں کا فائدہ ہوگا ۔

انجمن بین الاقوامی واشنگٹن کانفرنس اور دوسری بین الاقوامی مجلسوں کو ایک قدم آگے بڑھانا چاہیے ۔ تاکہ دنیا کو موجودہ قومی اقتدار پسندی کے جنون سے نجات دلائیں ۔

(۲) تکثیر زر کو فوراً روکنا چاہیے ۔ کیونکہ بغیر اس کے تمام کوششیں بے سود ہوں گی قوانین اور قواعد کی رو سے مقرر کردہ قیمتیں وقتاً قائم نہیں رہ سکتیں اس لئے اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ ترویج زر میں استحکام پیدا کیا جائے ۔ تکثیر زر کی وجہ سے تمام حکومتیں آج دیوالیہ بن رہی ہیں ، اس کی وجہ سے قیمتیں بڑھ جاتی ہیں پھر مزید ضروریات کے مطابق مزید مصنوعی زر بنایا جاتا ہے ، اور اس طرح یہ سلسلہ قایم رہتا ہے چنانچہ آج اسی کی بدولت تمام دنیا میں قمار بازی کا دور دورہ ہے ،

تعداد زر گھٹانے کی اشد ضرورت ہے ، لیکن یہ ایکبارگی ناممکن ہے ۔ کیونکہ اس سے اور بھی برے نتایج کا اندیشہ ہے ؛ لیکن چند تجویزات جو اکثر مصنفین نے اس کے متعلق کی ہیں وہ اس موقعہ پر قابل ذکر ہیں :-

۱۔ بھاری ٹکس ۔ جس سے سلطنت کو ضرورت سے زیادہ آمدنی ہو جائے گی اور پھر سلطنت فاضل رقم کو ضائع کر سکتی ہے اور اس طرح زر کی تعداد کم ہو جائے گی ۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ بھاری ٹکس والے میزانیہ کسی جمہوری حکومت میں مشکل سے منظور کئے جائیں گے ۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے میزانیہ سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں کاغذی زر تقدر

۲۳ کروڑ روپیہ کو خایع یا ضایع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

(ب) بنک کی شرحیں بڑھا دی جائیں اور بنک کے قرضوں پر اور بھی بہت سی قیدیں لگا دی جائیں۔ گو اس سے قیمتیں گھٹ جائیں گی، لیکن اس سے تجارت اور صنعت کو بھی نقصان پہونچیگا (ج) کاغذی زر کو اگر پہلے کی نسبت سونے کی کم مقدار سے تبدیل کرنے کا قانون بنا کر تمام زر کی قدر گھٹا دی جائے۔

(د) ڈاکٹر کینن کی یہ تجویز ہے کہ کاغذی پونڈ اور دس شلنگ والے نوٹ جو خزانے نے اپنے فائدہ کے لئے تمام ممالک میں بھر دئے ہیں وہ سب جلا دئے جائیں، یہی تجویز مسٹر باس اور ہلس کی بھی ہے جو اس کو بھی پسند کرتے ہیں کہ تمام کاغذی زر چھکڑوں میں بھر کر جلا کر خاک کر دئے جائیں ۔

(ر) حکومتیں اپنے مصارف کم کریں تاکہ میزانیات میں کمی واقع نہ ہو۔ اور آمد و خرچ میں جو فرق ہے اس کو پورا کرنے کے لئے مزید زر نہ بنایا جائے۔

(س) اجناس کی پیدائش میں اضافہ ہو تاکہ کثیر زر کے استعمال کے لئے کام نکلے۔

(ش) معیار طلائی جلد سے جلد اختیار کر لیا جائے، اس میں کچھ دشواری ضرور ہوگی اور کچھ عرصہ بھی لگے گا لیکن یہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کوشش بیکار ہے کہ موجودہ کاغذی زر کا تناسب سونے کی قدر سے قائم کیا جائے۔

۳۔ مالیات میں توازن قایم کرنے کی پھر کوشش کرنا چاہئے۔ تاکہ قرضہ پر گزارہ نہ کرنا پڑے اور یہ حسب ذیل طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ کمی مصارف ۔ یہ ازخود ایک بہت بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ قومی مصارف فوراً کم کر دینا چاہئے۔ حکومتوں کو اس صورت حال سے نجات پانے کے لئے محض تجربہ کی خاطر

ایک حصّہ بھی اب نہ خرچ کرنا چاہئے۔ اس سے مشکلات بجائے کم ہونے کے بڑھجاتی ہیں۔
معمولی مصارف کے لئے جس میں قرضہ کی ادائیگی بھی شامل ہے معمولی آمدنی پر قناعت کرنا چاہئے
(ب) حکومتوں کو اس طریق عمل کو چھوڑنا چاہئے جو عموماً اصل معاش حالت کو عوام الناس
سے پوشیدہ رکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً مصنوعی طور پر سامان خور و نوش
اور کوئلہ وغیرہ کی ارزانی جو محض دکھلانے کے لئے اصل قیمت سے کم پر فروخت کیا جاتا ہے
یا بیکاروں کے لئے گذارہ مقرر کرنا جس سے صنعت و حرفت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور ریل
کا کرایہ کم کرنا یا ڈاکخانہ کی شرحیں گھٹا دینا جس سے اصل قیمت بھی وصول نہیں ہوتی۔
(ج) مزید ٹیکس سے آمدنی بڑھانا چاہئے اور اسی سلسلہ میں اس دولت پر جو جنگ
کی وجہ حاصل کی گئی ہے اُس پر ایک خاص ٹیکس لگانے کا مسئلہ بھی قابل غور ہے۔

۴۔ آزاد تجارت کے اصول کو اختیار کرنا چاہئے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ چونکہ بغیر اس کے قیمتوں
میں تخفیف کی کوئی صورت نہیں، یہ طریق عمل نہایت خطرناک ہے کہ شکستہ خوردہ دشمنوں کو دنیا کی تجارت
میں کوئی حصہ نہ لینے دیا جائے، جرمنی اپنی جغرافی حدود سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اور دنیا اس
کو کسی حالت میں فراموش نہیں کر سکتی ہے۔

۵۔ آخر میں سب سے زیادہ اہم تجویز یہ ہے کہ تمام بین الاقوامی قرضہ منسوخ سمجھے جائیں
اور تاوانی قرضہ پر نظر ثانی کی جائے، غیر طے شدہ مسائل کبھی اقوام کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے، اور یہ
مسئلہ اس لئے سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر اس کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا تو قومی مشکلات کا ایک نیا باب
کھولا جا رہا ہے جس کا خمیازہ ایک دوسری اور سخت ترین جنگ کی صورت میں دنیا کو بھگتنا پڑے گا جرمنی
جو آج بالکل دیوالیہ ہے اپنے بار کو ناقابل برداشت سمجھ کر اور ادائیگی کی کوئی صورت نہ نکلنے کی حالت
میں کہیں تیغ آزمائی پر نہ مجبور ہو جائے وہ خود تو ڈوب رہا ہے۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ کہیں اپنے

ساتھ تمام دنیا کو نہ لے ڈوبے۔ وہ روس سے ملکر اگر بالشویک ہوجائے تو اپنے تمام قرضہ سے یکقلم انکار کردے گا۔ جنیوا کانفرنس واقعتاً خدا کی طرف سے اتحادیوں کو ایک تنبیہہ ہے۔ فرانس جو یورپ کا آج جانی دشمن ہے اس کی تعمیر بھی انقلاب پر ہوئی ہے؛ اور یورپ کو آج بھی وہ شعلہ یاد ہوں گے جو انقلاب فرانس نے تمام دنیا میں مشتعل کردئے تھے۔ فرانسیسی حکومت نے ۲۲۔ دسمبر ۱۷۹۲ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ جمہوری حکومت اُن معاہدوں پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں ہے، جو ظالم اور جباروں سے کئے گئے تھے۔ پھر کیا ہوگا۔ اگر جرمنی اور آسٹریا روس سے ملجائیں اور اسی جمہوری اصول کی تقلید کریں؟ اُس وقت اتحادیوں کے لئے صرف ایک راہ کھلی رہ جائیگی کہ وہ غنیم کے علاقوں پر ایک غیر معین وقت تک قبضہ کئے رہیں۔ لیکن کیا اتحادی اس قابل ہیں کہ ایسا کرنے پر تیار ہو جائیں تاریخ اس کا صرف ایک جواب دسکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سے یورپ کا خاتمہ جلد تر ہو جائے گا۔ قومی قرضوں سے انکار کی یہ پہلی مثال نہ ہوگی۔ اتحادیوں نے اس پر پہلے عمل کیا ہے۔ فرانس نے انقلاب کے زمانہ میں اُس کے بعد امریکہ کی بہت سی ریاستوں نے بھی گذشتہ صدی میں یہی کیا۔ چنانچہ روسی مراسلہ جو اتحادیوں کے سامنے جنیوا میں پیش کیا گیا تھا اُس میں اس طرف بھی نہایت پر زور الفاظ میں اشارہ کیا گیا تھا۔" کہ فرانسیس کنونشن منعقدہ ۱۷۹۲ء کے مطابق فرانس نے ان تمام عہد ناموں کو صرف چاک ہی نہیں کیا جو شاہان فرانس نے دوسرے ممالک سے کئے تھے۔ بلکہ قومی قرضوں سے بھی صاف انکار کیا تھا"

غرض یورپ کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ ہر ملک میں بےچینی پھیلی ہے۔ تاریخ بنی نوع انسان کے اس نازک ترین وقت میں کونسی تدبیر اصلاح کی کیجاسکتی ہے؟ یورپ کی تمام قوموں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کیا یہ توقع بیکار ہے کہ امریکہ اس حالت میں یورپ کی رہنمائی کرے گا۔ بین الاقوامی قرضوں کو منسوخ کردینا گویا کہ اخراجات جنگ کی دوبارہ تقسیم ہے

اس سے ان اقوام کا بار بڑھ جائے گا جنھوں نے سب سے زیادہ قرض دئے تھے، یہ ایک طرح کا زائیڈنکس ہوگا۔ اور چونکہ انگلستان اور امریکہ نے سب سے زیادہ قرض دیا تھا۔ اس لئے اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان ممالک نے جنگ کے سب سے زیادہ اخراجات برداشت کئے۔ لیکن تاریخ عالم میں یہ واقعہ بے نظیر نہ ہوگا۔ اس سے پہلے خود انگلستان نے جنگ نپولین کے بعد اپنے تمام اتحادی قرضہ کو منسوخ کردیا تھا۔ اب یہ امریکہ کی باری ہے، کہ وہ یورپ کو ہولناک موت سے بچا سکے آج یورپ امریکہ کی کفالت کا محتاج ہے۔ تاکہ دوبارہ امن قایم ہو۔ امریکہ کی دولت وثروت آج دنیا میں ضرب المثل ہے۔ اس دنیا کو گرداب مصیبت سے نکال بھی سکتا ہے۔ روس سے تہذیب تمدن کا خمیازہ نکل چکا، جرمنی کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ آسٹریا کی حالت اس سے بھی بدتر پھر کیا امریکہ کی جمہوری حکومت "ایک پونڈ گوشت" کے لئے دنیا کو اس خطرہ میں پڑا رہنے دیگی سمجھوتا کرنا زندگی کا اصول ہوگیا ہے۔ اور دُنیا جانتی ہے کہ فرانس اور امریکہ کیا کریں گے اون کی ذمہ داریاں خدا اور بندہ دونوں کے سامنے اہم ہیں تو کیا یہ روس۔ جرمنی اور آسٹریا کو اُنکی قسمت پر چھوڑ دیں گے، یا اون کی مدد کریں گے کہ وہ پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔

اتحادیوں نے جنگ تو فتح کرلی لیکن اب صلح اور امن کون قایم کرے گا؟

(ترجمہ)

شفیق الرحمٰن قدوائی
متعلم جامعہ

یورپ کس طرف جارہا ہے

صلح ہوئے پانچ چھ برس ہونے کو آئے، لیکن دنیا اس کی برکتوں سے اب تک محروم ہے
پہلے دنیا کو ایک خطرہ تھا۔ مگر اب ایک نہیں، دس خطرے ہیں حق اور آزادی۔ جس کے لئے جنگ کی آگ
بھڑکائی گئی تھی، وہ اب بھی اسی طرح روندے جارہے ہیں، اور ان پاؤں سے روندے جارہے ہیں
جنہوں نے ان کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جنگ سے پہلے دنیا جس لعنت میں مبتلا تھی، جنگ کے
بعد، ہزاروں لاکھوں کا خون بہا کر بھی ان ہی لعنتوں میں مبتلا ہے۔ اور کوئی صورت نہیں کہ یہ ابتلا کم ہو۔
کمزور قومیں غلامی کے اندیشہ سے رعشہ بر اندام ہیں، اور قومی جماعتیں ملک گیری کے جنون سے دیوانی
توازن کا مسئلہ حقوق فطری کی نگہداشت کی ضرورت، یہ ایسے خوشنما جال ہیں جو اب بھی بچھائے جائیں
گے، اور حق و آزادی کا نام لیکر شیاطین دولت دنیا کو اپنی حرص و آز کے جہنم میں ڈھکیلینگے۔ کرۂ
ہوائی جنگ کی آتشناکیوں سے اب تک شعلہ بدامن ہے، زمین کا دل فوج کے لاؤلشکر، اور توپوں کے
دھماکوں سے اب بھی کانپ رہا ہے، اور انسانی روحیں امن و اطمینان کے لئے مضطرب و
بیقرار ہیں۔ لیکن عمالی کے دجال کی بھوک تیز سے تیز تر ہورہی ہے، دولت کا شیطان حق و
آزادی، امن و انصاف کا دشمن ہے، اس کو چین کی نیند سونا پسند نہیں، جنگ کے دہکتے
انگاروں پر لوٹنا پسند ہے۔ وہ روحوں کی پکار نہیں سن سکتا، رانڈوں کا آہ و نالہ اس کے
لئے نغمۂ راحت ہے، اور یتیموں کا گریۂ ماتم ساز ترنم، ہوائیں کہہ رہی ہیں کہ عنقریب وہی
مصیبتیں پھر ٹوٹنے والی ہیں جن کا ایک چھوٹا سا پہاڑ ۱۹۱۴ء کے اوائل میں ٹوٹا تھا، اور چشم فلک
یکبار اس ہلاکت کا تماشا دیکھنے والی ہے، جو ایک عرصہ کے لئے روئے زمین سے نسل
انسانی کا خاتمہ کردے گی۔ موت کا فرشتہ سب کو خون آلودہ نیندیں سلادے گا۔

دوستو! یہ محض الفاظ کا زور ہی زور نہیں ہے، بلکہ واقعات و حقائق کا بیان ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کی پیچیدگیاں، جنگی تیاریاں حربی اختراعیں، اور ملک گیریوں کا جوش اس بیان کا بنیادی مسالہ ہیں۔ یورپ سے لیکر امریکہ تک سب کے قوائے دماغی یہی کام کر رہے ہیں حکومتوں کی مشینیں گولہ بارود کے سوا کوئی کام نہیں۔ مزدوروں کو ملوں کی سرمایہ داروں کو تجارتی میدان کی فکر میں ہیں، اور وزارتیں رات دن یہ خواب دیکھتی ہیں کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ انسانی جماعتوں پر حکومت کریں۔

اس صحبت میں ان خوابوں کی تعبیروں کا صرف ایک حصہ پیش کرنا ہے۔ یہ حصہ اختراعات حربی کا ہے، اہمیت کے لحاظ سے یہی سب سے بھاری ہے۔ باقی حصے کسی آئندہ صحبت میں پیش کئے جائیں گے۔

ابھی تھوڑا عرصہ ہوا، ایک حکومت کے ایک کمیشن نے حربی آلات کی ایجادوں پر ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ کے انعامات تقسیم کئے ہیں۔ ان میں چالیس ہزار پونڈ صرف دو قسم کے بموں کا انعام ہے جن کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ایک ایک بم ایک پوری بستی کیلئے کافی ہوگا چند خاص ایجادوں کے انعاموں کی تفصیل بھی سن لیجئے۔

ایئر پلین پر	۴۰۰۰۰ پونڈ
زیپلین پر	۳۰۰۰۰ "
شب پرواز پر	۵۰۰۰ "
لائم پرگی نٹ پر	۱۲۵۰۰ "
آبدوز پر	۲۶۰۰۰ "

جس آبدوز پر انعام دیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ دنیا میں یہ سب سے بڑی اور سب سے اچھی قسم کی آبدوز ہے۔ اس کی رفتار بہت تیز ہے، اس پر سے ۱۲ انچ دہانہ کی توپ فیر کی جائے گی بم کے گولے بھی پھینکے جائیں گے، اور پانی میں غائب ہو کر اتنی گہری چلی جائے گی کہ آبی دوربینیں بھی نہیں دیکھ سکیں گی۔

اسی حکومت نے ایک ٹینک بھی بنوایا ہے۔ اور اس کے بنانے والے کو کئی ہزار پونڈ انعام دینا تجویز کیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ خشکی اور تری دونوں میں یکساں کام دیگا۔ اس کا طول ۱۵ اور عرض ۶ فٹ ہے۔ اس میں ۵، بیلی میٹر کی توپ لگائی جائے گی۔

اب تک ہوائی جہازوں میں یہ نقص تھا کہ وہ فضا میں قایم نہیں رہ سکتے تھے، جس سے کوئی مستقل کام نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اب کئی کئی منٹ ٹھیر سکتے ہیں۔ ایک طیارچی نے ایک ایسا پرزا بنایا ہے۔ جس سے جہاز قابو میں رہے گا، اور ٹھیرانے سے زمین پر گریگا نہیں حکومت نے اس ایجاد پر ۲۴۵۰۰۰، اور مختلف کمپنیوں نے ۱۰۰۷۵ پونڈ صلہ دیا ہے۔ اب تک ہوائی جہازوں کی زیادہ سے زیادہ قوت ۱۰۰ گھوڑوں کی تھی، لیکن اب ایسے ہوائی جہاز بنائے جارہے ہیں، جن کی قوت ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر ۴۰۰ گھوڑوں کی ہوگی، ان کی رفتار کا اندازہ ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کیا گیا ہے، پچاس آدمی معہ سامان حرب کے بیٹھ سکیں گے، ۴۴ میل میٹر کی توپیں بار کی جائیں گی، اور فضا میں جہاز کو قایم کرکے بآسانی بمباری کی جاسکے گی۔ جہازوں کو غیر مرئی بنانے کے لئے ایک شفاف دھات کے غلاف بھی طیار کئے جارہے ہیں، جن کی وجہ سے دیکھنے والے جہازوں کو نہیں دیکھ سکیں گے اور وہ بیٹھے بٹھائے، خاص خاص دہانوں میں سے اپنا کام کرتے رہیں گے۔

پرانے قصوں میں جو "ازغیبی گولہ" سنا تھا، کہیں یہ وہی تو نہیں ہے؟

اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ ہوائی قوت فرانس کی ہے۔ اور حکومتیں اس بارے میں اس سے بہت کمزور ہیں، اور اس کے مقابلہ کی طیاریوں میں ہمہ وقت سرگرم۔ لیکن سطور بالا میں جس ہوائی قوت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ فرانس کی نہیں ہے، اس کے حریفوں کی ہے۔

ہزیمت خوردہ جرمنی کو اس کے مربیوں نے ہوائی جہاز بنانے سے روک دیا تھا۔ لیکن اب اس نے ایسی کلیں بنائی ہیں، جن کی مدد سے انسان پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ سکتا ہے ہاتھ بالکل آزاد رہتے ہیں، اور دیکھنے سے یہ اڑنے والے انسان غیر پرند نہیں معلوم ہوتے۔ اس نے ایک اور

مشین بھی بنائی ہے، جو ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتی ہے اس میں خوبی یہ ہے کہ جوڑ جوڑ علیحدہ ہے، ۱۵ منٹ میں ٹوٹ کر تہہ ہوجاتی ہے اور اتنی مختصر ہے کہ سارا سامان پانچ چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں سما جاتا ہے۔

امیر البحر سر پرسی اسکاٹ نے "پیرسن میگزین" میں اختراعات حربی پر یہ خیالات ظاہر کئے ہیں کہ دنیا میں اب میدانی جنگیں نہیں ہوں گی ان میں ہاتھ پیر سے زیادہ دماغوں کا اور سپاہیوں سے زیادہ کیمیاگروں کا حصہ ہوگا فریقین کو مقابلہ میں آنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ آیندہ جنگوں میں بڑے بڑے ڈریڈ ناٹ کام نہیں دیں گے، جو کچھ کام ہوگا آب دوز دل اور تحت البحر کشتیوں سے ہوگا۔ لیکن جیت اسی کی ہوگی جس کے پاس سب سے زیادہ ہوائی قوت ہوگی حکومتوں کو اپنی بقا کے لئے سب سے زیادہ اس قوت کو بڑھانا چاہئے۔

ہوائی جہازوں کی طرح روز نئی نئی قسم کی توپیں بھی ڈھالی جاتی ہیں۔ ہوائی اور پہاڑی حملوں کے لئے ایلومنیم کی توپیں بنائی گئی ہیں جو بیحد ہلکی پھلکی، مضبوط اور کام دینے میں نہایت عمدہ ہیں۔ ایسی توپیں بھی بکثرت ڈھالی جارہی ہیں، جن کا توڑ ایک سو پچیس میل کا ہے۔ ان کی نال گولوں سے بھری جاتی ہے، اور ایک گولہ سر ہونے کے بعد۔ دوسرے گولے یکے بعد دیگرے از خود سر ہوتے رہتے ہیں کوشش کی جارہی ہے۔ کہ اس کی مار کی حد کو اور بڑھایا جائے۔ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اگر ان توپوں میں زہریلے گولے بھر کر سر کئے جائیں، تو سیکڑوں میل کے فاصلہ سے دشمن کے ملک کو تباہ و تاراج کیا جاسکیگا۔ جرمنوں نے ایک نئی وضع کی توپ ڈھالی ہے: یہ توپ ۱ کیلومیٹر کے نوڑ کی ہے، چلنے میں مطلق کوئی آواز نہیں دیتی، اور اتنی تیزی سے چلتی ہے کہ گولے بارش کی بوندوں کی طرح برستے ہیں۔ ایک اور کارخانے میں برقی توپیں طیار کی جارہی ہیں، یہ گولوں کی جگہ برقی شراروں کا مینہ برساتی ہیں، ان کی زد بھی اچھی خاصی ہے، کسی قسم کا شور نہیں ہوتا؛ اور جب چاپ پلٹنیں کی پلٹنیں منٹوں میں تو وہ خاکستر ہوجاتی ہیں۔

تمدن جدید کا ایک اور آلہ ہلاکت بم کے گولے ہیں۔ ہندوستان میں ان کی اہمیت

کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن یورپ والے جانتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے، اور کتنی خطرناک ہے۔
امریکہ میں ایک شل بنایا گیا ہے، جس سے زیادہ قوی آج تک نہیں بنایا گیا ہے، اس کا وزن ...۲ پونڈ ہے، اور اتنے مہلک اور قوی اجزا سے مرکب ہے۔ کہ بڑے سے بڑے آہن پوش جنگی جہاز ایک گولہ کی ضرب سے سنبھل نہیں سکیں گے لیکن اس سے زیادہ زبردست قسم کے بم فرانس میں طیار کئے گئے ہیں، جو خشکی کے علیحدہ ہیں اور تری کے علیحدہ خشکی کے بم ایسے ہیں کہ صرف ۲ گھنٹہ میں سر زمین کو نیست و نابود کر سکتے ہیں، اور تری کے ایسے ہیں کہ ایک ایک بم جس جگہ پڑ جائے گا، سو سو فٹ تک گردوں جہازوں کو غرق کر دے گا، اور پچاس فٹ تک گہراؤ میں اثر کریگا۔
ان کے علاوہ اور بھی نئے طرح کے بم بنائے جا رہے ہیں، جو اگر تیار ہو گئے تو قوت وہلاکت میں بے نظیر ہوں گے
سب سے آخری اور بے بنیاد چیز، جسے ایک حد تک صرف اسی دور کی پیداوار کہا جا سکتا ہے جنگ میں زہریلی گیسوں کا استعمال ہے گذشتہ جنگ میں جرمنوں نے اس سے خاص طور پر بہت کام لیا ہے۔ آخر آخر میں اتحادی بھی اسی حربہ پر اتر آئے تھے۔ لیکن آئندہ جنگوں میں توپ گولوں سے زیادہ یہی چیز کام آئے گی۔
امریکہ میں پروفیسر ڈیس نے ایک زہر طیار کیا ہے، جس سے حیوانات ہی نہیں نباتات بھی نہیں بچ سکیں گے اس زہر کا نام موجد کے نام کی مناسبت سے "لوئی سائٹ" رکھا گیا ہے اور ہزاروں من کی تعداد میں ہر وقت جمع رہتا ہے۔ اسی قسم کی ایک خطرناک گیس منجمد کی گئی ہے لیکن ہوا لگنے سے سیال ہو جاتی ہے، یہ ڈبیوں میں بند سپاہیوں کو دیدی جائے گی، اور وہ بوقت ضرورت ڈبیاں کھول کر چپ چپاتے وہی کام کریں گے، جو تیغ و تفنگ کی جھنکاروں میں کیا جاتا ہے
امریکہ میں "بالٹی مور" نام ایک کارخانہ ہے جہاں صرف اسی قسم کی چیزیں طیار کی جاتی ہیں عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ وہاں ۵۰ لاکھ سیر کی مقدار میں، مختلف قسموں کے زہر ہر وقت موجود رہتے ہیں۔
ایک فرنچ سائنٹسٹ نے آتش باری کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے، جو بہت سہل اور پرکار ہے

ایک فتیلہ اور تیل کے ذخیرے کے ساتھ ہوائی چھوڑی جاتی ہے۔ فتیلہ میں ہوا کے اثر سے آگ لگنی شروع ہوتی ہے۔ یہ آگ جب تیل کے ذخیرے تک پہنچتی ہے تو شعلوں کا آتش کدہ بن کر زمین پر انگاروں کی بارش برسانے لگتی ہے۔

ایک اور حربی کارخانے میں بہت تیزی سے ایسی گیسیں طیار کی جا رہی ہیں۔ جن کی خصوصیت خاصہ یہ ہے کہ ان کا ایک شمہ بھی تنفس میں آنے سے جینا محال ہو جائے گا۔ اور جہاں یہ گیس پھیلا دی جائے گی، وہاں ایک جاندار بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔ اس کارخانہ میں ایسی گیسوں کی طیاری کا اتنا اہتمام کیا گیا ہے۔ کہ روزانہ ۵۰۰ من مختلف گیس طیار کی جا سکتی ہیں۔

موت و ہلاکت کی اس گرم بازاری میں، دنیا کے پاس وہ کونسی چیز ہے جس سے وہ اپنی ہستی کو مرصر فنا سے بچا سکتی ہے۔

"ناظر دہلوی"

انقلاب

اکثر لوگ انقلاب کے خوفناک نتائج کی طرف بمقابلہ اس کے امید افزا مستقبل کے بآسانی متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ان کو غیر معلوم کی دہشت اور قائم شدہ مروجہ سے خاص انسیت ہوتی ہے۔ بایں ہمہ انقلابات وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے بعض بر محدود اور سست رفتاری سے عملدرآمد ہوا۔ یا بعض بیشتر سے بغیر کسی آگاہی کے ظہور پذیر ہوگئے یہانتک کہ معمولی انسان کو اس وقت تک مطلقاً واقفیت نہ حاصل ہوئی جبتک کہ ان کی تکمیل نہ ہوئی۔ لیکن انقلابات اچانک اور تباہ کن بھی ہوئے ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ انسانوں کی زیادہ تعداد مروجہ رسوم سے تنگ آجائے؟ کیا چند شورش پسند انسان معمولی آدمیوں کو ان کے طریق وفاشعاری سے بہکا سکتے ہیں؟ یا یہ کہ مخصوص واقع پر پسند انسان کثرت تعداد پر پورا قبضہ حاصل کرکے اپنی ذاتی خواہش انقلاب وتغیر کو رسوم کی مانعانہ قوت پر غالب کرسکتے ہیں؟ یہ سب اک طرفہ بیانات ہیں اور ان سے زیادہ اہم ایک اور حقیقت ہے۔

شورش کی تحریک اور قوت کے تصادم سے بھی بڑھکر انسانوں کے نصب العین ہیں جو مخبران صادق کی روحوں میں جوش پیدا کرتے ہیں اور جس کا اظہار وہ شر کی مذمت یا درخشاں مستقبل کے تخیل کے ذریعہ کرتے ہیں۔ یہ نصب العین اپنے اندر ایسی قوت محرکہ پوشیدہ رکھتے ہیں جن پر عمل شروع ہونے کے ساتھ ہی بہت سے ہم خیال پیدا ہو جاتے ہیں۔ نصب العین کی بجائے خود مختلف نوعیتیں ہیں۔ ان میں سے بعض خارجی گرد وپیش کی معمولی سی اصلاح کی ایک کمزور خواہش سے زیادہ نہیں ہوتے۔ اور جب ان لوگوں کو شخصی اظہار کے لئے دولت یا تھوڑا سا کھانا اور مزدوری ملجاتی ہے تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ بعض نصب العین ایسے غیر معین ہوتے ہیں کہ ان کو قبر کے گوشہ کے لئے ملتوی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان میں سے بعض اس دنیا میں مستقل قوت اور تغیر برپا کرنے والے ثابت ہوئے ہیں اور انسان ان سے برانگیختہ ہوکر معمولی اصلاحات سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ انھیں کے ذریعہ دنیا میں انقلابات ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔

ان کا اظہار انقلاب پسندوں کی طبائع کرتی ہیں لیکن اس قسم کے جذبات بجائے خود عوام کی خواہشات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان کو مخصوص طرز بیان سے اور بھی زیادہ مشتعل کن اور کارگر کر دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ جذبہ انقلاب پسند مقرر یا مضمون نگار کے زور قلم سے نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو صرف اتنا کرتے ہیں کہ عام بے اطمینانیوں کو بلیغ اور موثر پیرایہ سے ادا کردیں اور دنیا کے روشن مستقبل کا منظر لوگوں کے روبرو پیش کردیں جس کو اگرچہ عوام دیکھتے ہیں لیکن دھندلی شکل میں۔

لیکن اگر انقلاب کی بنیاد کا دارومدار عوام پر ہے تو یہ کیا ہے کہ ایک معمولی آدمی انقلاب کے ہیبت ناک منظر سے خائف ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مختلف نصب العینوں کے تصادم کو تنہی تصادم خیال کیا جاتا ہے۔ اور پھر فریق مقابل سے ہر طرح کی خطرناک امیدیں قائم کیجاتی ہیں۔ انسانی جماعتیں جلد مشتعل ہونے والی اور ڈرپوک ہوتی ہیں اور ان میں زیادہ تر ایسے ہوتے ہیں جو خوف کے بہت جلد شکار ہوجاتے ہیں اس لئے دونوں قسم کی جماعتیں جو انقلاب سے توقعات قائم کرتی ہیں یا انقلاب کو نفرت کی نظر سے دیکھتی اور ان ڈراؤنے ہوّوں کے ذکر کی طرف متوجہ ہوجاتی ہیں جن کا خود ان کو احساس ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر بیانات قابل وثوق نہیں ہوتے۔ انقلابات شورش پسندوں یا سرمایہ داروں کی وجہ سے وقوع پذیر نہیں ہوتے۔ اس لئے مورخ کو چاہیئے کہ اس قسم کے ڈراونے ہوؤں کو صحیفہ نگاروں، مدبروں، مذہبی معلموں اور ضعیف عورتوں کے لئے چھوڑ دے۔ یہ بھی آسان ہے کہ "ہوّے" پر عوام کو حملہ کرنے کے لئے آمادہ کردیا جائے۔ بیشتر اس ہوّے کی شکل لمبے بالوں والے وحشت مآب، دبلے اور پھٹے کپڑے پہنے ہوئے نوجوان کی سی ہوتی تھی۔ اور اس کا نام انارکسٹ یا سوشلسٹ تھا لیکن اب اس کے لئے ایک اور ہیبت دلانے والا نام بالشوک تجویز کیا گیا ہے۔ یہ ہوّا سب سے زیادہ ذلیل طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے یعنی ادل درجہ کا نقاش یا کاریگر، ڈرائنگ روم میں ہر وقت موجود رہنے والا ملازم یا کوئی نوجوان جس کے جذبات امتیاز سے مطلقاً معرا ہیں اور جس کا جبل بی دوسروں کے سر پر سوار ہوکر لکھنے یا تصویر کھینچنا ہے۔ شاید عمومی صحیفہ نگار اور ضعیف

عورتوں نے اس شخص کو دیکھا ہوگا۔ انہوں نے یہ خبر بھی افواہاً سنی ہوگی کہ بالشوک نزدیک آ رہے ہیں اس سے زیادہ اور کیا قدرتی بات ہو سکتی ہے کہ یہ شخص بالشوک ہو۔ آدمیوں کے ہجوم میں ایسے اشخاص کو نہایت خوشی سے مار ڈالا جا سکتا ہے۔

ہوّؤں کے متعلق صرف ان رجعت پسندوں کا ہی ٹھیکہ نہیں۔ ایک ہوّوے کو موٹے آدمی کی طرح لباس پہنا کر جیب میں لا بنی گھڑی کی زنجیر اور سر پر بہت بڑی ٹوپی رکھی جاتی ہے اور انقلاب پسند جماعت اس کو سرمایہ دار کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ حالانکہ اکثر سرمایہ داروں کو فتور ہاضمہ کی شکایت ہوتی ہے اور وہ نہایت محنتی ہوتے ہیں۔ شاید یہ ہوّا حزب العمال کے لیڈر کی شکل سے قیاس کیا گیا ہو جس کو (او۔ بی۔ ای) کی تمنا ہے۔ غرضکہ اسی طرح انقلاب پسندوں کو اپنی آگ مشتعل کرنے کے لئے کافی مواد ملجاتا ہے۔ اور اس طرح عوام کو صبح امید کی توقع دلائی جاتی ہے جس سے ان کی بلاغت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ ان باتوں کا لابدی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ معمولی آدمی سہم کر رہ جائے۔

لفظ انقلاب کے متعدد معنی ہوسکتے ہیں اور بحث کی خاطر یہ لفظ متضاد معنی میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ انقلاب کے حریف اس سے صرف یہ مراد لیتے ہیں کہ انسانوں کی گردنوں پر چھریاں پھیری جائیں اور نظام جماعت کو چند متعصب عالی دماغ والوں کے قبضہ اقتدار میں دیدیا جائے۔ لیکن ایک کٹر انقلاب پسند اس مسئلہ کی پیچیدگیوں میں یہ کہکر مزید اضافہ کرسکتا ہے کہ زمانہ انقلاب میں تمام سرمایہ داروں کے گولی ماردینی چاہیئے اور ساتھ ہی انکی محبت و رفاقت کی تعلیم بھی جاری ہے زبان کے استعمال میں جو ابہام واقع ہوجاتا ہے اس امر میں مانع نہونا چاہیئے کہ ہم لفظ انقلاب کے محدود و مخصوص معنی مراد لیں۔

روسّو، مارکس اور دیگر انقلاب پسندوں نے (اگر ہم اس باب میں ان سے رہنمائی طلب کریں) اس لفظ سے نظام جماعت میں ایک مخصوص تبدیلی مراد لی ہے۔ انہوں نے انقلاب کے معنی ہیئت اجتماعی میں اچانک اور بنیادی تغیر خیال کئے۔ اول تو انہوں نے ان گذشتہ واقعات کا حوالہ دیکر جن کو عام طور پر انقلاب کہا جاتا ہے اور زیادہ اس لفظ کے استعمال کے متعلق توضیح کردی ہے دوسرے یہ کہ انہوں نے موجودہ طرز زندگی کے نصب العین پر تنقید کے ذریعہ اس لفظ کے متعلق

پورا ابہام رفع کردیا ہے۔

لیکن تمام گذشتہ اہم واقعات کے لئے اس لفظ انقلاب کو بجز استعارہ کے اچانک اور بنیادی تغیر کے معنی میں نہیں استعمال کر سکتے۔ قیام مسیحیت یا نشاۃ الثانیہ کے لئے یہ لفظ نہیں استعمال کر سکتے بلاشبہ یہ اصولی تبدیلیاں تھیں یہ اچانک نہیں واقع ہوگئیں۔ برخلاف اس کے اگست ۱۹۱۴ء (جب جنگ عظیم کا آغاز ہوا) میں بھی کوئی یکایک تبدیلی نہیں رونما ہوئی کیونکہ اتبک قوموں کی زندگی کا انحصار جنگ پر ہی رہا ہے۔ اگرچہ اس کے بعض ناگزیر نتائج کا کسی کو علم نہ تھا۔ بلاشبہ یورپین ممالک کے افراد کے حرکات و سکنات میں اک گونہ تبدیلی واقع ہوئی لیکن ان کا طرز عمل اور جماعتی نظام کی بنیادیں بدستور قائم رہیں۔

یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ آخر کتنا زبردست تغیر واقع ہو جس کو بنیادی تبدیلی کہہ سکیں۔ مثلاً انقلاب انگلستان ۱۶۸۸ء اس معنی کر بنیادی تغیر نہ تھا اور لفظ انقلاب اس پر عاید نہیں ہوتا۔ جنوبی امریکہ کے انقلابات اچانک وقوع پذیر ہوئے لیکن ہیئت اجتماعی میں کوئی نمایاں تبدیلی ظہور پذیر نہیں ہوئی برخلاف اس کے انگریز جس کو انقلاب امریکہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور امریکہ والے جس کو جنگ آزادی کہتے ہیں فی الحقیقت اسی حد تک بنیادی تغیر کہا جاسکتا ہے۔ جہانتک کہ اس سے اس قسم کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن کو انقلابی کہا جاسکتا ہے۔

صنعتی انقلاب کے لئے اس لفظ کا جایز استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس کے ذریعہ طرز زندگی میں ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں جن میں دوسرے انقلابات کی عارضی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ تو نوں کے نزدیک انقلاب اس وقت تک وقوع پذیر نہیں ہوتا جبتک کہ کھڑکیوں کے شیشے نہ ٹوٹیں اور خونچکاں سروں کا منظر لوگ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ مورخین یہ نہ سمجھ سکے کہ جدید صنعت میں اس اعتبار سے کتنے انقلابات کے جراثیم پوشیدہ ہیں اس انقلاب کے ستم کش غربا اور ننھے ننھے بچے ہیں۔ اور خونریزی بھی اس قدر ہو چکی جو کسی دہشت انگیز انقلاب میں ہوئی ہو لیکن اس میں نہایت آہستگی اور تڑپا تڑپا کر قتل کیا گیا۔ اس میں شک نہیں شرفار کو زیادہ زحمت نہ اٹھانا پڑی اور چونکہ ہمارے تمام

مورخین کا تعلق اسی شرفا کے گروہ سے تھا اس لئے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھ سکے۔ بہر حال انقلاب کے لئے بہت سی جانوں کا ضائع ہونا بھی ضروری نہیں اس کے لئے محض یکایک اور بنیادی تبدیلی درکار ہے جو اس سے لازمی طور پر ظہور پذیر ہوتی ہے

انقلابات میں سب سے زیادہ محیر العقول انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء اور انقلاب روس ۱۹۱۷ء ہیں اور اس لئے عموماً لفظ انقلاب ان دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید تاریخی عہد کے یہ مخصوص انقلابات ہیں۔ یہ اچانک واقع ہوئے اور جو تبدیلیاں ان سے رونما ہوئیں ان کو بنیادی تغیرات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کے اثرات ان ممالک سے باہر جہاں وہ وقوع پذیر ہوئے خارجی ممالک تک پہونچ گئے۔ بہر حال یہ ضروری نہیں کہ ان کے مشترکہ خصوصیات سے بحث کی جائے کیونکہ وہ مسلمہ طور پر ہئیت اجتماعی میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنے والے خیال کئے جاتے ہیں۔ وہ زیادتیاں اور ستم آرائیاں جو عوام کو برداشت کرنا پڑیں انقلاب کا لازمی نتیجہ نہ تھیں بلکہ اس قسم کے مصائب سے جاگتی نظام کو آئے دن دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لڑائیوں اور مطلق العنان حکمرانوں کے مظالم کو انقلاب کے نتائج نہیں کہا جا سکتا۔ مذکورہ بالا محققین تاریخ کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان نے اجتماعی طور پر ابھی اس قدر ترقی نہیں کی ہے کہ غیر ضروری تصادم کے بدون اجتماعی تغیرات عمل میں آسکیں لیکن اس حقیقت سے انقلاب اور بے جا مظالم ایک ہی علت کے نتائج نہیں قرار پا سکتے۔

بہر حال ہماری دلچسپی کا اصلی نکتہ یہ ہے کہ انقلابات ایک بڑی حد تک اجتماعی تخیلات پر مبنی ہیں اور چونکہ انقلاب کے ذریعہ جدید نظام جماعت کا تصور سب کا مقصود ہوتا ہے اس لئے ہم کو اس لفظ کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری تھا۔ یہ ایک قدیم اور صحیح خیال ہے کہ انقلاب فرانس روسو کی تعلیمات کا نتیجہ تھا اور بالشوک کرل مارکس کے ابھارے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ محدود تاریخی حقیقت ہمارے دلائل کے لئے بنیادی نہیں قرار دی جا سکتی یہاں ہمارا مقصد مستقبل سے بحث کرنا ہے۔ ان مردہ انقلاب پسندوں کے نصب العین ہم زندوں کے لئے اس واسطے زیادہ اہم ہیں کیونکہ ان میں ہمارے اور موجودہ زمانہ کے لوگوں کے دماغوں

کو گزشتہ کرنے اور دلوں میں ولولہ پیدا کرنے کی قوت محرکہ موجود ہے ہمارا تخیل انقلاب عہد ماضی کے واقعات مثلاً انقلاب فرانس وغیرہ سے ہی مستنبط نہ ہوگا بلکہ جدید نظام جماعتی کے نصب العین سے ماخوذ ہوگا جو اس وقت بھی ہم میں غیر مرئی طور پر اپنی کار فرمائی کر رہا ہے ۔ اس نصب العین سے مراد یہ ہے کہ ایک سریع اور بنیادی تبدیلی کی ہیئت اجتماع کو ضرورت ہے اور اگر اس امر کا اظہار عہد ماضی کے اہل قلم کے سوا کسی اور سے نہیں ہوتا۔ تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے اکثر لوگوں کے گونگے پن کا علاج ان کی خواہشات نہیں کر سکتی ہیں ۔ ان کا عمل بذات خود زبان ہے۔ لیکن یہ بات کہ وہ نصب العین پر کو اکثروں نے قبول کیا اور صرف چند ہی اس کا وضاحت کے ساتھ اظہار کر سکتے ہیں ۔ اسباب کی کافی دلیل ہے کہ تبدیلی کی خواہش موجود ہے جو نظام جماعت کی خرابیوں کو برباد کرنا چاہتی ہے اور ایک جدید ہیئت اجتماعی تعمیر کرنا چاہتی ہے جو نئے اخلاقی اصول پر مبنی ہوگی یہ کہنا قرین انصاف نہ ہوگا کہ انقلاب سے ہمیشہ مفید تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گویا انقلاب لازمی طور پر موجب بہتری ہوتا ہے۔ حالانکہ عرف عام میں اس لفظ سے یہ مراد نہیں لیجاتی ۔ کیا ہم اس کو بھی انقلاب کہیں گے جب نظام جماعت کے ابتدائی دور میں کوئی غیر دیانتدار آدمی دوسرے کو برطرف کرکے خود انسانوں کی زندگی اپنے قبضہ میں کر لیتا تھا حالانکہ اس تبدیلی کا نتیجہ موجب بہتری مطلقاً نہ ہوتا تھا ۔ لیکن یہاں انقلاب سے ہماری مراد وہ مخصوص حالت ہے جس کا مظہران صادق نے نصب العین کے ذریعہ اظہار کیا اور اس لئے یہ کہنا ہی درست ہوگا کہ اس قسم کی اچانک اور بنیادی تبدیلی ہمیشہ موجب خیر ہوئی ۔ تو آخر اس قسم کے تغیر کی کیا تعریف ہے ؟

سب سے پیشتر تو نمایاں خرابیاں برباد کر دی جائیں گی جس کا اثر بلاشبہ ان رسوم پر بھی پڑے گا جو بالکل غیر مفید نہیں ہیں یہ مذکور ہو چکا ہے کہ نظام جماعتی کی سریع اور بنیادی تبدیلی دوسرے ممالک میں دوبارہ اسی طرح واقع ہو سکتی ہے جس طرح کہ عہد ماضی میں ہوئی تھی ۔ گذشتہ تاریخ کی طرف اس لئے حوالہ دیا گیا ہے کہ اس سے مستقبل کے امکانات کا منظر دیکھا جا سکے ۔ ہم ضعیف عورتوں کی دہشت اور شورش پسند طبائع کے مخدوش خیالات سے بھی بحث کر چکے ۔ لیکن بایں ہمہ معمولی

زندگی کی پرسکون سطح پر کوئی حرکت نمودار نہیں ہوئی۔ جماعت کے اکثر افراد اثر پذیر نہیں ہوے شورش پسند اور ضعیف عورتیں دونوں غلط نتائج اخذ کرتے ہیں کیونکہ گونجتی ہوئی آواز کا شور وغوغا اور خونچکاں مناظر لازمی نہیں ہیں۔ دراصل اس شخص کے پاس چشم بصیرت مفقود ہے جو یہ نہ قیاس کر سکے کہ آیندہ اہم تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ جو شخص تاریخ سے باخبر ہے اس کو عوام کی اسی خاموشی میں جدید دور کے آغاز کی نشانیاں ملیں گی۔ موجودہ اور قایم شدہ کے متعلق پہلا سا اعتقاد زائل ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور حکومتوں کے محکمہ خارجہ کے دفاتر میں بھی وہ پرانا یقین اب نہیں ملتا اکثر لوگ یہ بھی یقین کرنے لگے ہیں کہ موجودہ اجتماعی خرابیوں کا درست کرنا دنیا کا طبقہ الٹے بغیر ممکن ہے اور جب قدیم معتقدات کا اثر زائل ہونا شروع ہو جاتا ہے نئی چیزیں معمولی اور ممکن نہ کہ دہشت انگیز خیال کی جاتی ہیں تو بس یہی وقت انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔

آخر انقلاب کے متخیلین کے نزدیک کوئی چیز ناجایز بھی ہے؟ سوائے چند باتوں کے تقریباً تمام موجودات ان کے نزدیک غلطی پر مبنی ہے۔ ہم لوگ اپنے اسلاف یعنی عہدہ داروں کے لوگوں کی طرح اس قدر جلد مطمئن ہونے والے نہیں ہیں۔ ہم نظریہ ارتقا میں اس لئے یقین نہیں کرتے کہ ہم خود اس کے مخلوق ہیں۔ ہم اس سے بڑے نصب العین میں یقین کرنے والے ہیں اور کوئی نہیں جو انسان کو پورا مہذب خیال کرتے ہیں۔

متخیلین انقلاب انسانیت کی یہ تعریف کرتے ہیں۔ انسان کی نسل حیرت خیز ہے۔ وہ خود بوالعجبیوں اور ہیجانات کا مجموعہ ہے اور دراصل اس میں انسان نما بندروں کی بہت سی مشترکہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ غالب خیال لباس اور روزی سے متعلق ہے اور سب سے زیادہ قوی ہیجان ان کے حصول میں دوسروں کو نقصان پہنچانا ہے۔ ہمارے مکانات بھٹوں یا غاروں سے مشابہ اور ہمارا لباس انجیر کے پتوں پر کچھ اضافہ جس کا مقصد یہ ہے کہ موقع و محل پر اپنے آپ کو عریاں کیا جاسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تاریخ انسانیت کے ابتدائی دور میں ہیں نہ کہ خاتمہ پر اور ممکن ہے کہ زندگی کے بنیادی اصول سے ہم بے بہرہ

ہوں اور ان پر اب تک عمل شروع بھی نہ کیا ہو۔ ہر فرد کا ادراک و فہم اور متخیلہ محدود ہیں نہ وہ
سلسلہ وار سوچ سکتا ہے نہ اس کا تخیل ہر نئی چیز پر آزادی کے ساتھ حاوی ہے۔

لیکن انقلاب پسندوں کے نزدیک یہ معمولی کمزوریاں نظام جماعتی اور عادات مروجہ کی
خرابیوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ یہاں ہم جانور ہیں لیکن جانوروں کی صحیح فطرت سے محروم۔ اس
لئے یہ وحشی جانوروں کی تحقیر و ذلت ہوگی اگر ان کا مقابلہ ہماری مسلح قوموں یا ان انسانی جماعتوں
سے کیا جائے جو دوسروں کی بے بسی سے خود فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان عادات سے جو اتفاقی
طور پر قایم ہوئیں اور جن کے مجموعہ کو ہم نظام جماعت کہتے ہیں افلاس اور جنگ وجود میں آئے اور یہ
دونوں سب سے بڑی برائیاں ہیں جن کا اب تک کسی ہیئت اجتماعی کو تجربہ ہوا۔ ان کی بدولت صرف افراد
کو مصایب میں ہی گرفتار ہونا نہیں پڑتا بلکہ آسودگی بالکل مفقود ہوگئی اور قوت فکری و طبعی بے کار
ضائع کی گئی۔ ضروریات زندگی کو خوشحال بنانے والی اشیار کے بہم نہ پہونچنے سے بہت سے برے نتائج
مترتب ہوئے۔ مذہب کی حالت اور زیادہ دگرگوں اور ناگفتہ بہ ہے۔ مذہبی پیشوا ایک دوسرے پر ہمیشہ
حملہ ہی کرتے رہتے ہیں۔ حکومت کی بنا اس اصول پر رکھی گئی ہے کہ دوسری حکومتوں کے امن و آزادی
کو برباد کرکے اپنی قوت حاصل کی جائے۔ صنعت کا یہ حال کہ وہ تعصب اور جہالت کے ایک
جنگل میں قزاقوں کے ایک گروہ کے پالے پڑی ہے۔

یہ صحیح نہیں کہ انفرادی اور جماعتی نظام کی بنیاد عمدہ اصول پر رکھی گئی ہے اور یہ سطحی
برائیاں محض اتفاقی ہیں۔ یہ برائیاں زندگی کی اساس کو منقطع کرنیوالی ہیں اور باوجود اس
کے کہ خیر بھی فرد اور سوسایٹی کے اصول اساسی میں سے ہے لیکن خیر و شر کی کشمکش اس قدر عمیق
گہرائیوں میں پہونچ چکی ہے کہ بغیر بنیادی تغیر کے ان کا تصادم ناگزیر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں
کہ انسان پوشش لباس چھوڑ دے یا پیدایش دولت سے دستکش ہو جاے۔ یہ کسی کا عقیدہ نہیں
کہ انسان کی عادتیں یکسر بدی پر مبنی ہیں۔ شوپن ہار کے پیرو بھی یہ ثابت نہ کرسکے کہ زندگی اچھی
باتوں سے معرا ہے۔ لیکن جو خرابیاں ہم دیکھ رہے ہیں اور جن کو یقیناً سطحی نہیں کہا جاسکتا

اپنے اندر تغیر و تبدیلی کی تمنا پوشیدہ رکھتی ہیں جو معمولی اصلاح سے ایک قدم آگے ہونا چاہئے۔
یہاں تک تو سب لوگ ان معاملات کو سمجھتے ہیں۔ اب جماعتی ضمیر بیدار ہوگیا اور مطمئن صاحبان ملکیت میں بھی بے چینی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ مزدوروں کی بے چینی کا سب رونا روتے تھے لیکن اب سرمایہ داروں کا اضطراب قابل دید ہے۔ بہت تھوڑے ایسے ہیں جو ہماری موجودہ تعلیم جس پر سب سے زیادہ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے) کے انفرادی نتائج سے مطمئن ہوں اور بہت کم ایسے ہیں جو اس سوسائٹی سے مطمئن ہیں جس میں ان کو زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اور وہ چند جو ان صورت حالات سے مطمئن ہیں وہ یقیناً بلا امتیاز ہر سوسائٹی میں خوشی سے زندگی گذار سکتے ہیں۔

ہمارے موجودہ زمانہ کی بعض خرابیاں زیادہ دقیق اور دلفریب ہیں۔ یہیں ہم کو مخبران صادق کی بصیرت درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ نہ تو شورش انگیز طبائع اور نہ پیشہ ور مدبرین ہی کو اس میں ان کی بلاغت کی چاشنی کے لئے مواد مل سکتا ہے۔ رجعت پسند بھی اس سے زیادہ پریشان خاطر نہیں ہوتے برائیوں کی جڑ یہی ہے اور یہی طرز زندگی ہے جس کو شر عظیم سے تعبیر کرنا چاہئے جس کے اثرات اور پیچیدگیاں مذہب، صنعت، سیاست، فنون لطیفہ، معمولی زندگی اور غرضکہ ہزاروں شعبوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہمارے لباس عمرانی پیچیدگیوں، بیماریوں اور عام جہالت میں انسان کے مشابہ بندر کی بہت کم خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یقیناً ہمارے رویہ زندگی میں اس کے بہت آثار موجود ہیں ہمارا یہ رویہ خود غرضیوں، تسلط کی خواہش، دوسروں سے بغض و حسد بچوں کو دھمکانے اور کسی تنہا فرد یا جماعت پر وحشیانہ غلبہ حاصل کرنے کی کوششوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ نظام جماعت کی کوئی اصلاح ان کا علاج نہیں کرسکتی اور اگر ہمارا انظام جماعت بالکل ابتدائی دور میں نہ ہوتا تو اس قسم کے رویہ کے کارگر ہونے کیلئے بہت کم مواقع دستیاب ہوتے۔ ایک یا چند وحشیوں کی حکومت کی بجائے بہت سے وحشیوں کی حکومت بالکل معمولی ترقی ہے۔ بہت سوں نے تو حتمی طور پر اپنا

فیصلہ دیدیا ہے ۔ کہ انقلاب پسندوں سے کسی قسم کی توقع رکھنا تحصیل حاصل ہے ۔ جمہوریت ہرگز پسندیدہ نہیں اگر اس سے یہ مراد ہے کہ عوام کی مرضی کے مطابق ہر ایک کو متابعت قبول کرنا ہوگی ۔ اس لئے اگر انقلاب کا مدعا نظام جماعت میں بہتری پیدا کرنا ہے تو اس سے قبل افراد کے کیرکٹر اور نظام جماعت کے متعلق لوگوں کے رویہ میں بنیادی تغیر ضروری ہے ۔

اگر انقلاب کی کوئی حیثیت ہے تو وہ کم از کم اتنا تو موثر ہونا چاہئے ۔ جب کرل مارکس گفتگو کر رہا ہے تو ٹالسٹائے کو نہ فراموش کرنا چاہئے اور روسو کی تعلیمات کے جس نے لوگوں کو فطری زندگی کی طرف رہنمائی کی اس لئے انکار نہ کرنا چاہئے کہ اس نے معاہدہ جماعتی کے ذریعہ ایک سیاسی نظام قایم کرنا چاہا ۔ بڑے بڑے انقلاب پسندوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ مسئلہ در اصل اخلاقی ہے نہ کہ اقتصادی اور اس لئے اونہوں نے اس کا علاج بھی اخلاقیات سے کرنا چاہا ہے ۔ تمام انقلاب پسند اہل قلم مخبران صادق کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں ۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ انہوں نے مستقبل کے متعلق پیشینگوئیاں کیں بلکہ جو کچھ ظہور پذیر ہونے والا تھا اس کے لئے لوگوں میں جذبات پیدا کردئے ۔ اس لئے ان تمام تر تصنیفات جماعتی تخیلات کے لئے قوانین ہیں اور وہ خود انسانوں کے مہتم بالشان ؟

ان مضمون نگاروں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کوئی بڑے آدمی نہیں ۔ مخبر صادق اور معلم کا عزت و احترام کیا جاتا ہے ۔ لیکن اس کو مکمل انسان نہیں کہ سکتے تمام بڑے بڑے انقلاب پسندوں نے اپنی ذاتی کمزوریاں محسوس کیں اور ان میں سے ہر ایک نے انسانوں کی ایسی جماعت دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جنہوں نے فن حیات کی پوری تکمیل کی ہو جو خود ان کے لئے غیر ممکن تھا ۔ اس فن میں کمال حاصل کرنے کے یہ معنی تھیں کہ قوت تخلا نہ موجود ہو ، نہ یہ کہ انسان کو محض اپنے نفس پر پورا ضبط و اختیار حاصل ہوجائے جس کی دوررسی اور عیاری کی خاطر بیراگی اور صوفی ہمیشہ تمنا خواں رہے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ تکمیل انسانی کے لئے ضبط نفس پہلی منزل ہے ۔ کیونکہ انسان کیلئے اس عقل کی سرگشتگی اور ان جذبات کی آوارگی سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے ۔ جو اس کو اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملے ہیں ۔ جس طرح ایک پہلوان کشتی میں اپنے جسم پر پورا قابو رکھتا ہے اسی طرح مکمل انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے

دماغ پر پورا قابو رکھے۔ اس لئے ضابطہ اور باقاعدگی ہر چیز کے کمال حاصل کرنے کے لئے لابدی ہیں
لیکن کمال کی اصل طمانیت ہے بغیر کسی مزید جدوجہد کے تمام قوائے جسمانی اور دماغی میں چستی ہو جائیگی
کیونکہ اگر اجتماعی عادات میں کوئی انقلابی تبدیلی انسان کو فن زندگی میں تکمیل بخش سکتی ہے تو زندگی کے
رموز اور نوعیتوں میں مزید اضافہ ہوتا رہنا چاہئے نہ کہ یکسانیت اور استحکام۔ مہذب انسان اس
معنی کر آزاد ہو جائے گا جو ضعفا، اور بلغار کے تخیل سے پرے ہے حالانکہ وہ حریت و آزادی
کی مدح میں ہر وقت رطب اللسان رہے ہیں اور جن کا یہ خیال ہے کہ قانون یا قوت بازو کے
زور سے یہ دولت حاصل کی جاسکتی ہے

مزید براں یہ کہ یہ آزاد انسان جو اپنی زندگیوں کے خود مختار ہوں گے محض پیدائش دولت
یا صرف خرچ کرنے ہی میں نہ مصروف رہیں گے نہ کسی خاص عقیدہ کے پیرو ہوں گے بلکہ ان
کی زندگی گویا ایک دوسرے کی ہمدمی و یاوری ہو گی۔ نظام جماعت ان کے باہمی تعاون کا فطری
نتیجہ ہوگا اور وہ اپنی مکمل انسانیت کے جوہر اس متلون بغیر پذیر اور ناقابل توضیح کائنات میں
دکھلائیں گے۔ اس قسم کی دنیا بالکل ممکن ہے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ خیالات بعید
از حقیقت ہیں۔

"ترجمہ"

"یوسف حسین"
متعلم جامعہ

مطبوعات جدیدہ

تاریخ الدولتین از مولانا نیاز فتحپوری ۔ مطبوعہ شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ
تاریخ اسلام سے جو دلچسپی اس عرصہ میں مسلمانوں کو پیدا ہو گئی ہے اس کی برکت ہے کہ گذشتہ چند سال میں
متعدد تصانیف اس مبحث پر شایع ہوئی ہیں ۔ اسلام کا دور کامرانی چند سال یا چند صدیوں تک محدود
نہیں، تیرہ صدی کے طویل عرصہ میں متعدد اقالیم میں جو کارنامے اہل اسلام نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں
ان کی فہرست بھی مختصر نہیں ہو سکتی ۔ حال میں جامعہ ملیہ کے شعبہ تصنیف و تالیف نے جو سلسلہ تاریخ الامت
کے نام سے شایع کیا ہے اس کو ایک مختصر و جامع تاریخ ہونے کی حیثیت سے غیر معمولی کامیابی ہوئی
لیکن ضرورت ہے کہ مختلف عہد و خاندانوں کی مکمل تاریخ بھی جداگانہ شایع کی جاے ۔ چنانچہ عہد
بنی عباس کے متعلق جرجی زیدان کی مشہور تاریخ اسلام کے مقالہ سے فائدہ اٹھا کر مولانا نیاز فتحپوری نے
تقریباً دو سو صفحے کی کتاب تاریخ الدولتین کے نام سے شایع کی ہے ۔ ابتدا میں ایک مفصل دیباچہ ہے
جس میں تاریخ عرب پر ایک اجمالی نظر کی گئی ہے اور عرب و عجم کے تعلقات کو خاص طور پر نمایاں کرنے
کی کامیاب کوشش کی ہے کتاب بہ اعتبار طباعت و حسن صورت واقعی قابل تعریف ہے اگرچہ کتابت
کے اغلاط سے بالکل پاک نہیں نیز طرز بیان کی خوبی زبان کی سلاوت روانی اور واقعات تاریخی پر صحیح تنقید
نے اس کے عام دلچسپی اور وقعت کو بہت بڑھا دیا ہے ۔ اور اس قابل ہے کہ عام طور سے اسلامی
مدارس اور مسلمان گھروں میں جگہ پائے ۔ اس کتاب میں ایک بڑی کمی نظر آتی ہے اور وہ یہ
کہ فہرست مضامین درج نہیں ہے ۔ قیمت عہ

بشریٰ ۔ از مولانا سید سلیمان ندوی ۔ مطبوعہ محمدی پریس علی گڈھ ۔ ملنے کا پتہ احمد برادرز
تاجران کتب علی گڈھ قیمت ۶ر
مذہب اسلام کی حقانیت، اس کی سادگی، اور اکمل مذہب ہونے کے دلائل دنیا کے پاس ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں موجود ہیں ۔ اس مسئلہ

مذہبی نظر سے اور نیز فلسفۂ علامہ جدیدہ کی روشنی میں بارہا مختلف پہلوؤں سے پیش کیا جا چکا ہے۔ لیکن مولانا سید سلیمان صاحب کے زورِ قلم نے جو دلاویز تصویر اسلام کی بشریٰ کے اوراق میں کھینچی ہے اور جس میں زیادہ تر انھوں نے محض اسلامی روایات، احادیث، اور تفسیر قرآنی سے بحث کی ہے وہ بجائے خود موثر و لطیف ہے۔ اسلام کو دنیا کا آخری مذہب، مکمل ترین راہ ہدایت اور امن وسلامتی کا پیغامبر ثابت کیا ہے ابتدا رکتاب میں چند اوراق تعرف کے لئے خواجہ عبد الحیٰ صاحب کے قلم سے شایع کئے گئے ہیں۔ اور یہ مختصر کتاب بہ حیثیت مجموعی اس قدر خوبی و نفاست سے طبع ہوئی ہے کہ ایک مرتبہ ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کئے بغیر رکھنے کو دل نہیں چاہتا۔

ہمارا گھر (سوشل ڈراما)۔ از عبداللطیف شاد۔ مطبوعہ خلافت پریس، بمبئی۔

ڈراما یا ناٹک ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں دنیا کالیداس کے نام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ لیکن کچھ عرصہ سے اس فن پر کوئی معقول تصنیف شائع نہیں ہوئی اور جو کچھ ہوئیں ان کا مرتبہ نقش اول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ہمارا گھر بھی نئے طرز پر ایک ڈراما ہے جس میں ملک کی عام اخلاقی حالت، مغربیت کی خرابیاں اور قدیم ایشیائی خصوصیات خلوص و ہمدردی انسانی کی خوبیاں ایک قصہ کے پیرایہ میں ظاہر کی گئی ہیں۔ جدید قومی خیالات اور آزادی ہند کی جو تحریک دلوں میں جاگزیں ہو چکی ہے اس کا اثر بھی اس قصہ میں نظر آتا ہے لیکن ان تمام خصوصیات کو ڈراما کے محدود و مختصر حجم میں شامل کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ واقعات کا تسلسل بھی کسی قدر خود ساختہ معلوم ہوتا ہے نیز جو کیرکٹر پیش کئے گئے ہیں ان کی خصوصیات میں مبالغہ نظر آتا ہے۔ برائی اور بھلائی ہر شخص میں ہوتی ہے اور دونوں کا قدرتی تناسب ہی لطف پیدا کرتا ہے لیکن اس ڈرامہ میں مبالغہ نے اس لطف کو زائل کر دیا ہے عبارت بالخصوص باہمی گفتگو کے اس قدر دقیق ہیں کہ روزمرہ کی بول چال میں کہیں سننے میں نہیں آتی۔ ذی علم حضرات کے یہاں بھی فارسی وعربی کے اس قدر الفاظ استعمال نہیں ہوتے چہ جائیکہ انگریزی تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ خاندانوں اور بالخصوص ہندو خواتین کی زبان سے

یہ الفاظ تو بالکل ہی غیر معلوم ہوتے ہیں نیز انگریزی الفاظ کا بجنسہٖ استعمال اس کثرت سے اور اس قدر بے محل ہے کہ بعض وقت سخت ناگوار گزرتا ہے۔ فارسی عربی کے غیر مانوس و متروک الفاظ کو نہایت سنجیدہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرنا بھی دلچسپی کے اضافہ کا باعث نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس موقع پر باپ (دوناتک پرشاد) اپنی بیٹی سرسوتی سے انتہائی خفگی میں کہتا ہے:۔

"میں تیری زبان سے بد مذہبی کا فلسفہ سننا نہیں چاہتا۔ میں یہ بیہودہ شطحیات وطامات یہ سوفسطائی لغویات نہیں پسند کرتا۔"

کتاب نہایت خوبی و سلیقہ کے ساتھ نہایت عمدہ کاغذ پر طبع ہوئی ہے اور قصہ بہ حیثیت مجموعی دلچسپ و قابل مطالعہ ہے۔ ملنے کا پتہ :۔ منشی عبداللطیف شاد۔ نمبر ۴ ۲۱ گول پٹھیا کھیت باڑی۔ فرسٹ کراس لائین۔ بمبئی نمبر ۴۔

صحابیات از مولانا نیاز فتحپوری۔ سلسلہ مطبوعات صوفی نمبر ۲ صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ منڈی بہاؤالدین گجرات

مولانا نیاز فتحپوری کے قلم سے ازواج النبی صلعم اور دیگر انصار و مہاجر خواتین اسلام کے حالات زندگی میں یہ اک مفصل تصنیف شایع ہوئی ہے۔ سرورق نہایت دیدہ زیب اور خاص اہتمام سے طبع کیا گیا ہے عام طباعت و کتابت بھی اچھی ہے۔ کتاب میں اُنہاون خواتین اسلام کی حالات زندگی درج ہیں اور چونکہ عہد اسلام کے ابتدائی زمانہ کے حالات ہیں اس لئے متعدد مسائل مذہبی فقہ و حدیث کا ضمناً ذکر آجاتا ہے۔ آغاز کتاب میں ایک مفصل و مبسوط مقدمہ جس میں عورت کی حیثیت مذہب اسلام میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ بالخصوص اس زمانہ میں کہ عورتوں کے متعلق روز نئے مسائل اور نئی ضروریات سامنے آتی ہیں اسلام کی نامور خواتین کی پاک زندگیاں ہمارے لئے خاص طور سے مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہیں قیمت بلا جلد ۲؍ مجلد سے

ناقد

نقد و نظر

نوبل پرائز کے نام سے جو انعامات سویزرلینڈ میں قایم ہیں اور ہر سال کسی مشہور سائینس داں یا ادیب یا ماہر سیاست کو قیام امن کی خاطر دئے جاتے ہیں ان کا قایم کرنیوالا الفرڈ نوبل ایک سائینٹسٹ تھا جس نے ڈاینامائیٹ ایجاد کیا وفات کے وقت اس کا سرمایہ دو کروڑ باسٹھہ لاکھ سے متجاوز تھا اور اس نے یہ تمام رقم ان انعامات کے لئے وقف کردی علاوہ طبعیات، کیمیا، علم البدن یا طب کے ایک انعام ادب کے لئے اور ایک بقائے امن کے لئے دیا جاتا ہے اور ہر ایک کی رقم تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے۔

جولائی ۱۹۲۳ء میں فرانس نے ایک ایسا قانون پاس کر دیا جس کی رو سے کثرت اولاد کی طرف لوگوں کی توجہ ہو اور افزایش نسل کو بار دوش نہ سمجھا جائے۔
جس خاندان میں تین بچے موجود ہوں اُس کو ہر جدید بچہ کے لئے جسکی عمر ۱۳ سال سے کم ہو سولہ برس کی عمر تک ۹۰ فرانک سالانہ کا وظیفہ دیا جائے گا۔ اس امداد کے علاوہ جو حکومت کی طرف سے ہے مختلف جماعتیں اپنی طرف سے بھی اس مقصد کے لئے کچھہ امداد کرنا چاہتی ہیں۔

بمبئی میں دلشاد بیگم حال ہی میں جے۔ پی۔ یا مجسٹریٹ مقرر ہوئی ہیں۔ آپ دوسری خاتون ہیں جو اس عہدہ پر فایز ہوئی ہیں اور عدالت میں اجلاس فرماتی ہیں۔

مسز الینر بتھہ انڈرسن ایک امریکی خاتون نے تین کروڑ روپیہ اس مقصد سے وقف کیا ہے کہ اس سرمایہ سے اک جماعت ایسی قایم کی جائے جس کا مقصد انسان کی مدت عمر میں اضافہ کی تدابیر اختیار کرنا ہو۔ نیویارک کا مشہور اخبار ٹریبیون لکھتا ہے کہ اس جماعت نے مختلف ممالک

میں کافی کامیابی حاصل کی ہے۔

"بچوں کے حقوق" کے عنوان سے بعض خواتین اور ان کے اخبار ایک جدید تحریک کا آغاز کرنا چاہتی ہیں۔ اس وقت تک مردوں کے حقوق، عورتوں کے حقوق، مزدوروں کے حقوق، وغیرہ وغیرہ بہت سی تقسیمیں کی جا چکی ہیں۔ اور بنی آدم کو مختلف و متضاد حیثیتوں میں پیش کیا گیا ہے لیکن "بچوں کے حقوق" سے ایک ایسے فتنہ کی بنیاد پڑ جانے کا اندیشہ ہے جس سے زیادہ سخت و تکلیف دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ عہد طفلی بے خبری و راحت کا مرادف سمجھا جاتا ہے لیکن اب حقوق کا سوال پیدا کرنے کے بعد یہ سکون محض، اک محشر اضطراب بن جائے گا۔ بچوں کے حقوق بچوں کے دل میں نقش کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بڑے بڑے حروف میں دیواروں اور شہر کے نمایاں مقامات پر ان حقوق کو خوبصورت اور نظر فریب انداز میں تحریر کر دیا گیا ہے اور ان کو بالترتیب شمار بھی کرا دیا ہے مثلاً۔

(۱) اچھے گھرانے میں پیدا ہوں (۲) اچھا کھائیں (۳) اچھے مکان میں رہیں (۴) عمدہ تعلیم ہو اور آخر میں یہ جملہ ہے کہ "بچہ جانتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور جب تک اس کو وہ نہ مل جائے گا وہ کبھی خوش نہیں ہوگا"

بنارس ہندو یونیورسٹی نے حال میں ایک جدید بورڈنگ ہاؤس کا اضافہ کیا ہے جو لڑکیوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ نیز پنڈت مدن موہن مالوی صاحب نے یہ اعلان بھی فرمایا ہے کہ یونیورسٹی مذکور میں تمام تعلیمی سہولتیں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یکساں ہیں۔ لڑکیاں انہیں جماعتوں میں جہاں لڑکے تعلیم پاتے ہیں بخوشی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہیں۔

ہندوستان میں مختلف مذاہب اور جماعتوں کو جداگانہ حق انتخاب دیا گیا ہے، اور اگرچہ اس اصول کو کسی نے کبھی صحیح نہیں تسلیم کیا لیکن "مخصوص حالت" کی وجہ سے اس کو جائز قرار

دیا گیا ہے۔ سلطنت ترکی میں بھی مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے لوگ آباد ہیں اور ہمیشہ باہمی اختلافات و فسادات کی اطلاعات بھی آتی رہی ہیں، لیکن وہاں کی حکومت نے جداگانہ حق انتخاب کے اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ اسی طرح دوسرے ممالک کے باشندوں کو ترکی عدالت میں خاص حقوق نہیں دئے گئے حالانکہ ہندوستان میں انگریزوں کے لئے گویا عدالت ہی علیحدہ ہے۔

انگلستان میں برٹش امپائر اگزیبشن (نمائش مصنوعات سلطنت برطانیہ) کے لئے جو اہتمام اور طیاریاں ہو رہی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہوشمند قومیں باوجود کثرت دولت و اسباب فراغت کے اپنی ترقی کے لئے کیا کچھ نہیں کرتی ہیں۔ کناڈا اور آسٹریلیا تقریباً ۵ لاکھ پونڈ، اور ہندوستان تقریباً دو لاکھ پونڈ (تیس لاکھ روپیہ) اس نمایش پر صرف کر رہے ہیں۔ نو آبادیات مغربی افریقہ ایک لاکھ پونڈ اور نیوزیلینڈ و جنوبی افریقہ کا خرچ تقریباً دو لاکھ پونڈ ہوگا۔ صرف صوبہ برہما نے چالیس ہزار پونڈ اخراجات نمائش کے لئے منظور کئے ہیں۔
اسی طرح کی رقوم نو آبادیات مثلاً فیجی، ملایا، ہانگ کانگ، اور مشرقی افریقہ وغیرہ نے منظور کیں ہیں۔

ذاتی شوق اور اشغال تفریح کو مفید و کارآمد بنانے کی نہایت عجیب وغریب مثالیں ملتی ہیں۔ حال میں مسز الینر جمہ گرے کا اڈنبرا میں انتقال ہوا۔ اس خاتون کی عمر ۹۳ سال کی ہوئی اور اس طویل مدت میں اس نے انسانی و جمادی اجسام کے آثار (Fossils) چالیس ہزار کی تعداد میں جمع کئے جو اب برٹش میوزیم نے اپنے مجموعہ کے لئے خرید لئے ہیں۔

کوہمالہ پر اب دوسری جماعت حملہ کرنے والی ہے اور اس کی بلند ترین چوٹیوں تک

پہونچنے کی جوکوشش ایک عرصہ سے کی جارہی ہے اس میں اس جدید مہم کا غالباً سب سے زیادہ حصہ ہوگا۔ اس سیلاب ۲۳۰۰۰ فٹ کی بلندی سے آگے گذرنے کا وقت آگیا ہے۔ اس سفر میں تصاویر حاصل کرنے کے لئے جو آلہ (کیمرہ) استعمال کیا جانے والا ہے اس کو خاص اہتمام سے ایک خچر پر بار کراکر ساتھ لیجایا جائے گا اور وہ ۱۶۰۰۰ فٹ کی بلندی تک بغیر کسی دقت کے تصاویر لے سکے گا۔ اس منزل کے بعد آلہ کو خچر سے اُتار کر جداگانہ اجزا میں منتقل کر دیا جائے گا اور ایک زبردست برقی قوت کی مدد سے اس سے تصاویر لیجایں گی۔ لیکن اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید یہ صورت بھی کامیاب نہ ہو اس لئے خیال ہے کہ بالآخر ایک دوربین کی مدد سے تصاویر لیجائیں گی جو دہائی میل کے فاصلہ سے نہایت صحیح تصویر کھینچ سکے گی۔

"ناظر"

سلکِ جواہر

بیادِ پنڈت جواہر لال نہرو

از مولوی اقبال احمد سہیل ایم۔اے ایل ایل بی

نیرنگیِ چرخ! تیرے صدقے　　زنداں ہو نشیمنِ جواہر
خوکردۂ سایۂ تنعم　　پروردۂ دامنِ جواہر
وہ جس کے وجود کی بدولت　　ہند اب بھی ہے معدنِ جواہر
جس کے فیضِ سخن سے اب تک　　ہے سامعہ مخزنِ جواہر
آنند بھون سے کیا غرض اب　　ہر دل ہے نشیمنِ جواہر
پہلو میں دلِ شرار پیکر　　شمعِ تہِ دامنِ جواہر
اخلاص کی اک برقِ جانسوز　　تیغِ سپہ افگنِ جواہر
آئینۂ محبتِ وطن کا　　وہ عارضِ روشنِ جواہر

شیدائے وطن فدائے ملت
سرتا بہ قدم دلائے ملت

کھدّر اس پھول سے بدن پر　　غیرت دہِ اطلس مشجر
اخلاص کی دلفریب تصویر　　ایثار کا جان نواز پیکر

بھارت کا سپوت آنارش ملک، اقبالِ وطن بہارِ کشور
اخلاق کی صورت مجسّم ایمان کا شعلۂ مصوّر
ہند اس کے فیوض سے چراغاں ملک اس کے قدوم سے منوّر
الفاظ میں شہد کی حلاوت انداز میں جلوۂ گُل تر
آزادیٔ ہند کا ہراول حزب وطنی کا میر لشکر
وہ ہمّتِ مستقل کا مرکز وہ وحدتِ مدعا کا محور
وہ عزم کا ایک حصن روئین وہ ضبط کا جوہر مقطر
وہ حسنِ خیال کا مرقع اور صدق مقال کا وہ مظہر
ہندو مسلم کر سچیّن سکھ سب اس کے خلوص کے ثناگر
پنڈت جی کا عصائے پیری شوکت کا عزیز تر برادر
وہ قوت بازوئے محمّد آزاد کا غمگسار و یاور
پائے شرفِ قبولِ یا رب اقبال کا ہدیہ محقر

قد تو بہار ایں چمن باد
روئے تو فروغ انجمن باد

غزل

از جناب سجاد علی انصاری صاحب بی۔ اے ایل ایل بی

سرمستی انتظار کب تک امید کا اعتبار کب تک

اب شوق کو خود ہی حسن کرے — اف نہ ہجر یار کب تک
اے گمرہ منزل تمنا — یہ شغل جنون و خار کب تک
اب ہوش کی بھی تو کچھ خبر لے — پیراہن تار تار کب تک
مانا کہ سکون غم ہے بہتر — پر غم کا بھی اعتبار کب تک
آوارۂ رنگ و بو ہوں لیکن — یہ شعبدۂ بہار کب تک
جا راز کو اپنے فاش کردے — دلداری راز کب تک
اے بیخبر رموز ہستی — امید کا یہ خمار کب تک
خود عرش پہ جا کے کھینچ لاؤں — یہ زحمت انتظار کب تک

الصلح للبقا

از جناب حافظ سید فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی

حیف ہے حیف ہے اے ہستی اجسام پرست — آہ! تیرے لئے ہو وجہہ نفار زم وستیز
شیوۂ جنگ تو ہو نشۂ یمنائی الست — اور شکست ایسی کہ ہو صلح سے آخر نہ گریز

بہرہ ور کچھ بھی جو ہو لذتِ روحانی سے — پھر یہ دنیای دنی ہو نہ کبھی تجھپر تنگ
پائے عمر ابدی زندگی فانی سے — عار پیکار سے آئے سبب ننگ ہو جنگ

خردِ تفرقہ انداز ہے بنیادِ نزاع — کاش ہو اس کی رہِ رشتہ دوانی مسدود
تفرقوں میں بھی ہو توحید محکم اجماع — پھر یہ دنیا نظر آجائے بہشتِ موعود

۱٦۸

آؤ دنیا کو یہ عبرت کا سبق سکھلائیں　　تا کہ ہر گبر و نصاریٰ ہو فرید اور جنید
بزم کثرت میں وہ وحدت کا سماں دکھلائیں　　عمر خالد سے جدا ہو نہ جدا عمر سے زید

شذرات

جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ کا جلسہ تقسیم اسناد ۹۔ مارچ کو منعقد ہوا۔ یہ تقریب ہر دار العلوم کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن جامعہ کے مخصوص حالات اور مختلف مشکلات نے اس جلسہ کو بھی ایک جداگانہ حیثیت دیدی ہے۔ سال بھر کی عملی زندگی پر نظر، اکابرین قوم کو جامعہ کے صحیح حالات کی اطلاع، موجودہ ضروریات اور آیندہ کے پروگرام کے متعلق مشورہ اور قرار دینا یہ سب امور ایسے ہی اجتماع کے موقع پر انجام پاتے ہیں۔ اس مرتبہ نہ صرف مولانا محمدؐ علی و شوکت علی صاحبان پہلی مرتبہ شریک جلسہ ہوے بلکہ تمام اکابرین قوم کا اتنا بڑا مجمع تھا کہ بہت کم ایسی تقریبات میں نظر آتا ہے۔

مسٹر محمد مارماڈیوک پکھتال کا خطبہ صدارت اسلامی تعلیم اور حقایق قرآنی کی ایک فصیح و بلیغ تفسیر تھی۔ مسٹر پکتھال کی انگریزی زبان سے صحیح مخارج و تلفظ کے ساتھ آیات قرآنی کی تلاوت سُننے والوں پر خاص اثر کئے بغیر نہ رہتی تھی۔ اور جس خوبی وضاحت سے انہوں نے تعلیم اسلام کو آزادی خیال اور صدق مقال کی بنیاد قرار دیکر موجودہ دور مغربیت میں اس کی اہمیت کو ظاہر کیا وہ بجائے خود سبق آموز ہے۔ اور آیندہ نسل کی کامیابی کا دارومدار اسی ایک اصول پر قرار دیا جاوے تو بیجا نہیں محمدؐ اسلام صلعم کا ارشاد کہ "صحیح مذہب محض ایک نصب العین نہیں ہے جس کو دنیا کی عملی زندگی سے تعلق نہ ہو" اسی حقیقت کا اعادہ ہے۔ مسٹر پکتھال کے نزدیک اسلام "آزادخیالی و عقلیت کا مذہب ہے" اگرچہ انسانی عقل جب حقایق کا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کو اپنے حدود کو نہ بھول جانا چاہئے اس لئے کہ جن چیزوں کے سمجھنے کی وہ کوشش کرنا چاہتی ہے وہ نہایت عظیم الشان ہیں اور ان کی عظمت و شان ہی وجود باری کا ثبوت ہے۔

آگے چل کر مسٹر پکتھال نے مذہب اسلام اور دنیا کے تعلقات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اکثر بھائی ایک شدید خوفناک غلطی میں مبتلا ہیں

ان کا قول وفعل ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان قوم اور دنیا بر سرپیکار ہے۔ حالانکہ سچا اسلام تو دنیا کے لئے ہے نہ کہ دنیا کا مخالف اس لئے کہ وہ حق کی حمایت و باطل کی مخالفت کے لئے آیا ہے اور صرف مسلمان قوم ہی کے لئے نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی ہو نیکی کو بدی کے مقابلہ میں پیش کرتا ہے۔

مسٹر پکتھال کے خطبۂ صدارت کا آخری حصہ مسلمان قوم سے اپیل ہے جس میں انہوں نے موجودہ مادی ترقیات اور اسلام کا رشتہ واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک ہم کو دنیا کی ترقی تمدن میں صرف مسلمان کی حیثیت سے حصہ لینا چاہئے تاکہ ہم دہریت و مادیت کے اجزا کو اپنے نور ایمان سے زائل کرسکیں۔ مذہب و شریعت کی ابتدائی سادگی کو ہر حال میں برقرار رکھنے کی سعی کرنا چاہئے اور نئی نئی باتوں، جدید اختراعات، اور جدید ترقیات سے خوفزدہ نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ " پیغمبر اسلام صلعم جدید ترین (ماڈرن) انسان ہے اور قرآن مقدس دنیا کی جدید ترین کتاب ہماری کتاب اور ہمارا پیغمبر ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہر عصر کے لئے وہ ایسا پیغام پہنچاتے ہیں جس کی اس عہد کو ضرورت ہوتی ہے۔

جن باتوں کو اسلام میں آج تم قدیم و بیکار پاتے ہو وہ فی الحقیقت معمولی دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں اور جو ایک وقت ہی کے لئے وضع کی گئی تھیں۔ ان باتوں کو نکال دو اور پھر تم دیکھو گے کہ اسلام اس سبب سے فنا نہیں ہوسکتا جب کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ دوبارہ اپنی قدیم شان کے ساتھ اس گوہر کی طرح چمک اٹھتا ہے جس پر سے صدیوں کی گرد ہٹا کر صاف کردی گئی ہو۔

مجلس ملیہ انگورہ اور غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے جو فیصلہ مسند خلافت، اور سلطان عبدالمجید وخاندان عثمانی کی معزولی کا حال میں کیا ہے۔ اس کے متعلق غالباً سب سے زیادہ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانان ہند کو تشویش ہے۔ ہمارے بعض اکابرین ملت کا خیال ہے کہ خلافت اسلامیہ کے منصب کو ختم کردینا احرار ترک کا مقصد نہیں ہے۔ مگر جن حضرات کو ترکوں کی موجودہ روش، مغرب

مغرب پرستی اور جدید نقطہ نظر کا کچھ بھی اشارہ ہے وہ اس خیال کو بے بنیاد سمجھتے ہیں ذرا بھی تامل نہ کریں گے۔

اس عرصہ میں حکومت انگورہ پر جس قسم کی نکتہ چینی اخبارات میں ہوئی ہے وہ کسی طرح غیر متوقع نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ہم کو تسلیم ہے کہ ترکی قوم کی گذشتہ صد سالہ مصائب و قربانیوں کا ہندوستانی مسلمانوں نے پورا لحاظ نہیں کیا۔ بے شک انہوں نے اپنی مشکلات سے تنگ آکر اپنی گردن کو اس طوق سے آزاد کرا لیا جو خلافت کے اقتدار اور خاندان شاہی کے نام سے ترکی قوم کی گردن میں تھا لیکن کیا اس اہم ذمہ داری کو بھی انہوں نے محسوس کیا جو چند صدیوں سے ان کے سر پر تھی اور جس کو ہمیشہ طوعاً و کرہاً وہ قبول کرتے رہے ہیں۔ منصب خلافت، شیرازۂ اسلامی بن سکتا تھا۔ اور آثار نظر آتے تھے کہ عین اس وقت جبکہ عالم اسلام اس حقیقت سے روشناس ہو چکا ہے کہ ایک بین الاقوامی رشتہ اخوت پائیدار و مستحکم کیا جائے اسی موقع پر حکومت انگورہ کا یہ فیصلہ ہر حیثیت سے انقلاب زا، اور دلخراش ہے۔ "جامعہ" نے شروع سے مسئلہ خلافت کی اس حیثیت پر توجہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اکابرین قوم کی مصلحت اندیشی اور اہل قلم کی پُر اسرار خاموشی نے پوری کامیابی کا موقع نہ دیا۔ بہر حال ایک مرتبہ پھر ہم درخواست کریں گے کہ یہ موقع اپنی اہمیت و نزاکت کے اعتبار سے اس قسم کا ہے کہ ہر وہ شخص جو ان مسائل کے متعلق کوئی قطعی رائے رکھتا ہے اس کو بر ملا ظاہر کر دے اور اس طرح قوم کو ایک نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دے۔

دنیائے شعر میں جن لطیف استعاروں نے دلوں کو مسخر کیا ہے ان میں شراب و خمارے کے ساتھ مست خواب کا بھی ایک مرتبہ ہے۔ عرفی کی مشہور قسموں میں اس قطرۂ شراب کی قسم نہایت پر کیف ہے جو جام صبوحی کے خالی کر دینے پر اس میں رہ جاتی ہے، اسی طرح نشۂ خواب کی خمار بھی اپنی رعنائیوں کے لئے کسی سے کم نہیں اور جب کہ نیند کی گہرائیاں خواب عدم کی حریف

ہوئی تو اس بیداری کی طالع بختی کا کیا کہنا! ایسی ہی ایک نیند تھی جس میں یادش بخیر! ہماری مسلم لیگ مست خواب رہی اور ایسی ہی خمار شکنی تھی جس کا جلوہ دہلی کے ایک خاموش کمرہ میں بعض ارکان لیگ کی مخصوص دلچسپیوں کا مرجع قرار پایا۔ خداوندان لیگ کی ہمتوں پر آفریں ہے کہ وہ گڑے مردے اکھاڑتے ہیں اور متوقع ہیں کہ اپنی مسیحا نفسی سے وہ ان کو زندہ جاوید بنادیں

غلطیہائے مضامین مت پوچھ

لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں!

مسلم لیگ کے حیات تازہ سے اگر مسلمانان ہند کی سیاسیات میں کسی خوشگوار تبدیلی کی امید کیجائے تو بلا شبہ کوشش کرنا چاہیئے کہ مسلم لیگ پھر نیا جنم لے۔ اس لئے کہ اب اگر مسلمانوں کے کسی حصہ کو لیگ کے وجود سے دلچسپی ہوسکتی ہے تو وہ ان اصولوں پر تو ممکن نہیں جو اس نے اپنے ابتدائی دورحیات میں قرار دئے تھے کامیابی کی اگر کوئی امید ہوسکتی ہے تو صرف اس صورت میں کہ ہندوستانی سیاسیات کی موجودہ فزا سے اس کا نصب العین جدا نہ ہو اور نہ اس کے طرز عمل میں اس زمانہ کے خلاف کسی قسم کی فرقہ بندی، گروئی یا خود پرستی کو دخل دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے مطالبات کے اظہار کے لئے خلافت کمیٹی میں کیا کمی ہے جو ایک دوسرے آرگنائزیشن کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ شائد خودنمائی کے لئے ہر مرتبہ نئے انداز کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، اور اس جستجو میں روز نئے بت تراشے جاتے ہیں۔

حکومتِ انگلستان کی موجودہ پارلیمنٹ میں کئی خواتین ممبر ہیں جن میں سے اکثر کا ذکر جمیل ان صفحات میں آچکا ہے۔ حال میں ایک جدید قانون دارالعلوم نے منظور کیا ہے اور امید کیجاتی ہے کہ اس کے نفاذ میں بھی زیادہ عرصہ نہ لگے گا، جس کی رو سے اکیس سال کی عمر والی عورتوں کو حق انتخاب حاصل ہوجائے گا۔ اس طرح رائے دہندہ عورتوں کی تعداد انگلستان میں

مردوں سے پانچ لاکھ زیادہ ہو جائے گی۔ گویا کثرت رائے عورتوں کے ہاتھ میں ہوگی۔
اس قانون کے متعلق مباحثہ بھی خصوصیت سے دلچسپ تھا اور سب سے زیادہ سبق آموز و عبرت انگیز وہ دلاویز تقریر تھی جو اس موقع پر ڈچیز آتھول نے فرمائی۔ خاتون موصوف طبقہ امراء کے اعلیٰ خاندان کی فرد اور سوسائٹی کی مشہور خواتین میں سے ہیں۔ آپ نے عورتوں کو اس کثرت سے ووٹ کا حق دئے جانے کی سخت مخالفت فرمائی اس لئے کہ آپ کے نزدیک یہ حق "کم سمجھ کم حیثیت اور جاہل عورتوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا جن سے امید نہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر استعمال کر سکیں۔ حالت تو یہ ہے کہ ان عورتوں کا گھر نہ در، ماری ماری پھرتی ہیں پھر کیا توقع ہو سکتی ہے کہ ان کو اتنی خبر بھی سیاسیات کی ہو جس قدر کہ دوسرے لوگ اپنے ہمنشینوں سے باتوں باتوں میں معلوم کر لیتے ہیں۔"

یہ وہ خیالات ہیں جو پارلیمنٹ کی عورت ممبر عورتوں کے حقوق کے متعلق رکھتی ہے!
ترقی قومی کی سب سے بڑی علامت اگر عورتوں کا سیاسیات میں مردوں کے ساتھ مساویانہ حصہ لینا ہے تو بلاشبہ اس آزادی رائے کی قدر کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر ہمدردی انسانی اور مساوات باہمی کے یہ ہی نظارے ہیں تو پھر ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم عورتوں کی نرم دلی، فطری محبت، جانثوری و ہمدردی کا ماتم کریں جو یورپ کی ترقی یافتہ سوسائٹی میں اس وقت نظر آتا ہے تعجب ہے کہ انگورہ کی۔ ترقی پذیر حکومت نے اس وقت عورتوں کو پارلیمنٹ میں بیٹھنے کے حق سے محروم کر دیا تھا لانکہ ان کے دوسرے بھائی مصر و قسطنطنیہ میں "تیرہ سو برس کی شدیدنا انصافیوں" کی تلافی کر رہے ہیں، اور بزعم خود تعداد ازدواج کو مسدود کرکے جدید "دور ترقی" کا اجراء فرمانے والے ہیں!

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے "حقیقتوں" کو عریاں کرنے میں جو ناقابل

تصانیف مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

تاریخ القرآن	جس میں قرآن حکیم کے ابتداے نزول سے لیکر آج تک کے تمام تاریخی حالات اور اس کے متعلق ہر قسم کی معلومات اور لطیف علمی مباحث نہایت تحقیق اور اختصار کے ساتھ مختلف زبانوں کی مستند کتابوں سے اخذ کرکے لکھے گئے ہیں قیمت عہ، مجلد عہ
خواتین	ابتداے اسلام سے آج تک کے تینتیس مشہور مسلمان خاتونوں کے معتبر تاریخی حالات قیمت عہ
حیات جامی	مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی نہایت مکمل اور مقبول سوانح عمری ہے قیمت ۸ر
حیات حافظ	مولانا حافظ علیہ الرحمۃ کے مکمل حالات زندگی کے ساتھ ان کے کلام پر نہایت دلاویز تنقید قیمت عہ
محجوب الارث	فقہ اسلامیہ کے مشہور مسئلہ پر اجتہادی رنگ میں دلچسپ بحث ہے قیمت ۴ر
الوراثۃ فی الاسلام	قانون وراثت پر مولینا کا مجتہدانہ کارنامہ (عربی) قیمت ۸ر
تاریخ الامت	اسلامی تاریخ کو پہلی مرتبہ مولانا نے مسلسل وصاف اردو میں بیان کیا ہے جس کے چار حصے سیرۃ الرسول، خلافت راشدہ، عہد بنی امیہ و بنی عباس تک شایع ہوچکے ہیں قیمت ہر حصہ کی جداگانہ ہے۔ مکمل عہ

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ

شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

کی

جدید مطبوعات

۱۔ **تاریخ الدولتین** (از مولانا نیاز فتحپوری) بنی امیہ و بنی عباس کے عہد کی سب سے زیادہ موثر دلکش قابل استناد تاریخ ایک جلد میں صرف اسی کتاب میں نظر آئیگی جوجرجی زیدان مصری کی شہرۂ آفاق تاریخ اسلامی کی بنیاد پر اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے۔ طرز بیان کی خوبی اور عبارت کی دلکشی کے لئے مولانا نیاز فتحپوری کا نام کافی ضمانت ہے۔ قیمت

۲۔ **انتخاب کلام میر** (مرتبہ مولوی نورالرحمن۔ بی۔ اے) اردو زبان کے بہترین شاعر استاذ الاساتذہ ہونیکی حیثیت میر کے ضخیم کلام کا انتخاب مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے۔ لیکن جس سوز و گداز نے میر کو خدائے سخن بنایا ہے اس کے صحیح نمونے صرف اسی انتخاب میں نظر آتے ہیں۔ جو نہایت مختصر ہونے کے ساتھ ہی میر کے تمام دیوان کا جوہر ہے ابتدا میں حالات زندگی اور ایک زبردست مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں اردو شاعری کی تاریخ محاسن کلام میر اور موجودہ فن تنقید کے اصول پر اس عہد کے شعراء کا موازنہ شعراء قدیم سے کیا گیا ہے۔ مجلد قیمت عہ

۳۔ **عرض جوہر** مولانا محمد علی مدظلہ کی غزلیات کا مجموعہ اس سے قبل شایع ہوچکا ہے لیکن زندان بیجاپور کے مکاشفات اس میں بھی نہیں ہیں **عرض جوہر** میں مولانا کا تازہ ترین کلام اور وہ بے نظیر غزلیں موجود ہیں جو صرف بیجاپور کے زندانی ہی کی زبان سے ادا ہوسکتی تھیں قیمت ۸ر

۴۔ **الصراط المستقیم** (تفسیر سورہ انفال و توبہ۔ از مولانا خواجہ عبدالحی صاحب) خواجہ صاحب کی تفسیر القرآن کے بعد اب یہ جدید تصنیف شایع ہوئی ہے۔ جس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو خواجہ صاحب کا حصہ ہوگئی ہیں۔ مباحث قرآنی پر جس وضاحت و دلکشی کے ساتھ خواجہ صاحب نے قلم اُٹھایا ہے وہ صرف انہیں سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ۱۲ر

:- باہتمام عبدالعلی خاں نیر :-

الله اکبر



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

مطبوعات شرکت کاویانی برلن (جرمنی)

(صرف مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ ہندوستان میں ان کتابوں کو فراہم اور فروخت کرتا ہے)

۱۔ **سفرنامہ حکیم ناصر خسرو** | معروف شاعر روشنائی نامہ و سعادت نامہ فارسی مصنف چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوا۔ اس عہد کے بلاد اسلامیہ کے چشمدید حالات نہایت دلچسپ و عبرت آموز جس میں مصنف کی دو غیر مطبوعہ نایاب مثنویاں فلسفہ حکمت پر شامل ہیں سرورق و سرنامہ اصل ایرانی نسخہ کے مطابق مطلا و رنگین۔ نہایت اعلیٰ دبیز چکنا سفید مثل چینی کے پلیٹ کے چمکیلا طباعت نظر افروز قیمت ....

۲۔ **زاد المسافرین** | حکیم ناصر خسرو کی یہ دوسری معرکۃ الآرا کتاب ہے جو عرصہ سے نایاب تھی اور اب مطبع کاویانی نے نہایت خوبی و اہتمام کے ساتھ طبع کرائی ہے فلسفہ و تصوف و حکمت اسلامی کی یہ مستند کتاب ہے قیمت

۳۔ **گلستان** | شیخ سعدی شیرازی کی شہرۂ آفاق کتاب جدید قالب میں نظر آتی ہے کاغذ عمدہ طباعت نفیس اور سرورق خوبصورت قیمت ....

۴۔ **تیاتر** | از مرزا ملکم خاں ناظم الدولہ جن کی عملی و قلمی جد و جہد سے ایران دوبارہ زندہ ہوا۔ ایران کے تین شہ ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں گذشتہ صدی کے نظام حکومت ایران کی ابتری کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ فارسی جدید کے قدردان اس تحفہ کو بڑی قدر سے قبول کریں گے قیمت ....

۵۔ **موش و گربہ فارسی** | از خواجہ عبید زاکانی جو آٹھویں صدی کا ہجوگو اور مشہور شاعر تھا چوہے بلی کی جنگ کا قصہ جس میں ابنائے عصر کی ہجو ملیح ہے جو عہد حاضر کے لیے بھی یکساں برمحل ہے ہر صفحہ پر رنگین و دلاویز تصاویر نظم نہایت دلچسپ و مہذب بچوں کے واسطے بھی نہایت موزوں ہے قیمت ....

۶۔ **تاریخ سنی ملوک الارض و الانبیاء (عربی)** | مؤلفہ حمزہ ابن الحسن اصفہانی ۳۵۰ھ میں لکھی گئی انتہائی کاوش کے ساتھ قدیم تواریخ فارس و روم و یونانی مصر عراق شام و عرب کے متعلق تمام صحیح و معتبر سنین کی تفتیش و تحقیق ہے شائقین تاریخ کے لیے نہایت دلچسپ و مفید تحفہ ہے قیمت ....

۷۔ **نصاب الصبیان** | فارسی جدید کے شائقین اور طلباء کے واسطے بہترین مجموعہ نظم ہے قیمت

۸۔ **رہنمائے پسران** | بچوں کو خط و کتابت کے پیرایہ میں عمدہ نصیحتیں کی ہیں ....

۹۔ **تلغراف بی سیم** | فارسی میں وائرلس ٹیلیگرافی پر قابل قدر تصنیف ہے جس میں متعدد نقشے تصویریں اور بلاک شامل ہیں قیمت ....

۱۰۔ **لغات المانی بفارسی** | فارسی و جرمن زبان کی لغت قیمت ....

قرآن مجید

معہ ترجمہ جدید

فتح الحمید

اس وقت تک جس قدر نسخے کلام مجید کے معہ ترجمہ شائع ہوئے ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ دلکش
و واضح و روشن ہے ترجمہ نہایت سلیس بامحاورہ حامل متن ہے از مولینا فتح محمد خاں صاحب جالندھری ملک کے
مستند اور قابل وثوق اہل علم کی اس ترجمہ کے متعلق بہترین رائیں ہیں جو شروع میں درج کردی گئی ہیں
۔۔۔ سائز کی حامل ہے جو ظاہری و معنوی دونوں خوبیوں میں قابل تعریف اور لائق زیارت ہے شروع
میں کعبہ و مدینہ منورہ کے رنگین و خوشنما بلاکس سے مزین جلد پر نام سنہرے حروف میں کندہ ہے ہدیہ ۔۔۔

مجموعہ کلام جوہر

مولینا محمد علی مدظلہ کے کلام کا مجموعہ اب دوسری بار طبع ہوا ہے مولوی عبدالماجد صاحب بی اے نے ایک مکمل و بسیط و پُر بحث مقدمہ میں مولینا کے حالات زندگی اور کلام پر مکمل ریویو کیا ہے با تصویر

قیمت ۲ر



تاریخ الامت

ابتدائے اسلام سے آج تک کی مکمل تاریخ ہوگی جس کے

عرض جوہر

مولینا محمد علی مدظلہ کے کلام کا پہلا مجموعہ جب شائع ہوا تو اس میں ان کا تازہ ترین کلام جو بیجاپور جیل میں مرتب ہوا تھا شائع نہ ہوسکا مولینا کی رہائی کے بعد یہ دوسرا حصہ جس میں تمام کلام موجود ہے شائع کیا گیا قیمت

۸ر

چار حصے شائع ہوچکے ہیں۔ نہایت معتبر و مستند ماخذوں سے آسان عام فہم سلیس اور دلکش زبان میں اس سے بہتر بطرز جدید ابتک کوئی تاریخ امت اسلامیہ کی موجود نہیں ہے کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان کے پاس اس کا ایک نسخہ رہنا ضروری ہے حصہ اول سیرۃ الرسول قیمت ۱۲ر مجلد ۔۔۔ حصہ دوم خلافت راشدہ قیمت ۔۔ مجلد ۔۔ حصہ سوم خلافت بنی امیہ قیمت ۔۔ حصہ چہارم خلافت عباسیہ قیمت ۔۔

محجوب الارث | فقہ اسلامیہ کے مشہور مسئلہ پر اجتہادی رنگ میں دلچسپ بحث ہی قیمت ۴ھ

تاریخ القرآن | (از مولانا محمد اسلم جیراجپوری) جس میں قرآن حکیم کے ابتدائے نزول سے لیکر آج تک کے تمام تاریخی حالات اور اس کے متعلق ہر قسم کی معلومات اور لطیف علمی مباحث نہایت تحقیق اور اختصار کے ساتھ مختلف زبانوں کی مستند کتابوں سے اخذ کر کے لکھے گئے ہیں قیمت عہ مجلد . . . عہر

حیات جامی | مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی نہایت مکمل اور مقبول سوانح عمری ہے قیمت ۸ر

حیات حافظ | مولانا حافظ علیہ الرحمۃ کے مکمل حالات زندگی کے ساتھ ان کے کلام پر نہایت دلآویز تنقید قیمت . . . . عہر

حقائق اسلام | فلسفۂ اسلام پر عقلی دلائل و براہین از مفتی انوار الحق صاحب ایم اے نئی روشنی کے حضرات کے واسطے قابل قدر تحفہ ہی قیمت . . . . عاہ

مکاتیب | نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر دلچسپ پر از معلومات بہترین مجموعہ مرتبہ مولوی محمد امین صاحب زبیری مہتمم تاریخ بھوپال قیمت . . . . عہ

خطبۂ صدارت شیخ الہند مرحوم | بہ تقریب افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ قیمت ۲ر

خطبۂ صدارت مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مدظلہ | بہ تقریب جلسۂ اول تقسیم اسناد جامعہ ملیہ قیمت ۲ر

خطبۂ صدارت | از مولانا محمد علی مدظلہ جو جناب موصوف نے بہ حیثیت صدر انڈین نیشنل کانگریس مقام کوکناڈا ارشاد فرمایا تھا۔ (انگریزی) و اردو . . . . عہ

الوراثۃ فی الاسلام | قانون وراثت پر مولانا کا مجتہدانہ کارنامہ (عربی) قیمت ۸ر

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۴ء | نمبر ۴

جرمنی کی تعلیمی زندگی

(۵) مدارس دیہی

(ڈاکٹر فریڈرک ایرنٹ رایش کے قلم سے)

سنہ ۱۸۶۶ و سنہ ۱۸۷۰ء کی لڑائیوں میں پروشیا اور جرمنی کی فوجیں جب اپنے گھروں کو واپس ہوئیں تو اکثر یہ سننے میں آتا تھا کہ "دشمن کو شکست بسمارک نے نہیں بلکہ جرمن اسکول ماسٹر نے دی ہی کہ جس سے جنگ کے متعلق اگرچہ اظہار خیال مقصود نہیں ہی لیکن جرمن استاد کی کمال تعریف مضمر ہی اور یہ بھی قابل ذکر ہی کہ یہ استاد کسی اعلیٰ مدرسہ کا ہیڈ ماسٹر یا صدر نہیں بلکہ یہ دیہاتی مدرسوں کا اُستاد تھا جس کے ذمہ اس طبقہ کی تعلیم تھی جو اُن عام دیہاتی کسانوں پر مشتمل ہی جس کے پاس اپنی زمین بھی نہیں۔" مدارس دیہی کا مقصد نوجوانوں کی مذہبی، اخلاقی حالت، اور وطن پرستی کو

تعلیم و تربیت کے ذریعے سے ترقی دینا اور ان کو اس قدر عام واقفیت بہم پہنچانا ہے جس کا جاننا ایک شہری کے لیئے ضروری ہے" (دفعہ اول قانون مدارس پروشیا)

جرمنی کے مدارس دیہی کا ڈھنگ بھی ہائی اسکولوں یا مدارس ثانوی کی طرح باقاعدہ نہیں ہے اور چونکہ اس وقت تک تمام سلطنت جرمنی کے لیئے کوئی ایک محکمہ تعلیم نہیں ہے اس لیئے مختلف ریاستیں اپنے طور پر علیحدہ انتظام رکھتی ہیں۔ لیکن یہ تمام ریاستیں ایک امر میں متفق ہیں کہ وہ مدرسہ کی تعلیم کو بطور فرض لازم کرتی ہیں۔ گویا یہ عملی نتیجہ ہے تعلیم و تربیت کی قدر و منزلت کے اس احساس کا جو جرمنی کے مشہور ماہر تعلیم پستالوزی، بیشٹ، کیسیز، فرانکی اور بالآخر اس مشہور ایما نذار ہربرٹ کی کوششوں نے پیدا کر دیا اور یہی لوگ مسئلہ تعلیم ابتدائی کے ماہر و استاد قرار پائے۔ گانوں کے مدرسہ کا ہر استاد روشو کی کتاب "ایملی" پستالوزی کے "لینہارڈ اور گرترود" گویا بر زبان رکھتا تھا اور ان کو مسئلہ تعلیم کی بنیادی داستان قرار دیتا تھا نیز ہربرٹ کی اسکیم جس میں سہولت تعلیم کی خاطر نئے طرز پر درجہ بندی کی گئی ہے اس کے دماغ میں ہر وقت محفوظ رہتی تھی امراء و سلاطین کی فیاضیوں نے نظام تعلیم عام کو بڑی مدد پہنچائی اور اس طرح تعلیمی ترقی اور وسعت کی وہ بنیاد قائم ہو گئی جو موجودہ نظام تعلیمی کا اس ملک میں سنگ بنیاد ہے اور جو واقعی جرمنی کے نظام تعلیمی کی بڑی تقویت کا باعث ہے۔

ہر جرمن بچہ کو چھ سال کی عمر کے بعد مدرسہ میں جانا ضروری ہے اور جبریہ تعلیم کی مدت آٹھ سال قرار دی گئی ہے۔ بالعموم سال تعلیمی یکم اپریل سے تعطیلات ایسٹر کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے مکمل مدرسہ دیہی میں آٹھ جماعتیں ہوتی ہیں اور بالعموم لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا علیحدہ علیحدہ انتظام کیا جاتا ہے۔ جن مقامات پر طلبہ کی تعداد کم ہے وہاں مدت تعلیم چھ سال قرار دی گئی ہے اور دونوں اعلیٰ جماعتوں کا ایک علیحدہ نصاب دو سال کی مدت کا بنا دیا گیا ہے۔ فی الواقع دیہاتی علاقوں میں مدارس صرف دو تین ہی جماعتوں کے ہوتے ہیں اور بعض جگہ تو صرف ایک ہی جماعت ہوتی ہے ایسی حالت میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ

تعلیم پاتی ہیں۔ ایسے مدارس جہاں صاف ایک جماعت ہو اور اُس میں طلبہ بھی مختلف عمر کے ہوں اور اکثر ان کی تعداد بھی اسّی تک پہنچتی ہو اور جہاں صرف ایک استاد ان طلبہ کو تقریباً تمام مضامین سکھاتا ہو۔ میری رائے میں یہ مدارس فن استادی کی قابلیت کی سب سے بڑی آزمائش تصور کیے جائیں تو بجا ہے۔ ان حالات میں طلبہ کو کام دینے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً بڑے لڑکے حقوق شہریت کے درس میں ہوتے ہیں تو ان سے کم عمر دستکاری میں مصروف ہوتے ہیں اور سب سے چھوٹے بچے لکھنا سیکھتے ہوتے ہیں۔ استاد کا کام ایسی حالت میں اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو جاتا ہے کہ طلبہ کی تعداد تو اسّی سے متجاوز ہو اور مکان کی قلت اور روپیہ کی کمی دوسرا درجہ کھولنے کی اجازت نہ دیتی ہوں۔ ایسی صورتوں میں نصف دن کا مدرسہ کھولا جاتا ہے اور تعلیم صبح و شام علیحدہ علیحدہ ہونے لگتی ہے حالانکہ معمولاً صرف صبح ہی کو تعلیم ہوتی ہے۔ چونکہ کسانوں کے بچے کھیتوں پر اور گھروں میں کچھ نہ کچھ کام کرتے اور اپنے خاندان کی مدد کرتے ہیں اسلئے مدارس دیہی میں زمانہ تعطیل فصل کے اوقات میں رکھا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے گاؤں کا استاد خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور بسا اوقات وہ ایک ہی وقت میں شحنہ، شہر کی پرداخت کرنے والا اور کاشتکار بھی ہوتا ہے مدارس ابتدائی میں یہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ مذہب، جرمن زبان۔ حساب (جس میں تھوڑی سی اقلیدس بھی شامل ہے)، تاریخ۔ علم طبقات الارض۔ طبعیات۔ ڈرائنگ۔ اور ورزش، (جمناسٹک)۔ ایک مکمل مدرسہ دیہی میں مبتدی طالب علم کو ہفتہ میں دس گھنٹہ تعلیم دیجاتی ہے لیکن ترقی پذیر طلبہ کی مدت تعلیم ۳۲ گھنٹہ تک پہنچتی ہے۔

مذہبی تعلیم کی نسبت بھی ایک بات سُن لیجئے۔ چونکہ مذہب عیسوی کے بہت سے مختلف فرقے ہو گئے ہیں اس لیے مذہبی تعلیم بغیر کسی اختلاف کے تو صرف ان ہی مقامات پر دیجا سکتی تھی جہاں کے سب لوگ ایک ہی عقیدہ کے ہوں۔ لیکن جن علاقوں میں ہر عقیدہ کے لوگ

ہیں، ہاں ایسی دشواریاں پیدا ہوئیں کہ وہ ایسے متحدالوقت مدارس سے بھی رفع نہ ہو سکیں جہاں علیحدہ علیحدہ مختلف فرقوں کے عالم اپنے اپنے گروہ کو تعلیم دیتے تھے۔

اسی مسئلہ سے معائنہ مدارس کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ گزشتہ دس سال میں پادریوں نے معائنہ مدارس میں کمی کی جس کی وجہ سے صاف ظاہر ہو گیا کہ کلیسا کی قوت برسر زوال ہے مثلاً مذہبی تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے پہلے پادری کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اُستاد مدرسہ کے طرز تعلیم کی دیکھ بھال کرے اور بہ حیثیت ماہر فن کے اگر ضرورت ہو تو اس کو ہدایت بھی کرے۔ لیکن چونکہ اُستاد اکثر آزاد خیال ہوتے تھے اس لیئے ان کے اور پادریوں کے درمیان اکثر جھگڑا ہو جاتا تھا جو ان کو ان مدارس میں بھی اور ٹرننگ کالج میں بھی اکثر ملتے رہتے تھے۔ استاد کو سند ٹریننگ کالج سے ملتی ہے جہاں کہ وہ فن استادی اور اس کے متعلق عملی تعلیم حاصل کرتا ہے اس ٹریننگ کالج کے اساتذہ بھی زیادہ تر کئی قسم کے علما رمذہب ہوتے تھے۔ یہ مذہبی علما رصیغہ تعلیم میں ہر جگہ بھرے ہوئے تھے اور عہدہ انسپکٹری سے لے کر صوبہ تعلیمی بورڈ کے ممبران تک زیادہ تر یہی لوگ ہوتے تھے۔ جن مدارس میں چھ یا چھ سے زیادہ جماعتیں ہوتی تھیں ان کو ایک نگران (ریکٹر) کے زیر انتظام رکھا جاتا تھا اور اس نگراں کا انتخاب جماعت اساتذہ میں سے ایک خاص امتحان کے ذریعہ سے کیا جاتا تھا۔

اس قدیم روش کی مخالفت میں جس پر عام مذہبی تعلیم کا انتظام ہوتا تھا اور پادریوں کی اس مستبدانہ نگرانی اور اثر کے خلاف جو ان کو مدارس پر حاصل تھی اور بہ حیثیت مجموعی استادوں کی کس مپرسی کے باعث استادوں کی جماعت میں متعدد مخالف تحریکوں کی ابتدا ہوئی مثلاً "قوم کے معلمین" جو ابتداءً ایک مدرسہ دیہی کے استاد ولیلم شوانز کی کوشش سے جاری ہوئی اور بڑی سرگرمی سے کام کرتی رہی اور اب کچھ عرصہ سے تو وہ بڑی کامیابی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اور ساتھ ہی اس کے مقاصد میں نہ صرف پیشہ معلمی

لی بہتری کے بجائے اب عرفان حق شامل ہوگیا ہے۔ مختلف محکموں میں دینیات کا اقتدار ہی نہیں بلکہ پیشہ معلمی کے ساتھ جو کم حیثیتی و پستی کا تصور قائم ہوگیا تھا اس نے مدتوں اس جماعت کو ترقی سے باز رکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدرس بھی موچی یا قرون وسطے کے خطوط نویس ہیں جو شہروں میں نظر آتے تھے اس لیئے کہ یہ استثنا، ان استادوں کے جن کے پاس اپنی زمینیں ہوتی تھیں سب کے سب اپنی کمی تنخواہ کے باعث ہم چشموں میں اسی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مثلاً ۱۹۱۴ء میں جنگ سے قبل کوئی استاد فوجی افسر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن "اکابر اساتذہ" کی جماعت کی سرگرم کوششوں نے گزشتہ چند سال میں ان کو ان تکالیف سے نجات دلا دی۔

ایک مدت تک یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ استادوں اور ٹریننگ کالج کے کامیاب اساتذہ میں سخت رقابت رہی۔ اول الذکر تو اپنی علمی لیاقت پر فخر کرتے تھے اور آخر الذکر کو اپنے فن استادی اور صحیح طریقہ تعلیم کے علم و تجربہ پر ناز تھا اور اپنے حریفوں کو بیوقوف اور معلم گری سے بے بہرہ سمجھتے تھے۔ آج ان دونوں حریفوں کی فوج کشی بڑی حد تک مسدود ہو چکی ہے اور ہمارے موجودہ مدارس میں جو عظیم الشان تبدیلیاں ہو گئی ہیں انکی وجہ سے مدارس دیہی کے اساتذہ کے لیئے بھی یونیورسٹی تعلیم کا دروازہ کھل گیا ہے۔ عام طور سے مدارس دیہی ہر جرمن کے لیئے جن میں وہ بھی شامل ہیں جو بعد کو ہائی اسکول میں جائیں گے۔ اس کے ابتدائی درسگاہ کے مرادف قرار دیئے گئے ہیں۔

اکثر ریاستوں نے اس اصول پر عمل کیا ہے لیکن بعض جگہ مثلاً پروشیا میں اس میں کسی قدر فرق ہوگیا ہے یہاں مدارس ابتدائی کے نام سے خاص مدرسے قائم کیئے گئے تھے جن کا مقصد ہائی اسکول کے لیئے طلبہ کو طیار کرنا تھا لیکن حال میں ان کو توڑ دیا گیا۔ زمیندار طبقہ کے مخصوص مدارس کے خاتمہ ہو جانے سے عام مدارس دیہی نے (اور کم از کم ان کی ابتدائی چند جماعتوں نے تو یقیناً) وہی حیثیت اختیار کر لی ہے جو ان کے

نام سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ تمام لوگوں کے مدرسے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ ظاہر کر دینا
ضروری ہے کہ ہائی اسکول خلاف عام مدارس دیہی یا شہری میں تعلیم بالکل مفت تھی
اور بچوں کے لیئے تمام ضروریات تعلیم مہیا کی جاتی تھیں۔
ان مدارس دیہی کے قواعد اس طور پر ترتیب دیئے گئے ہیں کہ ان میں صرف معمولی
اور ضابطہ کے معاملات ہی کے متعلق ہدایت نہیں کی گئی بلکہ نہایت چھوٹی جزوی
باتوں کے متعلق بھی احکام موجود ہیں مثلاً تجارتی یا باربرداری کے جہازات جو نکہ
دریاؤں میں سفر کرتے ہیں اور کئے دن اپنی جائے قیام و لنگراندازی بھی تبدیل کرتے
رہتے ہیں اس لیے ان جہازوں پر کام کرنے والے ملاحوں کے بچے ہر اس مقام کے
مدرسہ میں حاضر رہ سکتے ہیں جہاں کہ ان کا گزر ہو بشرطیکہ اس مقام پر ان کا قیام بھی
چند مقررہ ایام کے لیئے متعین ہو۔ علاوہ علم طبعیات کے ایک غیر زبان بھی سکھائی جاتی ہے
نصاب تعلیم کم کر کے مخصوص مدارس ان بچوں کے لیئے قائم کئے گئے ہیں جن کے
قوائے دماغی کمزور ہیں، یا جسمانی ساخت میں نقص ہے (اس قسم کے مدارس کا ایک عمدہ
نمونہ آسکر ہلینا ہوم، برلن کے قریب ہے اور جس کی حیثیت دوگانہ ہے یعنی وہ مدرسہ
بھی ہے اور شفا خانہ بھی)
یا اندھے ہیں، (ان کے لیئے اُبھرے ہوئے حروف میں لکھی ہوئی کتابوں کے
بڑے بڑے کتب خانے بھی موجود ہیں) یا وہ جو گونگے اور بہرے دونوں ہیں یہاں تک کہ ان بچوں کیلئے
بھی مدارس موجود ہیں جو گونگے بہرے اور اندھے بھی ہیں (مثلاً او برلن ہاؤس۔ نووا واس متصل برلن
اور جنگلوں میں بھی مدرسہ قائم کر دئیے ہیں جہاں کمزور و خراب صحت والے بچے ایام تعطیل گزارتے تھے۔
اگر یہ مدارس عام مدارس دیہی سے کسی قدر کم درجہ پر ہیں تو ایسے مدارس بھی
موجود ہیں جن کا معیار بہت بلند ہے یہ وہ مڈل اسکول ہیں جن میں چھ سے لیکر نو تک
جماعتیں ہوتی ہیں اور جہاں متوسط طبقہ کے لوگ ان مدارس کے ذریعہ حرفت کی اعلیٰ تعلیم

ل کرتے ہیں تقریباً چالیس سال کا عرصہ گزرا کہ ضمنی مدارس اسی غرض کے لیئے جاری یئے گئے تھے۔ یہ محسوس کیا گیا تھا کہ مدارس دیہی کی تعلیم تیرہ چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لیئے ناکافی ہے اس لیئے ہر مبتدی کے لیئے یہ لازمی قرار دیا گیا تھا کہ وہ ضمنی مدارس میں رات یا سہ پہر کے اسباق میں ضرور شرکت کرے تاکہ اس طرح ضمنی اور نیز عام معلومات میں اضافہ ہوسکے۔

مدارس دیہی کا طرز ہمیشہ عزت کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ ایک عرصہ تک تو یہ نہایت قدیم اور رجعت پسندانہ تعلیم کے مرکز خیال کیے جاتے تھے۔ یہاں کا اصول و طرز عمل تمامتر پولیس کے قوانین سے ماخوذ تھا اور عام طور پر جسمانی سزا کا بھی رواج تھا۔ عرصہ تک یہاں کے اساتذہ اور ان نوجوانوں میں جو ان کے سپرد کیئے جاتے تھے کسی قسم کا رابطہ و تعلق ہی نہ تھا۔ وہ بچے جو معاشی جدوجہد کی فضا میں پیدا ہوتے تھے اپنی ذات میں اپنے والدین کا انقلاب پسندانہ غصہ نہاں رکھتے تھے اور وہ اپنے اساتذہ کے قدیم جذبات وطن پرستی کو سمجھنے سے مطلقاً قاصر ہوتے تھے بلکہ ان خیالات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر اساتذہ کے خیالات بھی مختلف تھے ورنہ موجودہ مدارس دیہی کی خوشنما تصویر ہمارے سامنے نہ آتی جس کو میں اپنے آئندہ مضمون میں بالتفصیل بیان کروں گا۔ معلم کے نفس اور اس کے سیاسی عقائد کی جنگ کا خاتمہ مذاہب پسندی کی نفرت پر نہیں ہوتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مدرسہ کلیسا کے احکام کے تابع ہو یا نظریہ حقوق الٰہی کے ماتحت بلکہ اس کا خاتمہ اس آزاد خیالی پر ہوتا ہے جس کا نتیجہ مدارس کی کلیتہً آزادی ہے آج کل اساتذہ میں سے اکثر اجتماعی جمہوریت کے قائل ہیں برخلاف اس کے اساتذہ کی علمی جماعتوں میں یونیورسٹی کی قدامت پسندی اپنا گھر کر چکی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس دیہی میں کوئی اہم فرق نہیں مدارس دیہی اور مدارس ثانوی کے

علاوہ اگر ہم ضمنی مدارس کو خارج از بحث قرار دیں تو حرفتی مدارس کا ایک اور وسیع میدان ہے جن میں مخصوص تعلیم دی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان کا تعلق زیادہ تر عملی زندگی سے ہے نہ کہ بچوں کی عام تعلیم سے تاہم محکمہ تعلیم کی طرف سے جدید اصول جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس زمانہ میں جو جرمن لوگ بیرونی ممالک کو جاتے ہیں تو اپنی حدود کے باہر دوسرے لوگوں کی لاپروائی کی زندگی دیکھ کر متعجب ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے ایک اجنبی جو جرمنی میں قدم رکھتا ہے اس پر دوسرا ہی اثر پڑتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عجیب ملک میں پاتا ہے جہاں اس کو ہر طرف غور و فکر میں منہمک اور سنجیدہ صورتیں جستجو تلاش کی فکر میں نظر آتی ہیں جہاں ہر چیز بجائے خود غیر متعین اور عارضی حیثیت رکھتی ہے۔ تعلیم میں خصوصاً یہ حقیقت اور بھی زیادہ بین ہے۔ اگر اس وقت تک جرمنوں کی تعلیمی زندگی ایک مستقل و متعین حیثیت رکھتی تھی تو آئندہ سے اس کی خصوصیت جستجو اور انقلاب کی ہوگی ہمارے ذہنی عزم کی حقیقت اسی تعلیمی تبدیلی میں پنہاں ہے

طنزیات

(ابتدا اور ارتقا)

پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے ہمارے اصرار پر از راہ کرم اپنے قلم کو پھر جنبش دی ہے اور میدان کی وسعت اگر "فلسفہ ازدواج" کو نہیں تو اُس کے طنز اداؤں اور ادب اردو کی سب سے بڑی ستم ظریفی یعنی "فلسفہ ازدواج" کی "ضبطی" کو تو ضرور اپنے دامن میں لیئے ہوئے ہے۔ معزز معاصر "معارف" نے "فلسفہ ازدواج" کی ضبطی پر لکھا تھا کہ "سنا ہو کہ یہ مضمون بحق "سرکار مسلم یونیورسٹی" ضبط کیا گیا اور لکھنے والے کو کوئی قانونی سزا دی جانے والی تھی، فرد قرارداد جرم یہ تھی کہ اس مضمون سے یورپین تمدن کے خلاف ملک میں بغاوت کا اندیشہ ہے" اس قدر سنگین الزامات کے بعد رشید احمد صاحب کے لیے کوئی مختصر از زمین ہی نہ ملتی تھی کہ اُن کی جولانگاہ بنے۔ علیگڑھ میگزین شجر ممنوعہ کے حدود میں آگیا" لہذا جامعہ کو اس طرف خصوصیت سے متوجہ ہونا پڑا۔ "فرد قرارداد جرم" اور "بغاوت" کے متعلق ہم اسی قدر عرض کر سکتے ہیں کہ

چشم ما بسیار ازیں خواب پریشاں دیدہ است!

"مدیر"

"شبستان ازل" کا سب سے بڑا تہلکہ "پروگیون" میں پردہ در" کا ظہور نہ تھا بلکہ

قاہر بے دوزخم داور بے محشرم

کا وہ اعلان جنگ تھا جس کا جواب تقدیر الٰہی کو "کن فیکون" ہی سے دینا پڑا۔ نیابت الٰہی کا افتتاح ہو چکا تھا، لیکن اس کا نفاذ ابھی نہیں ہوا تھا، آخر کرشمے بھی بیدار کر دیئے گئے، آدم نے یکایک محسوس کیا کہ بہشت اور وہ دو مختلف چیزیں ہیں، یہ پہلا اضمحلال تھا جو جنت کی فضا میں نمودار ہوا۔ اور یہ پہلا ذوق جستجو تھا جس نے نیابت الٰہی کی شہادت

دی، حوا کی پیدائش اس ذوق کی تلافی نہ تھی بلکہ تازیانہ، اب بہشت بہشت نہیں رہی تھی وہاں اب آزار تھا، خلش بھی اور جستجو! آدم اور حوا دونوں اب ایک دوسری جنت میں تھے، وقت آچکا تھا فطرت ازلی نے دو طلسموں کو ٹکرا دیا، حوا کا ذوق تجسس شجر ممنوعہ سے متصادم ہوا۔ شیطان کا یہ اولیں انتقام تھا جس نے مشیت الٰہی کو متشکل کیا عتاب الٰہی نے نیابت الٰہی سے بازپرس کی، یہاں ذوق عبدیت کی کارفرمائی تھی، آدم اور حوا نے ایک دوسرے کو مورد لعن وطعن قرار دیا، لیکن شیطان کو اس کا افسوس ہوا، وہ نائب الٰہی کا دشمن تھا لیکن ذات الٰہی کا پرستار، وہ جانتا تھا کہ آدم اور حوا کا شجر ممنوعہ سے برومند ہونا اتنا اہم واقعہ نہ تھا جتنا خود شجر ممنوعہ کی موجودگی، اس نے محسوس کیا کہ بہشت میں رہ کر انسان یزداں اور اہرمن دونوں سے ناآشنا رہے گا نیابت الٰہی کی یہ رسوائی خود صانع ازل کو ناگوار ہوئی، تاہم آدم و حوا اس دنیا میں بھیجے گئے۔ شیطانی منشائے الٰہی کا کفارہ بننا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ملائک کی زندگی ایک سکوت منجمد ہے۔ جب وہ شیطان کو نہیں سمجھ سکے۔ تو ذات باری کو کیا سمجھیں گے۔ اس نے اپنا نظام مرتب کیا اور فرمان خداوندی کے ساتھ آدم و حوا کی معیت میں زمین پر اُترا،

طنزیات کی بحث میں شیطان کو داخل کرنا کچھ زیادہ بے محل نہیں ہے۔ لیکن اس بحث کو اتنا دقیق کر دینا کچھ بے ربط سا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یہ اعتراض تسلیم ہے لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ معلم الملکوت معرض بحث میں ہیں اور ابھی ساری داستان باقی ہے! احتیاط اور اختصار دونوں سے کام لینا پڑے گا اس بنا پر اسے آپ دقیق سمجھ لیں یا مہمل، دونوں میں آپ کی سخن فہمی، معرض بحث میں رہے گی۔

شیطان سمجھتا تھا کہ اگر وہ زمین پر نہ بھیجا گیا، مشیت الٰہی پوری نہ ہو گی، شیطان کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ ہستی جس کے ہوتے ہوئے اس نے کسی دوسری ہستی کے

سامنے گردن نہیں جھکائی اور جس کی خودداری کو اس نے اس کے منشار اور قانون سے بھی بلند سمجھا اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے سے رہ جائے یا اگر وہ کامیابی اور ناکامیابی دونوں پر قادر تھی تو پھر آخر کچھ اس کے بھی تو فرائض تھے وہ کس طور پر انجام پذیر ہوتے! شیطان یہ بھی جانتا تھا کہ نیابت الٰہی کی تکمیل میں اُس کی اعانت لازم آئیگی۔ ممکن ہے فرسودگی حیات انسان کو فرشتہ ہو جانے پر مجبور کردے اور فرشتوں کو اپنی کمزوریاں کبھی محسوس ہوں، فطرت ازلی کے سامنے یہی اندیشہ تھا جس کا ازالہ اس نے عالم کون و فساد کی تعمیر سے کیا۔ اگر انسان کو فرشتہ بنانا مقصود ہوتا تو جنت میں شجر ممنوعہ کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، معلم الملکوت کو ابلیس بنانے میں کوئی مصلحت نہ تھی اور خدا کو شاید اپنی شان خود داری کے پرستار کی حاجت بھی نہ ہوتی۔ عبدیت و نیابت کی کامیابی کا راز ابلیس کے زیر کرنے میں نہ تھا بلکہ اس کی سمجھنے میں تھا!

شیطان اور شیطنت سے اتنے عرصہ تک ہم آویزرہنے کے بعد، مضمون زیر بحث کے سلسلہ میں اگر میں ناظرین کی توجہ کو یونان اور روما کی طرف منتقل ہونے کی دعوت دوں تو ممکن ہے مجھ پر غیر متعلق ہونے کا جرم عائد کیا جائے لیکن اس کے فطری ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ تشبیب، اور گریز میں آخر کوئی نسبت ہونی چاہیئے، شیطان اور طنزیات میں جو آویزش ہے اُسے بدمذاق صرف سمجھ سکتے ہیں لیکن اس کی داد تو اہل مذاق ہی سے مل سکتی ہے!

اعتراض یہ ہوگا کہ آخر یونان اور روما کو اس سلسلہ میں زیر بار کرنے سے کیا حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اُردو اور فارسی وغیرہ میں تو یہ فن شریف (طنزیات) محض سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا ہے، یونان اور روما میں اس کی تاریخی، تمدنی اور مذہبی ثبوت بھی مل جاتے ہیں۔ بصورت دیگر میں ساری داستان لکھ جاتا اور کوئی کمہ اُٹھتا کہ مجھے مہر و وفا، سے کیا سروکار، قصہ سکندر و دارا ابھی سُنائیے تو میں کیا کر سکتا تھا؟ دنیا میں بہت لوگ

ایسے ملیں گے جو ہر تاریک خام کو تاریک خیال سمجھتے ہیں۔ اس نظریہ کے تسلیم کرنے میں مجھے تامل ہوتا اگر میں خود ان لوگوں سے واقف نہ ہوتا اور اس حقیقت کا معتقد نہ ہوتا کہ ہر شخص اپنا جج خود ہی بہتر ہو سکتا ہے تاہم کچھ تو

با ہمیں مرداں بباید ساخت

کے اصول پر اور کچھ اس خیال سے کہ اس سے بحث کی مختلف نوعیتوں کے سمجھنے اور حسن و قبح کے اخذ کرنے میں سہولت ہوگی، میں اس مضمون کی ابتدا اس منزل سے کرتا ہوں جو قیاس انسانی کی آخری حد ہے اور جہاں تک کم و بیش تاریخ کی بھی رسائی ہے،

یورپ کی تاریخ تمدن و معاشرت میں یونان اور روم کو جو دخل ہے اس کا کسی قدر اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس تمام ذہنی اور مادی سعادت کے جسے یورپ 'خدائے بخشندہ' کی بخشش نہیں بلکہ اپنے 'قوت بازو' کا رہین منت سمجھتا ہے جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے وہ ہمیشہ ان کلاسکس کی طرف رجوع کرتا ہے جن کی ترتیب اور تہذیب کا شرف یونان اور روم کو حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں جہاں تک فطرت انسانی کا تعلق ہے اس کے اسباب اور نتائج ہمیشہ اور ہر مقام پر یکساں رہے ہیں۔ انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے کمزور، متلون اور عافیت پسند واقع ہوا ہے، ان صفات کا تجزیہ کیا جائے یا ان کو وسعت دی جائے تو مختلف صورتیں پیدا ہوتی جائیں گی، اس کلیۃ کو مدنظر رکھ کر آپ تاریخ عالم کے ابتدائی صفحات پر نظر ڈالیے میں یہاں ڈاروِن اور ہکسلے کی تحقیقات کے اس حصہ سے ابتدا کرنا چاہتا ہوں جہاں خلائے محض ہے، یعنی اولین انسان کا وجود یہیں پہونچ کر ہمارا اور اُن کا باوا آدم نرالا ہو جاتا ہے۔

اُس عالم کا نقشہ صرف تصورات کے ذریعہ سے کھینچا جا سکتا ہے، ان نقوش کا فرضی ہونا

ظاہر ہی لیکن ان کا باطل ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔ انسان کی وہ تمام کمزوریاں جنکی پردہ پوشش وہ پابندیاں ہوتی ہیں جن کو ہم کسی نہ کسی وضعی یا الہامی قانون کے ماتحت اپنے اوپر عائد کرتے ہیں، اپنی پوری شدتوں کے ساتھ برسرِ عمل ہوں گی۔ انسان ڈرتا ہوگا، کھاتا ہوگا اور چھپ رہتا ہوگا فطرت اپنی پوری ہیبت زائیوں کے ساتھ موجود ہوگی، انسان اپنی انتہائی کمزوریوں سے آگاہ ہوگا، ہوا، بارش، دھوپ، بیماری، پہاڑ، دریائے آبشار، موذی جانور، دوسرے طاقتور انسان، غرضکہ خود اس کی ذات کے علاوہ تمام دوسری چیزیں اس کی آرزو اور اس کے حوائج کے راستے میں حائل ہوں گی اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے اُس کے پاس کوئی مُؤثر وسیلہ نہ ہوگا، نتیجہ ظاہر ہے، جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا وہ ان سے بچنا چاہتا ہوگا اور بغیر کسی اشد ضرورت کے جس میں اس کا ذوقِ تجسس بھی شامل ہوگا، وہ باہر نہ نکلتا ہوگا، یہاں پر ذہن فوراً ایک دوسری طرف منتقل ہوتا ہے اور جائز طور پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ذوقِ تجسس محض کسی شاعرانہ حسنِ بیان پر مبنی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ہر وہ ہستی جو خطرات میں مبتلا ہوتی ہے ہمیشہ 'فکر' میں رہتی ہے، اس 'فکر' سے اختلاف آرا ناممکن ہے۔ ہر وہ وجود جسے خلعتِ حیات عطا ہوا ہے اپنے ضروریات کے اعتبار سے فکرمند ہوتا ہے۔ اور فکر ہی وہ چیز ہے جس سے ہماری حیات کا تار و پود وابستہ ہے!

دنیا خزاں اور بہار کی چند اور کروٹیں لیتی ہے، انسان کی فکر اور تجربہ میں کسی قدر پختگی آجاتی ہے، وہ اپنی جنس سے بالطبع مانوس ہونے لگتا ہے، اشتراکِ ضرورت اور فکر، اشتراکِ عمل کی طرف رہبری کرتی ہے۔ ہر ذی حیات خواہ انسان ہو یا غیر انسان فطرتاً نتائج استنباط کرنے کا خوگر ہوتا ہے۔ اُس چیز سے وہ اجتناب کرتا ہے جو اُس کے نزدیک تکلیف دہ ہوتی ہے اور ہر اُس چیز سے استفادہ کرنا چاہتا ہے جو اس کی نظر میں آرام دہ یا عافیت رساں

ہوتی ہے کسی سے ڈرتا ہے اور کسی کو عزیز رکھتا ہے۔ اور یہی عادت یا فطرت، پرستش کا سنگ اساس ہے، میں نہیں سمجھ سکتا اگر خوف اور رجا کا عنصر انسانی زندگی سے حذف کر دیا جائے تو ہمارے صحیفہ اخلاق اور معاشرت کی نوعیت کیا ہوگی، مذہب کیا ہوگا، قانون کو کہاں جگہ ملے گی اور تہذیب و تمدن کا کیا مفہوم ہوگا۔ عبادت و پرستش کا تجزیہ نفسی یہی ہے کہ انسان کو اب تک موت پر عبور نہیں حاصل ہو سکا ہے اور وہ کوئی ایسی صورت وضع کرنا چاہتا ہے جس سے وہ ابدالاباد تک انہیں لطائف و لذائذ کے ساتھ زندہ رہے جو اس دورِ حیات میں اس درجہ پرکیف اور خوش آیندہ معلوم ہوتے ہیں۔

انسان اپنی اُن شاید مجبوریوں کے ساتھ جو اس کی ابتدائی زندگی میں قدم قدم پر پیش آتی تھیں اور جن کی نوعیت آج تک نہیں بدلی، ہمیشہ اس فکر میں رہا کہ کسی طرح ان پر عبور حاصل کیا جائے۔ لیکن جس نتیجہ پر وہ پہونچ سکا اور جو اس کی محدود مساعی کا آخری نشانِ منزل تھا،،

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

تھا۔ فطرت کے ہیبت ناک مناظر اور مظاہر کے مقابلہ میں اپنی کمزوریوں کو محسوس کر کے وہ سربسجود ہو جاتے سربفلک کشیدہ پہاڑ، متلاطم دریا، مہیب طوفان، ہولناک وبائیں، خونخوار جانور، موذی حشرات الارض، شرر ریز آفتاب، ایسے عاملینِ فطرت نہ تھے جن سے وہ عہدہ برآ ہو سکتا، مجبوراً ان کے سامنے اُسے جھکنا پڑا۔ آپ تاریخ عالم کا مطالعہ فرمائیں، سوائے اسلام کے آپ کو ہر جگہ، مذاہب کی تفسیر انہیں واقعات میں ملے گی، جن مناظر اور مظاہر فطرت کا میں نے تذکرہ کیا ہے وہ اپنے انتہائی خشنائیوں کے ساتھ ہندوستان اور چین میں ملیں گے یہاں کے دیوتاؤں کا مطالعہ کیجئے آپ ہمیشہ ان کی تشکل و ہیئت مہیب اور خوفناک پائیں گے، برخلاف اس کے الۃ الغنا اور الۃ العلم کی سرزمین یونان کا اندازہ کیجئے، نزہت آگیں فضا، گنگناتے ہوئے چشمے،

مختصر اور دلکش کوہستانی سلسلہ، سبک خرام دریائیں، دلکش وادیاں حشرات الارض معدوم، دبامیں ناپید، زندگی، خواب جنت کی تعبیر، موت، گہوارہ کا ایک عارضی سکوت، آپ ہی فرمائیں اس مقام کے رہنے والے فطرت کی پرستاری کس نوعیت سے کریں گے ان کے نزدیک فطرت ایک درس حسن ہے، اُن کا ہر دیوتا کیف حسن کا پیکر مجسم ہوتا ہے۔ وینس اور اپالو سے زیادہ حسین اور دلکش، جنت نگاہ کہاں نظر آئے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمین کے بسنے والے بھی پرستاران فطرت کے زمرہ میں داخل ہوئے لیکن ان کی وابستگی خوف کی بنا پر نہ تھی بلکہ اُن کی محبت اور شیفتگی کی ترجمان تھی۔

آپ غالباً اس عالمگیر روایت سے واقف ہوں گے کہ جہاں کہیں کسی عظیم الشان تعمیر کا نمونہ خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو پایا گیا ہے اور اتفاق سے مضافات میں کوئی کم درجہ کی تعمیر بھی موجود ہوئی، تو لوگ اکثر یہ بیان کرتے ہیں کہ جب اول الذکر کی تکمیل ہو چکی تو جو کچھ سامان بچ رہا تھا اس سے موخر الذکر کی تعمیر ہو گئی۔ اس روایت کو اگر ایک کلیہ کی حیثیت دیدی جائے تو میں عرض کروں گا کہ جب "چمن پیرائے کن" نے کشمیر کی تعمیر سے فرصت پائی اور نشیمن بہار کی خبر یورپ کی سرزمین پر پہونچی تو اس کا ایک موقر وفد کارکنان فطرت کی بارگاہ میں پہونچا اور خانہ برانداز چمن سے گلہ مند ہوا۔ اب تھا ہی کیا، لیکن دلجوئی بہر حال لازم تھی جو کچھ رہ گیا تھا وہ یورپ کے جنوبی حصہ پر تقسیم کر دیا گیا، اور اس میں ٹرکی، یونان، اٹلی، اور اندلس شامل کر دیئے گئے!

حافظ کے زمانہ کی دنیا تو عروس سے گزر کر "عجوزہ" تک پہونچ چکی تھی لیکن ناظرین کے تفنن طبع کی خاطر، جس وقت کی دنیا میں پیش کر رہا ہوں، وہ اس کی طفولیت کا زمانہ تھا، زناشوئی کی وہ نوک جھونک جس کی ابتدا جنت سے ہوئی تھی اور جسے عہد حاضر میں آرٹ اور مقدمہ بازی کا برزخ کبری کہنا چاہیئے، آدم اور حوا میں جاری رہی،

اور ایک مقام پر حوا نے آدم کو اپنے خالق کے خلاف طعن و تشنیع پر بھی آمادہ کیا ہے۔ دنیا جنت نہ تھی، جہاں ہر چیز بے منت غیرے، حاصل ہوتی، جہاں میلانات انسانی میں تضاد اور تنوع نہ ہوتا، پھر کوئی وجہ نہ تھی کسی ایک کو دوسرے سے اختلاف ہوتا۔ لیکن جس دنیا کا نام تصادم اغراض ہے، جہاں ہر شخص ہر چیز سے تنہا لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور دوسروں کو محروم رکھنا پسند کرتا ہے، حالات اور واقعات ایک بالکل جداگانہ نوعیت رکھتے ہیں۔

انسان کا مخلوق ہونا اس کے مجبور ہونے کی دلیل ہے، اور اُس کے احساس پرستش کا مدار بھی مجبوری ہے پرستش کے دو پہلو ہیں، خوف اور رجا۔ اگر اس بحث کو ذرا اور وسعت دی جائے، رجا کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود رجا کا انحصار خوف پر ہے پرستش کا ایک سبب احساس تشکر بھی ہو سکتا ہے، لیکن اگر اس پر ایک غائر اور عمیق نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ احساس تشکر بھی صرف مجبوری کا ایک لطیف پہلو ہے۔ اس سلسلہ بحث کو ذہن نشین کرنے کے بعد جس میں ذہانت اور حسن ظن دونوں سے کام لینا پڑے گا، عالم حیات کے اس دور کا تصور کرنا چاہیئے جس کا سطور بالا میں تذکرہ ہو چکا ہے۔ انسانوں کی پہلی جماعت اپنی ذہنی اور دماغی قوتوں کے اعتبار سے ایک طرف صوفی اور غیر منطقی تھی اور دوسری جانب فلسفہ ابیقورس کی اولیں پرستار۔ صوفی اس اعتبار سے کہ وہ تجربات حیات کے زیادہ حصہ کو فطری اور انسانی نہیں بلکہ ما فوق الانسانی قوتوں کا رہین منت تصور کرتا تھا اور غیر منطقی یوں کہ قانون مناقضت سے ناواقف ہونے کے باعث وہ بیک وقت دو متناقض خیالات کو اپنے ذہن میں بار دے سکتا تھا۔ اب رہا اس کا فلسفہ ابیقورس کا پیرو ہونا اس کی شہادت اس حقیقت سے ملتی ہے کہ اس کے نزدیک "کھانا، پینا اور خوش رہنا" ہی مقصد حیات

تھا مسئلہ زیر بحث کے سلسلہ میں نوع انسانی کا یہ میلان نہایت دقیع حیثیت رکھتا ہے۔

قرون اولیٰ میں یونانیوں کے دو معتقد دیوتا تھے الہتہ الفلاحت اور الہتہ الخمر اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کی ضروریات اور میلانات کا خیال رکھتے ہوئے ان دو دیوتاؤں کے علاوہ ذہن انسانی میں کسی اور کی گنجائش نہ تھی۔ زمین روزی رساں تھی، اکل وشراب کے بعد طبیعت میں تفریح اور جولانی کا پیدا ہونا فطری تھا جس کی تکمیل شراب اور مسکرات سے کی جاتی تھی نتیجتاً یہ دونوں ضروریات آسانی سے پوری ہوتی تھیں اور اپنے کیف وکم کے اعتبار سے ان کو جو منزلت حاصل تھی اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس چیز کا ابھی تذکرہ ہو چکا ہے وہ غالباً فراموش نہ ہوا ہوگا۔

ضرورت، مجبوری کا دوسرا نام ہے اور مجبوری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، انسان وسائل کا متلاشی ہوتا ہے، عہد اولیں کے انسانوں کے ذرائع اور وسائل جیسے کچھ محدود رہے ہوں گے ان کا بآسانی تصور ہو سکتا ہے۔ بیسویں صدی کا ایک مہذب انسان باوجود اپنے وسیع ذرائع اور وسائل کے آخر میں وہی تدبیر اختیار کرتا ہے جو اس کے اولیں پیشرو بغیر کدو کاوش کے جلد سے جلد اختیار کرتے تھے، یعنی مافوق الانسانی طاقت پر ایمان لانا یہ وہ منزل ہے جس سے مذہب کی سرحد ملتی ہے، ہر وحشی یا نیم وحشی انسان جسے اپنی ضرورتوں کا احساس تھا اور جس کے سامنے فطرت کا وسیع دامن کشادہ تھا اپنے فکر و عمل کے اعتبار سے مذہبی تھا، یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہی، انفرادی عقیدت یا عبادت عدالجماعت میں منتقل ہو گئی اب بجائے اس کے کہ ہر شخص فرداً فرداً مخصوص معتقدات کا عامل ہوتا، انہیں افراد کی جماعت نے من حیث الکل اسے ایک "عید" یا تیوہار کی حیثیت دیدی

ہر عید یا تیوہار اپنے وجود کے اعتبار سے دو پہلو رکھتا ہے، ایک مذہبی دوسرا تفریحی، کسی تیوہار کی مثال لے لیجئے، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ دن کا کچھ حصہ عبادت یا نذر دینا

میں گزرتا ہے اور بقیہ حصہ سیر و تفریح، ملنا جلنا، دید و باز دید میں بسر ہوتا ہے۔ ان حالات کے ماتحت آپ اہالیان یونان کی ابتدائی زندگی کا جایزہ لیں۔ ان کی دو مخصوص اور عزیز ترین دیوتا جن کا ذکر ہو چکا ہے الہتہ الفلاحت اور الہتہ الخمر تھے جن کے نام پر نذریں اور قربانیاں تدیہ کی جاتیں جس کا بیشتر حصہ غلہ اور شراب ہوتا، یہ مراسم جو ان کی پرستاروں کے احساس تشکر اور عبودیت کے ترجمان ہوتے ختم ہو لیتے تو رنگ رلیوں کا دور آتا جس میں عورت، مرد بچے، بوڑھے، جوان سب ہی شریک ہوتے، ہنسی دلگی، مذاق، تمسخر، پھکڑ بازی، طعن و طنز، سب و شتم غرضکہ وہ سب کچھ ہوتا جس کا نظارہ آج بھی میسر آسکتا ہے، شرط صرف یہ ہے، بے حجابی ہو، شباب ہو، جرأت رندانہ ہو، اور

صلائے عام ہو یاران نکتہ داں کے لیئے !

طنزیات کی ابتدا انہیں "بدمستیوں" اور "بدمنہگیوں" سے ہوئی ہے۔ یہاں ایک امر ذہن نشین کر لینا چاہیے یعنی اس ہنسی دلگی یا سب و شتم کی نوعیت کیا ہوتی ہوگی غالباً اس حقیقت کو پیش کرنا کچھ زیادہ ضروری نہیں ہے کہ جب انسان کے جذبات میں تموج ہوتا ہے اور اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہوتی ہے اس وقت وہ اپنی طرز گفتار ہی کو نہیں بدل دیتا بلکہ ایسی حالت میں اس کے لب و زبان سے جو کلمے ادا ہوتے ہیں وہ اپنی ترکیب اور بندش کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتے ہیں اور یہی باعث ہے کہ عربوں کے یہاں شعر کا معیار ہی بالکل مختلف ہے، ہر وہ شخص جو برجستہ اور دل آویز کلام پر قادر ہوتا یا معمولی آدمیوں سے بڑھ کر مؤثر اور دلکش تقریر کرتا عربوں کے نزدیک شاعر تصور کیا جاتا، آجکل ردیف اور قافیہ کی پابندیوں سے لوگ گھبرانے لگے ہیں گو اس میں شک نہیں بعض اوقات ان کے ساتھ وہ کھینچ تان کی جاتی ہے اور ان کا التزام کچھ ایسے غیر ضروری اور بے محل طور پر کیا جاتا ہے کہ اصل مطلب بھی فوت ہو جاتا ہے لیکن ان کی شان نزول جن مقاصد کی

ترجماں ہوتی ہے ان کی ضرورت اور اہمیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا فطری ہونا صریح ہے۔ قافیہ اور ردیف ہمارے متلاطم جذبات کے اوزان ہیں۔ ان کے فطری ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وحوش اور طیور بھی ان کا التزام رکھتے ہیں۔ کوئل یا پپیا کے نغمے کبھی اوزان سے خالی اور غیر مرتب نہیں ہوتے۔

اس طور پر یہاں یہ مسئلہ خود بخود طے پایا جاتا ہے کہ اس قسم کے رنگ رلیوں میں عہد قدیم کے یونانی اپنے طعن و طنز، سب و شتم یا ہنسی دلگی میں ایک قسم کے بے ربط وزن کا التزام رکھتے تھے جس نے مرور ایام سے نظم و نثر کا جامہ اختیار کر لیا اور یہی سبب ہے کہ یونان اور روم کے جتنے مشہور ہجو گو ہوئے وہ سب کے سب شاعر تھے۔ عربوں کا ذکر اس کے بعد آئیگا لیکن اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ عربوں کے یہاں ہجو کی تعریف میں جہاں اور بہت کچھ کہا گیا ہے وہاں نظم کی شرط ایک حد تک لازمی قرار دی گئی ہے۔ عربوں میں ہجا سے مراد وہ اشعار ہیں جس میں کسی قوم، کسی فرد، کسی جماعت یا کسی زمانہ کی منقصت بیان کی گئی ہو۔ اس کی تائید میں ابن اثیر نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے۔

اے اللہ عمر بن عاص نے میری ہجو کی ہے اس کو معلوم ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں۔
تو اس کی ہجو کر، اور اس پر لعنت بھیج جس قدر کہ میری ہجو کی ہے۔

سرور و بہجت ہو یا غم و غصہ، فرط تشکر ہو یا غلبہ غیظ و غضب، جذبات کا متلاطم ہونا بہر حال لازم ہے! انسان نے سب سے پہلے ترانہ شکر ادا کیا یا اظہار سب و شتم اس میں شک نہیں کہ اوزان اور قافیہ کا عنصر کسی نہ کسی طور پر ضرور نمایاں رہا اور شاید اسی باعث سے حضرت آدم کے ساتھ شاعری وابستہ کی جاتی ہے۔ دیگر صنف شاعری کے مانند طعن و طنز، سب و شتم ہر قوم میں خود بخود نشو و نما پاتے ہیں اور ابتدائی دور میں اس کا پست اور رکیک ہونا بھی عین فطرت ہے۔ اور اسی بنا پر ارسطو نے شاعری کو اس کے ابتدا اور ارتقار کی رو سے تسلیم کیا ہے، ہر چیز کی تکمیل تنوعات سے ہوتی

ہے جس کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے، فطرت آرٹ کی ابتدا اور آرٹ کی تکمیل، ہجو
وہجا کی ابتدا اور انتہا ان ہی قوانین کے ماتحت ہوئی ہے!

مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ رشید احمد صدیقی

پیغمبر اسلام

(۲)

رسالت

"عنوان بالا سے ایک مضمون فروری ۱۹۲۴ء کے پرچہ میں نکل چکا ہے، مضمون ہذا اس کا دوسرا نمبر ہے جس میں فاضل مضمون نگار (صلاح الدین خدا بخش نے) آنحضرتؐ کی رسالت پر تنقیدانہ حیثیت سے بحث کی ہے اور اسی سلسلہ میں نزول وحی کے متعلق یورپین مصنفین نے جو جو تاویلات کی ہیں ان کا جواب دیتے ہوئے خود اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کی تصدیق و تردید سے ہمیں بحث نہیں۔ مضمون چونکہ انگریزی میں تھا اس لیے قرآن کی آیات اور احادیث کے ترجمہ کرتے ہوئے ہم نے انگریزی عبارت کا زیادہ لحاظ کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے اصل عربی عبارت بھی بائیں کالم پر درج کر دی ہے تاکہ غلط فہمی کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ امید ہے کہ یہ کوشش قارئین کی قبولیت کا شرف حاصل کر سکے گی"

بہ حیثیت نبی آنحضرت صلعم کو اپنے مقاصد کی حق و صداقت پر یقین واثق تھا۔ اس یقین میں آپ اس قدر پختہ اور اٹل تھے کہ ذرہ برابر بھی کوئی ضعف یا تزلزل نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ نبوت سے بہت پہلے یہ یقین آپ کے دل میں جاگزیں ہو چکا تھا اور اس میں نہ صرف آپ بلکہ بعض دوسرے لوگ بھی شریک تھے۔ آپ میں یہ یقین کیونکر پیدا ہوا؟ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبوت سے قبل آپ پر دماغی کلفت اور بے چینی کا ایک زمانہ گزر چکا تھا اور یہ یقین اسی کا نتیجہ تھا۔

ایک واحد قادر مطلق، رب العالمین کا اعتقاد جو بنی آدم سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور جس نے ان لوگوں کے لیئے جو اس کے احکام کی خلوص نیت

اور پاک دل سے اتباع کرتے ہیں، بہترین اجر کا وعدہ کیا ہے اور جو لوگ ان احکام کی نافرمانی اور سرتابی کرتے ہیں ان کے لیئے دردناک عذاب مقرر کیا ہے، نیز یہ اعتقاد کہ عنقریب قیامت آنے والی ہے اور اگر لوگوں نے اس دین حق کو قبول نہ کیا تو عذاب الٰہی سے بچنا محال ہے اور اکثر اس خیال کا آنا کہ گناہوں سے توبہ کی تلقین کے لیئے کاش میں پیشقدمی نہ کیے ہوتا اور کبھی اس شک کا پیدا ہو جانا کہ لوگوں کی طرف تحقیر اور مذمت کے مقابلہ میں ثابت قدم رہ سکوں گا یا نہیں ؟' ان تمام اعتقادات و خیالات نے آپ کے دل میں ایک طرح کی مایوسی پیدا کر دی تھی۔ اکثر آپ نے ان خیالات کو جن سے آپ کا سینہ ہر وقت پُر رہتا تھا خود اپنی زبان سے سنا ہے اور کبھی یہ خیال ذہن میں آتا کہ یہ شیطانی وسوسے ہیں جو دل میں پیدا ہوتے ہیں اور زبان سے جن کا اظہار ہو جاتا ہے۔

ان خیالات و شبہات سے نہ تو صوم و صلوٰۃ نے نجات دی اور نہ آپ کی عزلت گزینی نے۔ آپ یہاں تک عاجز آگئے کہ ایک بار آپ نے خودکشی تک کا ارادہ کر لیا۔ اسی عرصہ میں آپ کو یکبارگی ندائے غیب سنائی دی جس نے صاف صاف یہ بتا دیا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ یہ ندا کیسے آئی، طبری میں یہ واقعہ اس طرح منقول ہے۔

حدثنا ابو کریب قال حدثنا وکیع علی بن المبارک عن یحییٰ بن ابی کثیر قال سالت اباسلمہ عن اول ما نزل من القران قال نزلت یا ایہا المدثر اول قال قلت انہم یقولون اقرأ باسم ربک لذی خلق فقال سالت جابر بن عبداللہ فقال لا احدثک الا ما حدثنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال جاورت بحراء فلما قضیت جواری

ابو کریب سے مروی ہے کہ وکیع نے علی ابن المبارک سے اور انھوں نے یحییٰ ابن کثیر سے بیان کیا جنھوں نے کہا کہ میں نے ابو سلمہ سے پوچھا کہ سب سے پہلے قرآن کی کونسی آیت نازل ہوئی، انھوں نے جواب دیا کہ سب سے پہلے یا ایہا المدثر اُتری۔ میں نے کہا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ انھوں نے کہا کہ میں نے جابر بن عبداللہ سے پوچھا انھوں نے کہا کہ میں وہی بیان کرتا

ہوں جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے
فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک بار میں (حسب معمول)
عبادت کے لیے کوہ حرا پر گیا۔ جب میں ختم کر چکا تو
نیچے اترا اُس وقت میں نے ایک آواز سنی۔ میں نے
دائیں جانب نظر کی اور کچھ نہ دیکھا، بائیں طرف نظر
پھیری اور کچھ نہ دیکھا، پیچھے مڑ کر دیکھا اور کچھ نہ نظر
آیا، تب میں نے اوپر سر اُٹھایا۔ "اور کوئی چیز"
دیکھی۔ اس کے بعد میں (حضرت) خدیجہ کے پاس آیا اور
ان سے کہا کہ مجھے اڑھاؤ اور پانی ڈالو۔ چنانچہ
اُنھوں نے مجھے اُڑھادیا اور اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈالا
اس وقت یہ آیت نازل ہوئی یا ایہا المدثر (اے
لپیٹے ہوئے)

سبطت فسمعت صوتاً فنظرت عن یمینی فلم ارا
شیئاً وعن شمالی فلم ارا شیئاً و نظرت
امامی فلم ارا شیئاً فرفعت راسی فرایت
شیئاً فاتیت خدیجة فقلت دثرونی وصبوا
علی ماءً فدثرونی وصبوا علی ماءً برداً فنزلت
یا ایہا المدثر۔

"وہ کوئی چیز" جو آنحضرت کو نظر آئی ابن اسحاق میں ایک دوسری حدیث سے اس طرح منقول ہے:-

میں ایک پہاڑی سے نیچے اترا اس ارادہ سے کہ اپنی
جان دے ڈالوں اور ہمیشہ کے لیے فراغت حاصل
کروں لیکن جب قریب نصف راستہ کے پہنچا تو
میں نے آسمان سے ایک آواز سنی کہ "اے محمدؐ! تو
خدا کا رسول ہے اور میں جبریل ہوں" میں نے آسمان
کی طرف اپنا سر اُٹھایا اور جبرئیل کو ایک انسان کی
صورت میں (نماز پڑھتے) دیکھا۔ اُنھوں نے کہا
کہ "اے محمدؐ! تم خدا کے رسول ہو اور میں جبرئیل ہوں"

قال فخرجت حتی اذا کنت فی وسط من
الجبل سمعت صوتاً من السماء یقول یا محمد
انت رسول اللہ وانا جبریل قال فرفعت
راسی الی السماء انظر فاذا جبریل فی
صورة رجل صاف قدمیه فی افق السماء
یقول یا محمد انت رسول اللہ وانا جبریل
قال فوقفت انظر الیه فما اتقدم وما
اتاخر وجعلت اصرف وجهی عنه فی

میں ان کی طرف کھڑا تکتا رہ گیا اور یہ بالکل بھول گیا کہ میں نے کیا ارادہ کیا تھا۔ اور آگے پیچھے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ میں ہر طرف اپنا منہ پھیرتا اور جس طرف رخ کرتا اسی کو دیکھتا میں نہ تو آگے بڑھا اور نہ پیچھے ہٹا۔ ایک جگہ پر جا رہا یہاں تک (حضرت) خدیجہ نے مجھے تلاش کرنے کے لیے آدمی بھیجا اور وہ مکہ آکر واپس چلا گیا اور میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل غائب ہوگئے اور میں مکان واپس چلا آیا (جو دامن حرا میں واقع تھا)

افاق السماء قال فلا انظر فی ناحیۃ منھا ارایۃ کذالک فما زلت واقفا ما اتقدم امامی وما ارجع ورائی حتی بعثت خدیجۃ رسلھا فی طلبی فبلغوا اعلی مکۃ ورجعوا الیھا وانا واقف فی مکانی ذلک ثم انصاف عنی وانصرفت راجعا الی اھلی حتی اتیت خدیجۃ فجلست الی فخذھا مفیضا الیھا

"قرآن مجید میں بھی دو جگہ یہ واقعہ مذکور ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بالکل درست اور صحیح ہے۔ سورہ ۸۱ (التکویر) کی پندرہویں سے یہ واقعہ اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

اور ہم کو ان ستاروں کی قسم جو چلتے چلتے اُلٹے پیچھے کو ہٹنے لگتے اور تیزی سے چلتے اور چھپ جاتے ہیں۔ اور رات کی قسم جبکہ اس کی تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور صبح کی قسم جبکہ وہ اپنے سانس سے (شب کی) تاریکی دور کر دیتی ہے۔ بے شک یہ (قرآن) ایک معزز فرشتے کا (پہنچایا ہوا) قول ہے جو (خدا کے) مالک عرش کی بارگاہ میں صاحب قوت اور بلند رتبہ ہے، فرشتے جسکی اطاعت

فلا اقسم بالخنس ۙ الجوار الکنس ۙ واللیل اذا عسعس ۙ والصبح اذا تنفس ۙ انہ لقول رسول کریم ۙ ذی قوۃ عند ذی العرش مکین ۙ مطاع ثم امین ؕ وما صاحبکم بمجنون ۚ ولقد راٰہ بالافق المبین ۚ وما ہو علی الغیب بضنین ۚ وما ھو بقول شیطٰن رجیم ۙ

کرتے ہیں اور جو (خدا کا) امین ہے۔ (لے اہل مکہ) تمہارا رفیق دیوانہ نہیں ہے اس نے (آنحضرتؐ) اسکو (حضرت جبرئیل) آسمان کے صاف مطلع میں دیکھا وہ نہ رموز آسمانی چھپاتا ہے اور نہ شیطان مردود کی باتیں سکھاتا ہے۔

اس کے بعد سورہ ۵۳ (النجم) کی پہلی آیت سے یہ بیان اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

والنجم اذا ھوی ۙ ما ضل صاحبکم وما غوی ۚ وما ینطق عن الھوی ۙ ان ھو الا وحی یوحی ۙ علمہ شدید القوی ۙ ذو مرۃ ط فاستوی ۙ وھو بالافق الاعلی ۙ ثم دنا فتدلی ۙ فکان قاب قوسین او ادنی ۚ فاوحی الی عبدہ ما اوحی ۙ ما کذب الفواد ما رای ۙ افتمرونہ علی ما یری ۙ	قسم ہے ستارے کی جب وہ ٹوٹتا ہے۔ تمہارے رفیق (حضرت محمدؐ) نہ بھولے اور نہ بھٹکے اور نہ اپنے جی سے (من مانی) باتیں کرتے ہیں۔ بے شک یہ قرآن وحی کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں جو ان پر نازل ہوتی ہے اور ان کو (حضرت جبرئیل) سکھاتے ہیں جن کی زبردست طاقتیں ہیں اور جو صاحب عقل ہیں اور وہ آسمان کی سب سے اونچی جگہ پر تھا پھر وہ قریب ہوا اور اس قدر جھکا کہ (دونوں میں) دو کمان کا فرق رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم۔ اس وقت اس کو (خدا) اپنے بندے کی طرف وحی بھیجنی تھی وہ بھیجی۔ آنحضرتؐ نے جو کچھ دیکھا اس میں انھوں نے اپنے دل سے کوئی جھوٹ نہیں ملایا تو کیا تم لوگ جھگڑتے ہو اس چیز پر جو وہ دیکھتے ہیں۔

۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر ڈی باز (   ) کی ایک جرمن تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے ایک بار لکھا تھا کہ "ڈاکٹر باز اور دیگر مصنفین نے اس واقعہ

(نزول وحی) کو ایک خیالی امر سمجھا ہے لیکن جس سادہ اور واضح طریقہ پر یہ قرآن و حدیث میں بیان کیا گیا ہے' اس سے ڈاکٹر موصوف کی صحت رائے کے متعلق بہت شبہ ہوتا ہے'' ایک عرصہ قبل اس واقعہ کے متعلق میری یہ رائے تھی کہ آنحضرتؐ نے خود اپنا ہی سایہ دیکھا ہوگا جس طرح بروکن[1] پہاڑ پر ایسا ہی عکس نظر آتا ہے۔ اگر کوئی شخص آفتاب کے طلوع اور غروب ہونے سے کچھ پیشتر آفتاب و ابر کے درمیان اتفاق سے آجاتا ہے تو وہ بعض وقت اپنا سایہ بادلوں پر پھیلا ہوا دیکھتا ہے جسے ہم ''ہالہ[2]'' کہتے ہیں۔ غالباً آنحضرتؐ نے بھی ایسا ہی کوئی سایہ شام کو غروب آفتاب سے پہلے دیکھا ہوگا۔ یہ ہے حضرت خدیجہ کے اس فکر و تردد کی تفسیر۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح ایک ایسے شخص نے جو فطرتاً قلب کا کمزور واقع ہوا تھا اور جسے اپنے مقصد کا احساس بتدریج ہوتا گیا اور جو تبلیغ مقصد میں قریب تھا کہ مایوس ہو جاتا' ایسا شخص یکبارگی کمر ہمت باندھکر آگے بڑھتا ہے اور دل میں یہ پختہ خیال قائم کر لیتا ہے کہ جس آواز نے وحی الٰہی کی تبلیغ کے لئے آئندہ کامیابی کے ساتھ جرأت دلائی ہے' وہ ندائے غیبی تھی''

میرے ایک رفیق نے جنھیں میں نے اس مضمون کی ایک نقل بھیجدی تھی' مجھے لکھا کہ آنحضرتؐ پر نزول وحی کی جو تفسیر آپ نے کی ہے اس کی تائید میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس واقعہ کی جتنی تفسیریں کی گئی ہیں یہ ان سب میں بہتر ہے۔ اگر مجھے اب بھی کوئی شبہ باقی ہے تو وہ اس وجہ سے کہ آپ کی دلیل ایک حیثیت سے کسی قدر کمزور ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کے واقعات بروکن کے کہر آلود مطلع میں نظر آتے ہیں لیکن مکہ کے صاف و شفاف مطلع میں ممکن نہیں یا عموماً ایسے خطے میں دکھائی دیتے ہیں جہاں ریگستان میں یا اوپر فضا میں پانی کا دھوکا ہوتا ہو۔ ممکن ہے میرا شبہ کسی حد تک قلت معلومات کی بنا پر ہو'' مجھے افسوس ہے کہ میں مطلوبہ ثبوت بہم پہنچانے سے اپنے کو قاصر پاتا ہوں' رہا ''بروکن کا عکس'' تو اس کی تفصیل بیڈ کر میں عبارت ذیل میں درج ہے:-

[1] دیکھو Krehl's Mohammad PP. 52 et seq. Tr.

[2] ''عربوں کی علمی تاریخ'' مصنفہ نکلسن ۱۹۰۷ء۔ کیمبرج ہسٹری۔ جلد دوم صفحہ ۳۲۷

جبکہ طلوع و غروب آفتاب اس عرض البلد پر آکے پڑتا ہے جس پر بروکن واقع ہے اور دوسری جانب وادیوں میں کہرہ جمع ہو کر بروکن کے برابر اٹھتا جاتا ہے اور جب وہ کہرہ اور آفتاب کے درمیان آجاتا ہے تو اُس وقت بروکن اور اس پر جو جو چیزیں ہوتی ہیں ان سب کا سایہ کہرہ کی جانب پڑتا ہے جس پر بڑی بڑی ڈراؤنی صورتیں بن جاتی ہیں اور کہرہ جوں جوں آگے پیچھے ہٹتا جاتا ہے یہ صورتیں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں۔ یہ واقعہ ہر روز پیش نہیں آتا بلکہ مہینہ میں ایک بار ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں اس دُھندلی صورت کا جس طرح ذکر ہے، اُسے ہم مذکورہ بالا بیان سے بہت قریب پاتے ہیں ممکن ہے کہ کوہ حرا پر بہت شاذ اس کا وقوع ہوتا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ واقعہ صبح کے وقت پیش آیا ہو۔ جیسا کہ بعض روایتوں میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے شب میں ایک تشویشناک خواب دیکھا اور دوسرے دن صبح کو آپ پہاڑیوں پر ٹہل رہے تھے کہ یہ واقعہ پیش آیا۔

یہ ممکن نہیں کہ آنحضرتؐ کے ذہن میں اس عینی مشاہدہ کا کوئی تخیل پہلے سے رہا ہو۔ آپ نے جو کچھ دیکھا اسے آپ نے خدا کی طرف سے سمجھا۔ جو باتیں آپ نے سنیں وہ اس وقت آپ کے دل میں موجود تھیں یعنی یہ کہ آپ اپنی قوم کے رسول ہیں یہ سن کر آپ حیران و پریشان مکان تشریف لائے اور حضرت خدیجہ کو آواز دے کر فرمایا کہ "مجھے اڑھادو! مجھے اڑھادو"! اس کے بعد آپ پر ایک زبردست اعصابی غلبہ طاری ہوا جو بعد میں بھی اکثر ہوتا رہتا تھا اور جسے نزول وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس حالت میں بھی آپ کبھی ہوش و حواس سے باہر نہیں رہے۔ یہ اعصابی غلبے کیفیات قلبی کے خارجی مظاہر تھے۔ کشف روحانی سے پہلے اکثر دماغی ابتلا و کشمکش کی حالت پیش آتی تھی جونہی یہ کشمکش ختم ہوئی آپ نے اس وحی کا اعلان کیا۔ سب سے پہلے آپ پر یہ آیتیں اُتریں:-

اے وہ جو چادر میں لپٹے پڑے ہو اُٹھو اور لوگوں کو	یا ایہا المدثر ۰ قم فانذر ۰ وربک فکبر ۰

عذاب الٰہی سے) ڈراؤ اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک وصاف رکھو اور نجاست وگندگی سے علیحدہ رہو اور اس نیت سے احسان نہ کرو کہ اس سے بہتر ملے گا اور اپنے پروردگار (کی رضاجوئی) کے لئے صبر کرو۔	وثیابک فطھرہٗ والرجز فاھجرہٗ ولا تمنن تستکثرہٗ ولربک فاصبرہٗ

گو آپ کو اپنے پاک مقصد کی حقانیت وصداقت پر یقین کامل تھا، پھر یہ ایک بار تھا جو سر سے اتر گیا۔ آسیب کا خیال ہمیشہ کے لیے دل سے جاتا رہا۔ یہ امر تو طے شدہ ہے کہ یہ علامتیں صرع کی نوعیت کے نہ تھے (جیسا بعض یوروپین مستشرقین کا خیال تھا)۔ اس میں بھی بہت کچھ شبہ ہے کہ آیا یہ حالت آپ پر نبوت سے پیشتر طاری ہوتی تھی۔ میں اسپرنجر اس کے قول کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ آنحضرتؐ (نعوذ باللہ) دیوانے تھے۔ آپ کی بیس سالہ مشغول زندگی کی جو تصویر ہمارے پیش نظر ہے وہ ہرگز ایسی نہیں جس سے یہ کہا جاسکے کہ آپ کو کوئی اعصابی بیماری تھی۔

برعکس اس کے ہم آپ میں وہ سنجیدہ قوت فہم پاتے ہیں جو آپ کی قوم کا ہمیشہ طرۂ امتیاز رہا ہے۔ آپ میں وقار، مصلحت اندیشی اور صحیح فیصلہ کی قوت کے وہ اوصاف موجود تھے جو نحیف الجثہ قوم میں کبھی نہیں پائے جاتے۔ حالات نے آپ کو پیغمبر سے مقنن اور حکمراں کر دیا لیکن آپ نے اپنے لیے اس کے سوا اور کچھ نہ چاہا کہ لوگ آپ کو پیغمبر خدا کہیں۔ عربوں کی طرح آپ زود مشتعل تھے اور نبوت سے پہلے روحانی کشمکش کے زمانہ میں یہ جذبہ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ آپ خود بھی اس کے شاکی رہا کرتے تھے لیکن اس کی وجہ سے آپ وہم پرست یا تخیل پسند نہیں ہوئے۔ آپ نے بھی اس امر کی کہ آپ نے جو کچھ دیکھا وہ ایک اہم واقعہ تھا بڑے زوروں پر تردید کی ہے تو پھر ہم کیوں نہ آپ پر یقین لائیں!

سعید انصاری

سید جمال الدین کے خطوط
بنام
مسٹر بلنٹ

"سید جمال الدین افغانی کی ایک سوانحمری عنقریب جامعہ ملیہ علی گڈھ سے شائع ہونے والی ہے۔ مصنف نے جو بعض وجوہ سے اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے نہایت محنت و جانفشانی کے ساتھ سید موصوف کے حالات جمع کیے ہیں اور بہت سی کمیاب تحریریں اور خطوط بھی جو دوسری زبانوں میں تھے، حاصل کیے ہیں۔ بعض خطوط ہم ان کی اجازت سے شائع کرتے ہیں جن سے اس زمانہ کے سیاسی حالات پر بہت کچھ روشنی پڑے گی۔ پہلے تین خط فرانسیسی زبان سے ترجمے کیے گئے ہیں۔ چوتھا عربی میں تھا پانچویں کو بعینہ فارسی میں نقل کیے دیتے ہیں، امید ہے کہ ناظرین جامعہ کی ضیافت طبع کا باعث ہوگا۔"

مدیر

(۱)

پیرس ۲۱ را پریل ۱۸۸۴ء

جناب عالی۔ آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا جس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور جس کا میں بہت جلد جواب دے رہا ہوں۔

اگرچہ مجھے اپنے مصر کے دہ سالہ قیام میں کبھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ مسٹر گارڈن آزادی کے حامی اور اسلام کے رفیق ہیں[1] تاہم جو اعتماد مجھے آپ کی باتوں پر ہے اس کا خیال رکھتے

[1] غالباً یہ اشارہ گارڈن کی اس یادداشت کی جانب ہے جو ۱۸۸۰ء میں مرتب کی گئی تھی، اور جس میں سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی تجویز درج تھی۔ اس یادداشت کی رو سے مصر انگلستان کو، شام فرانس کو، آرمینیا روس کو اور یورپین ٹرکی خودمختار عیسائی سلطنتوں میں تقسیم کی جانے والی تھی۔ بلنٹ نے اپنی کتاب (گارڈن خرطوم میں) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ دیکھو صفحہ ۴۸۴

ہوئے میں ان کے افسوسناک انجام پر بلا تامل اظہار ہمدردی کرتا ہوں، اور اس امر کے متعلق اپنا دلی رنج ظاہر کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسی صورت حالات میں گرفتار ہو گئے جو دن بدن نازک ہی ہوتی جا رہی ہے۔

میں آپ سے یہ بات مخفی رکھنا نہیں چاہتا کہ اس اعتماد پر نظر رکھتے ہوئے جو مہدی اور اس کے بڑے بڑے ساتھیوں کو جن میں سے اکثر میرے سوڈانی شاگرد رہ چکے ہیں، مجھ پر ہے، میرے لئے یہ امر آسان تھا کہ میں اس مصیبت سے گارڈن پاشا کو رہائی دلوا دیتا، جو ان پر منڈلا رہی ہے بشرطیکہ گریہم اور عثمان ڈگنا کے درمیان آخری لڑائی نہ ہوئی ہوتی۔ لیکن اس خوفناک جنگ کے بعد جس میں بے انتہا عربی خون بہایا گیا ہے، میرا واثق خیال یہ ہے کہ مہدی اور اس کے رفقاء اس نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں۔ کہ کھوئی ہوئی زمین کو از سر نو حاصل کرنے اور اپنا وقار جمانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خرطوم پر قبضہ کر لیا جائے، یا مسٹر گارڈن کو گرفتار کر لیا جائے، یا ان کی جان لے لی جائے،

بہرحال اگر آپ مبادی صلح کے بارے میں فرانسیسی زبان میں مجھے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھ کر بھیج دیں، یعنی ایسی شرائط صلح جو آپ طے کرانا چاہتے ہیں، اور جو آپ کے نزدیک قابل پذیرائی ہو سکتی ہیں تو میں آپ کی کسی ایسی خدمت کے کرنے میں قاصر نہ رہوں گا جو میں موجودہ حالات میں کر سکتا ہوں، اور نیز ان مؤثر ذرائع کے بہم پہونچانے میں جو بدقسمت گارڈن کی زندگی کو بچانے کے لئے کام میں لائے جا سکتے ہیں، دریغ نہ کروں گا۔

جواب کا طالب

جمال الدین حسینی افغانی

(۲)

پیرس۔ ۲۸ اپریل ۱۸۸۴ء

جناب عالی۔ آپ کا مراسلۂ گرامی ابھی موصول ہوا ہے۔ اسے میں نے نہایت غور

کے ساتھ پڑھا ہے اور میں اب اس کا بہت جلد جواب لکھ رہا ہوں۔

آپ کو اس اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو عام مسلمانوں کے نزدیک مہدی کے روحانی مشن میں مضمر ہے، اور ساتھ ہی اس کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ وہ لفظ مہدی سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کا مفہوم غیر مسلموں سے اسلام کی نجات دلانے والا ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مہدی سے کیونکر ایسی صلح کی جا سکتی ہے، اور کیونکر اس کی پیشقدمی کو روکا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے انگریزوں کو مصر میں رہنے کی اجازت مل جائے، لیکن اگر مبادی صلح یہ ہوں کہ مصر مصریوں کے پاس رہے، گارڈن پاشا مع اپنے عیسائی رفقاء کے بچا لیے جائیں، اور انگریزی فوج مصر سے ہٹا لی جائے، تو اس صورت میں میرا خیال ہے کہ اس معاملہ کو خوشگوار انجام تک پہونچانا ممکن ہوگا، اگرچہ یہ کام بالکل آسان نہیں ہے۔ اس سے مہدی کے حملہ کو بھی ایک خاص وقت تک روکا جا سکتا ہے۔ اور ایک خاص جگہ تک محدود کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ امن کا وفد جس میں زیادہ تر مسلمان اور چند انگریز ہوں، مہدی کی خدمت میں بھیجا جائے۔ مسلمانوں کو یہ کہنے کی ہدایت کر دی جائے کہ ہم مصر کی اسلامی قوم کی طرف سے آئے ہیں اس لیے کہ جب انہیں مصری حکومت کی جانب سے بھیجا جائے گا تو مجھے یقین نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے، کیونکہ مہدی کو حکومت انگریزی سے نفرت ہے، اور چونکہ وہ حکومت انگریزی کے نمائندہ ہوں گے اس لیے ان کی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائیگا شیخ المرغانی کے ذریعہ ہمیں اس کا کافی ثبوت مل چکا ہے۔ باقی رہا ان انگریزوں کا مسئلہ جو اس مشن کے رکن ہوں گے۔ تو ان کے متعلق یہ اچھی طرح سے سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ اپنی گورنمنٹ کے افسر ہوں گے، اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ تمام اشخاص خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، انگریزی مشن کے ممبر ہوں گے۔ اگر اس مشن کو بھیجنے کا فیصلہ ہو گیا، اور ان حالات میں جن کے بیان کرنے میں آپ سے جرأت کر رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ آپ

مشن کے سب سے پہلے ممبر نامزد کیے جائیں گے کیونکہ مسلمانوں کو آپ جیسا حامی و مددگار میسر نہیں آسکتا۔ باقی رہے وہ مسلمان جن کا بھیجنا ضروری سمجھا جائیگا سو میں ان کے نام بتادوں گا اور آپ ان ناموں کو عین موقع پر ظاہر کردیں، جبکہ خاص طرز عمل کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہو۔

آپ مجھ سے استفسار کرتے ہیں کہ توفیق پاشا کی جگہ پر کس شخص کو مقرر کرنا چاہیے میرا جواب یہ ہے کہ جب اس کا موقع آئے گا تو آپ کے یا میرے لیئے یا کسی اور کے لیے جانشین کا معلوم کرنا مشکل نہ ہوگا۔ وہ شخص ہی ہوگا جسے مصری قوم چاہتی ہو اور اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

آپ کا محب صادق

(دستخط) جمال الدین حسینی، افغانی،

(۳)

پیرس - ۷ رمئی ۱۸۸۴ء

جناب عالی - میں ابھی اٹلی سے آیا ہوں۔ میٹورن کی نمائش میں بھی گیا تھا۔ آج صبح آپ کے دو خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں جنھیں میں نے نہایت غور کے ساتھ پڑھا۔

آپ کے آخری خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ گارڈن کے انجام سے زیادہ سروکار نہ رکھیں گے۔ اور اس سے ایک مرتبہ اور آپ کی روح کی عظمت اور وفاداری کا نقش میرے دل پر بیٹھ گیا ہے۔ آپ کی اس دلی خواہش کا کہ آپ جنرل گارڈن کے متعلقہ خط و کتابت والی بلو بک مجھے بھیجنا چاہتے ہیں، جس کی مدد سے آپ نے بلاشبہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ جنرل موصوف آزادی کے حامی یا اسلام کے محافظ نہ تھے، شکریہ ادا کرتے ہوئے میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ آپ کا اسم گرامی ہر مسلمان کے دل میں بالخصوص اور ہر عرب یا مشرقی کے دل میں بالعموم منقش رہے گا، اس لیئے کہ جو دلچسپی آپ ان معاملات سے

سے رہے ہیں، وہ ایسی ہے کہ وہ مشکور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی مخصوص وفاداری کے ساتھ اسی شاندار راستہ پر گامزن رہیں گے، اور خدائے برتر اس محنت کا اجر جو آپ کر رہے ہیں آپ کو دے گا۔

براہ کرم میڈم بنٹ کی خدمت میں میرا سلام نیاز پہونچا دیجئے، اور یقین رکھئے کہ میری خدمات ہر وقت آپ کے لیے حاضر ہیں۔

آپ کا صادق
جمال الدین حسینی افغانی

پیرس۔ ۱۲ مئی ۱۸۸۵ء

سلام کے بعد۔ صرف میں ہی آپکی ان نمایاں کوششوں کا مرہون منت نہیں ہوں جن کی وجہ سے گورنمنٹ سوڈان کا علاقہ خالی کردینے پر مجبور ہو گئی، بلکہ یقین رکھئے کہ تمام مسلمان، بالخصوص عرب آپ کے اس کارنامہ پر تہ دل سے شکر گزار رہیں اور آپ کی سرگرمی اور جرأت کے معترف ہیں۔ آپ کا اسم گرامی قیمتی پتھروں کے حروف میں لوح پر لکھا جائے گا، اور عزت واحترام کے تمام القاب سے مزین کیا جائے گا۔

لیکن ابھی تک ایک کام ایسا ہی جو باقی رہ گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ گورنمنٹ سے کہیں کہ "مہدی سے عہدنامہ کئے بغیر کس طرح سے اس سرزمین کو خالی کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ مہدی کے حملوں کو روکنے کی ذمہ داری کس طرح پر عائد ہوگی؟ ساتھ ہی یہ کہ گورنمنٹ شاہ راہائے تجارت کو کس طرح مسدود رہنے کی اجازت دے سکتی ہے؟ کیا ایسی حالت میں جبکہ گورنمنٹ نے سوڈان خالی کردینے کا تہیہ کر لیا ہے، گورنمنٹ پر واجب نہیں کہ وہ قابل اعتماد شخص کو یا کسی مسلمان کو مہدی کے پاس شرائط صلح مرتب کرنے کی غرض سے بھیجے اور مصر کو اس کے حملوں سے بچائے، اور اس طرح خونریزی کو بند

کرائے اور تجارتی راستوں کو کھلوائے ؛ میرا خیال ہے کہ اگر یہ سوال پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا تو تمام ممبر اس سے اتفاق رائے کریں گے۔

مجھے یہ کام آسان معلوم ہوتا ہے، اور یہ کہ اخراجات طے ہو جانے کے بعد اس کام کی تکمیل کے لئے آپ ہی کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن مہدی سے صلح کئے بغیر صورت حالات کبھی پایۂ تکمیل کو پہونچ سکتی، یہی وہ بات ہے جس کا آپ تک پہونچانا میں ضرور سمجھتا ہوں۔

آپ کو اور آپ کی بیگم صاحبہ کی خدمت میں میرا سلام عرض ہے۔

آپ کا دوست

جلال الدین حسینی افغانی

سواد مکتوب [۵۱]

نور دیدہ مرزا لطف اللہ [۵۲]

مکتوب تو کہ کاشف بر حسن طویت و طہارت سریرت و لیاقت ذاتیہ و استعدادات فطریہ بود، رسید۔ بسیار خوش شدم خصوصاً عبارت آں کہ در نہایت انسجام و غایت ارتباط بود با مراعات تشبیہات انیقہ و استعارات بدیعہ۔ آفریں بر تو باد۔ جوانان را ادب زیب زیور کمال است، معہذا نباید بدیں اکتفا نمود۔ چوں قناعت بحدی از درجات کمال با وصف اینکہ او را حد و پایانی نیست، از دون ہمتی و پست فطرتی است نوشتہ بودی برای زیارت من میخواہی بپاریس بیائی چنانچہ جہت زیارت من می آئی، باید مطلع شدہ اطاعت امر نمائی، حال موقع نیست زمان مناسب دیدہ تو را خواہم طلبید۔ والا ہر گاہ خلاف امر نمودہ بیائی بہ ملاقات من ہرگز نہ رسی، اگر در شہر پاریس باشی ہر دائی مراتب خواہی دید یاران زندہ را سلام برسان مکارم اخلاق ناصری را مطالعہ کن۔

جلال الدین الحسینی افغانی

[۵۱] یہ مکتوب ایران شہر بابتہ ماہ صفر ۱۳۴۳ھ سے لیا گیا ہے۔
[۵۲] سید جمال الدین کے خواہر زادہ ہیں،

فلسطین



(برطانوی سیادت میں)

اعلان بالفور نے فلسطین کے انتظام حکومت میں سب سے پہلا جو تغیر کیا وہ یہ تھا کہ صیہونی کانگریس کو نظم حکومت میں روز افزوں دخل حاصل ہونے لگا اور اس کو ایک مجلس شوریٰ کی سی حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہودیوں کی قوم کے لیے اتنا سہارا کافی تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ اپنا اثر بڑھانا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ وضع قوانین میں اس سے مشورے لیئے جانے لگے، قومی وطن کی تعمیر میں وہ ایک صلاحکار جماعت بن گئی اور تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس کا نفوذ حکومت کی رہنمائی کی حد تک پہونچ گیا۔ یہ غیر معمولی اقتدار حاصل کرنے کے بعد یہودیوں نے مستقل طور پر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی اور کارلسباڈ کانفرنس میں نہایت زور کے ساتھ مطالبہ کیا گیا کہ فلسطین کا ہائی کمشنر ایک یہودی ہونا چاہیئے۔ لندن کی حکومت شاید اس کو منظور کرلیتی مگر اس نے بعض سیاسی وجوہ سے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسرائیلیوں کی آتش طمع کو محاکم عدلیہ اور دوائر صنعت و تجارت (Chambers of Commerce & Industries) کی کنجیاں دے کر بجھا دیا۔ اس کامیابی سے یہودی لیڈروں کی ہمت اور بڑھی، اور انھوں نے اپنی ساری قوت اس کوشش میں صرف کردی کہ حکومت کے دروازے مسلمانوں کے لیئے بند کردیے جائیں اور حکومت فلسطین کی انتظامی مشین کلیتہً یہودی کل پرزوں سے مرکب ہو۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر محکمہ میں کثرت کے ساتھ یہودی بھرتی کیے جارہے ہیں اور ہزاروں حقدار مسلمانوں کے حق کاٹ کر ایسے ایسے یہودیوں کو ملازمتیں دی جارہی ہیں جو حقوق اور قابلیت میں مسلمانوں سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ مثلاً محکمۂ زراعت میں مفتش کے عہدہ پر ایک یہودی کو مقرر کیا گیا جس کے

مقابلہ میں بیسیوں مسلمان امیدوار مدارس زرعیہ کے کامیاب شدہ موجود تھے۔ اور پولیس کمشنری کے عہدہ پر کم وبیش ۱۰ مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک یہودی کو منتخب کیا گیا، حالانکہ مسلمان امیدوار اس سے بدرجہا زیادہ قابل اور تجربہ کار تھے وقس علیٰ ہذا۔

صرف ملازمتوں ہی پر بس نہیں بلکہ صیہونی تحریک نے حاکمانہ اقتدار سے مسلح ہوکر مسلمانوں کے لیے فلسطین کی آب وہوا میں سانس لینا مشکل کر دیا اور اتنے ہاتھ پاؤں پھیلائے کہ مسلمانوں کو ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں رہا وضع قوانین کا اختیار انہیں حاصل، قوانین کو نافذ کرنے کی ساری قوتیں ان کے قبضہ میں دولت وثروت کے وہ مالک، صنعت وتجارت کی کنجیاں ان کے پاس، زراعت کا محکمہ ان کے زیر اثر عدالت کی کرسی پر وہ متمکن، اور سب سے بڑی بات یہ کہ شاہی سلطنت انکی پشتیبان پھر مسلمان غریبوں کے پاس کیا دھرا ہے کہ ان کا مقابلہ کریں اور اپنی اجتماعی وانفرادی ہستی کو ہلاکت سے بچالیں۔ یہ الفاظ کچھ زور بیان کی خاطر نہیں، بلکہ ٹھیک ٹھیک ان حقائق کو پیش کرتے ہیں جو اس وقت فلسطین میں رونما ہو رہے ہیں۔ گنجائش نہیں کہ استیعاب کے ساتھ وہاں کے نظام حکومت پر بحث کی جائے، ورنہ ان الفاظ کی صداقت روشن ہوتی۔ تاہم اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان آئینی مظالم کی چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں :۔

۱۔ ایسے جابرانہ قوانین جو انتظامی قوت کو غیر محدود اختیارات دیتے ہیں کثرت کے ساتھ وضع کیے جا رہے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک قانون "ابعاد" ہے جس کی رو سے ایک مجسٹریٹ جس وقت چاہے اور جس شخص کو چاہے بغیر کسی قانونی کارروائی کے اور بغیر کوئی سبب ظاہر کیے اپنے حدود اختیارات سے باہر نکال سکتا ہے۔ قانون "منع جرائم" کی وسعت کا یہ حال ہے کہ ایک مجسٹریٹ یا ایک انسپکٹر پولیس جس شخص کو چاہے بغیر مقدمہ چلائے اور بغیر کوئی وجہ ظاہر کیے گرفتار کرلے۔ قانون ضمانات مشترکہ کی رو سے صرف ایک شخص کے

جرم کی ذمہ داری پوری بستی پر بلکہ بعض اوقات آس پاس کی بستیوں پر بھی عائد ہو جاتی ہے اور ان سب کو جرمانہ کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ قانون پولیس ایک کانسٹیبل کو اختیار دیتا ہے کہ جس شخص اور جس گھر کی چاہے تلاشی لے لے اور پھر اس تلاشی کا خرچہ بھی وصول کرے۔ تنفیذی قوت یہودیوں کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ان جابرانہ قوانین کا نفاذ کلیۃً مسلمانوں تک محدود ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ انہیں ایسے مقامات پر استعمال کیا جاتا ہے جہاں یہودیوں کی دست درازی کے جواب میں کسی مسلمان فرد یا جماعت سے مجبوراً مدافعت کرنے کا سنگین جرم سرزد ہو جاتا ہے۔ قدس شریف کا حادثہ جو ۲ر نومبر ۱۹۲۱ء کو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان پیش آیا تھا۔ اس میں صہیونیوں نے مسلمانوں پر مسلح ہجوم کیا، ان کی مذہبی توہین کی اور ہزاروں نہتے مسلمان ان کے ہاتھوں مجروح اور شہید ہوئے، مگر بعد میں جب بلوائیوں پر مقدمے چلائے گئے تو ہم نے دیکھا کہ ثابت شدہ مجرم جنھوں نے علانیہ آتشیں ہتیار استعمال کئے تھے صرف اس بنا پر بری کر دیے گئے کہ وہ یہودی تھے اور بیگناہ مسلمان جن کی مجروحیت اور مظلومیت نمایاں تھی بے بنیاد الزامات پر سخت سزاؤں کے مستوجب قرار دئے گئے۔ حتیٰ کہ ایک مسلمان کو صرف اس جرم میں ۱۰ سال کی سزا دی گئی کہ وہ ایک یہودی کی لاش کے قریب کھڑا ہوا دیکھا گیا تھا اور ۲ دو مسلمانوں کو ۱۵، ۱۵ سال کے لیئے صرف اس الزام میں بھیج دیا گیا کہ وہ بلوے کے بعد ہتیار چھنتے ہوئے پائے گئے تھے۔ اسی طرح یافا کے حوادث میں سینکڑوں یہودی بلوائی جن کے سنگین جرائم پر خود انگریزی فوج کے انگریز اور ہندوستانی افسر شاہد تھے، صاف بری کر دیے گئے اور ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ناکافی شہادتوں اور بے بنیاد الزامات پر عبرتناک سزائیں دی گئیں، ایک یہودی کرنل جس نے اپنے سپاہیوں کو لے کر خود بلوہ میں حصہ لیا تھا اور فوجی ہتیار اور فوجی وردیاں یہودی بلوائیوں کو تقسیم کر کے ہنگامہ کو بہت بڑھا دیا تھا، صرف خارج الملک کیا گیا مگر اس کے

مقابلہ میں ایک مسلمان کانسٹبل کو محض اس جرم پر کہ وہ بلوے کے وقت ڈیوٹی سے غیرحاضر تھا تین سال کی سزا دی گئی اور ایک مسلمان کو صرف اس الزام میں کہ اس کے قبیلہ نے یہودیوں پر ہجوم کیا تھا، ۱۰ سال کے لیے قید کر دیا گیا۔

۲۔ مسلمانوں کی زراعت کو برباد کرنے کے لئے ایک بروست کوشش کی جا رہی ہے، جس کی بدولت عربی کسان موت کے قریب پہونچ گیا ہے۔ جنگ سے قبل ترکی حکومت میں کسانوں کے لیے ایک مصرف زراعی (کواپریٹو بینک) قائم تھا جس سے ان کو فصل پکنے تک کے لئے بقدر حاجت رقمیں قرض دی جاتی تھیں اور اس کے سرمایہ کا یہ اصول تھا کہ کسانوں ہی پر "اضافہ مصرف زراعی" کے نام سے ایک قلیل ٹیکس لگا دیا گیا تھا۔ گویا یہ بینک کسانوں کے لئے ایک صندوق تھا جس میں وہ لوگ وقت ضرورت کے لئے پس انداز کر کے روپیہ رکھ دیتے تھے، اور دوسروں سے قرض لینے کے بجائے انہی کا سرمایہ ان کے کام آجاتا تھا۔ اس زریں اُصول کی بدولت فلاحین کی حالت روز افزوں خوشحالی پر تھی۔ انگریزی حکومت جب فاتح کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئی تو اس نے مصرف زراعی کو بند کر دیا مگر وہ ٹیکس بدستور جاری رکھا جو اضافہ مصرف زراعی کے نام سے اس بینک کے لیے عائد کیا گیا تھا۔ تاہم اپنے ابتدائی ایام حکومت برطانی حکام حاجتمند کسانوں کو خزانۂ حکومت سے قرض دیتے رہے جس کی بدولت ان کی حالت سنبھلی رہی جیہونی دور شروع ہوتے ہی حکومت کا نقطۂ نظر بالکل ہی بدل گیا۔ سب سے پہلے اس نے قرضے بند کیے اور کسانوں کو یہودی ساہوکاروں کے رحم پر چھوڑ دیا۔ جو ہندوستان کے حریص ترین بنیوں سے بھی زیادہ خطرناک مہاجن ہیں۔ اس کے بعد اس نے ایک قدم اور بڑھایا اور فلاحین سے اس مصرف زراعی کے قرضوں کا مطالبہ کیا جو خود انہی کے سرمایہ سے قائم تھا اور جن کے بند ہو جانے کے بعد کسی حکومت کو بھی ان سے بقایا طلب کرنے کا حق نہ تھا۔ فلاحین کی انجمنوں نے پہلے تو قانونی بحث

لی۔ مگر جب حکومت نے مطالبہ زیادہ سختی کے ساتھ کیا تو اُنھوں نے رحم کی درخواست
کی۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو تھوڑی سی مہلت طلب کی تاکہ ان کی مالی حالت سنبھل جائے
جب اسے بھی رد کر دیا گیا تو آخر میں اُنھوں نے التجا کی کہ ان کی سب چیزیں قرق کر لی
جائیں مگر زمینیں چھوڑ دی جائیں، لیکن یہ آخری التجا بھی رد کی گئی اور سینکڑوں
غریب کسانوں کی آراضی کم سے کم داموں پر نیلام کر دی گئیں جن کے تمام تر خریدار
یہودی تھے۔

۳۔ مسلمان فلاحین کی بربادی کے لیے صرف یہی ایک طرز ستم نہ تھا جو ایجاد
کیا گیا۔ جو لوگ اس کی زد سے بچے ہوئے تھے ان کے لیے قانون آراضی متروکہ
دوسرا ہتیار موجود تھا۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنی زمین پر تین سال تک
زراعت نہ کرے اُس کی زمین ارض متروکہ سمجھی جائے گی اور اُسے حکومت کی ملک
قرار دیا جائے گا۔ چار سال کی مسلسل اور ہولناک جنگ سے فلسطین کے کسان
بالکل مفلس اور مفلوک الحال ہو کر نکلے تھے۔ آبادی میں ایک معتدبہ کمی واقع ہوگئی تھی
اور ہر قریہ اپنے باشندوں کا تقریباً ⅓ حصہ کھو چکا تھا۔ بہت سے کسان جنگ اور
انقلاب کی تباہیوں کے باعث خانہ ویراں ہو چکے تھے۔ ان کے لیے ممکن تھا کہ
زمانہ امن کے ساتھ ہی اپنی کھیتیوں پر واپس آجاتے۔ حکومت کا فرض تھا کہ وہ ایسے
مصیبت زدہ فلاحین کی اعانت کرتی اور امن قائم ہوتے ہی انہیں کھیتی باڑی کرنے کے
قابل بنانے کی کوشش کرتی، مگر اس نے ان نیم جانوں میں جان ڈالنے کے بجائے
اُلٹا ایک وار ایسا چلایا کہ رہی سہی جان بھی نکل گئی اور عین اس وقت جبکہ پیٹ کی روٹی
اور تن کے کپڑے کو محتاج بیٹھے تھے انہیں اپنی آراضی کی بھی فکر کرنی پڑی جن سے
زندگی کی امیدیں وابستہ تھیں۔ حکومت قرضوں کا سلسلہ بند کر چکی تھی، مصرف زندگی
کا خاتمہ ہو چکا تھا، اور پاس پیسہ تک نہ تھا۔ مجبوراً کسی نے کھیتی باڑی کرنے کے لیے

یہودی ساہوکاروں سے بھاری شرح سود پر قرض لیا، اور کام پر واپس آکر اپنی املاک کی حفاظت کی۔ اور کوئی غریب جو قرض لینے کے ذرائع بھی نہ رکھتا تھا، اس نے اپنی زمین مفت کھونے سے یہی بہتر سمجھا کہ اس کے کچھ دام ہاتھ آجائیں، اس لیے کم سے کم قیمت پر اسے فروخت کر دیا جس کے خریدار بہرحال یہودی تھے۔

۴۔ ان قوانین کے بعد بھی جو عرب خوشحال رہے وہ آراضی مدورہ کے مالک تھے فلسطین میں عہد قدیم سے یہ دستور تھا کہ لوگ اپنی آراضی کے بعض حصے خلیفۃ المسلمین کو تبرکاً ہبہ کر دیتے تھے۔ مگر قاعدہ یہ تھا کہ وہ خود ہی ان پر متصرف رہتے تھے اور صرف ان کے حاصلات کا پانچواں حصہ خلیفۃ المعظم کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ اس کے عوض دربار خلافت سے ان کو عشر اور رسم ویرکو (لینڈ ٹیکس یا مالگذاری) معاف کر دیا جاتا تھا اعلان دستور کے بعد جب ٹرکی میں پارلیمنٹ قائم ہوئی تو دربار خلافت نے ان املاک کو سلطنت کی طرف منتقل کر دیا اور ان کا نام آراضی مدورہ رکھا گیا۔ برطانی تسلط کے وقت یہ آراضی ہزاروں ایکڑ پر مشتمل تھیں جن سے ۷۰ ہزار مسلمان فلاحین پرورش پاتے تھے۔ ان لوگوں کی حالت عام کسانوں سے زیادہ بہتر تھی کیونکہ ان کے ساتھ خاص رعائتیں کی جاتی تھیں۔ موجودہ حکومت ان کی خوشحالی نہ دیکھ سکی اور اس نے ان پر دست تعدی دراز کر کے ان کی ساری رعائتیں غصب کر لیں۔

۵۔ خام پیداوار کی برآمد حکماً بند کر کے مسلمانوں کی تجارت اور عام اقتصادی حالت کو برباد کر دیا گیا۔ عثمانی حکومت میں فلسطین سے غلہ اور دیگر خام پیداوار کی برآمد ایک بڑی منفعت بخش تجارت تھی۔ ملکی ضروریات سے جتنا سامان بچ رہتا تھا وہ سب کا سب باہر بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ پوری تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور یہ تاجر نہایت دولتمند تھے۔ یہودیوں کو مسلمانوں کی یہ خوشحالی گراں گزری اور انھوں نے اس کے خلاف جد جہد کی۔ آخر ۱۹۲۱ء میں حاصلات زرعیہ کی برآمد حکماً بند کر دی گئی۔

فائدہ یہ ہوا کہ تمام مسلمان تاجروں کے دیوالے نکل گئے اور ثروت وطنی میں عربوں کا حصہ ایک بڑی حد تک کم ہو گیا۔ آج اس علم کی بدولت سیکڑوں عرب تاجر پیسہ پیسہ کو محتاج ہو گئے ہیں اور اپنی بیش قیمت املاک رہن یا فروخت کر کے قوت لایموت حاصل کر رہے ہیں۔

۶۔ ان باقاعدہ قانونی کوششوں کے علاوہ متفرق مساعی کا سلسلہ بھی جاری ہے جو عربوں کے حق میں کچھ کم مصیبت کا باعث نہیں۔ مثلاً پبلک رکس کے تمام ٹھیکے یہودیوں کے لیئے بالکل مخصوص ہو گئے ہیں۔ ریلوے لائنیں بچھانا، سڑکیں بنوانا، تار اور ٹیلفون کے سلسلے قائم کرنا، یہ سب کام انہی کو دیئے جاتے ہیں۔ ایک مسلمان مزدور ایک یہودی مزدور کے مقابلہ میں دوگنا کام کرتا ہے اور نصف اُجرت لیتا ہے، مگر باوجود اس کے شدید ضرورت کے بغیر کبھی مسلمان مزدور سے کام نہیں لیا جاتا۔ یہودیوں کی تجارت کو فروغ دینے کے لیئے یہودی دُکانداروں کو متعدد محصولوں سے مستثنیٰ سا کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک یہودی ہمیشہ ایک مسلمان کے مقابلہ میں سستا مال بیچتا ہے۔ دائرہ صنعت و تجارت کا ڈائرکٹر جنرل اور اس کا سارا اسٹاف یہودی ہے، اس لیے وہ یہودی تجار کو تمام ممکن آسانیاں بہم پہنچاتا ہے اور مسلمانوں کے راستے میں مشکلات پیدا کی جاتی ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی صنعت و تجارت بالکل یہودیوں کے قبضہ میں آتی جا رہی ہے اور مسلمانوں کے لیے مزدوری کر کے بھی پیٹ پالنے کا موقع نہیں رہا۔

ضرورت نہیں کہ اس عملی تشریح پر کوئی توضیح مزید کی جائے۔ ہر شخص جو مندرجہ بالا تلخیصات کو پڑھے گا وہ خود بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکال لے گا کہ یہودی لیڈروں نے اعلان بالفور کی تشریح جن الفاظ میں کی ہے، اور اس اعلان کی بنا پر جن عزائم اور توقعات کو ظاہر کیا ہے، انہیں برطانی دفتر مستعمرات کے ایجنٹ فلسطین میں حرف بحرف پورا کر رہے ہیں، مگر صیہونی تحریک کے مہلک اثرات کا ایک پہلو ہم سے چھوٹ گیا ہے جو یقیناً

سب سے زیادہ تاریک ہے۔ ایک قوم کا اخلاق اس کے قومی سرمایہ کی سب سے زیادہ بیش قیمت پونجی ہوتا ہے، اور اس اعتبار سے اخلاق کا بگڑ جانا، ایک قوم کے لئے مالی و اقتصادی نقصانات اور جسمانی مصائب کے مقابلہ میں زیادہ شدید نقصان اور المناک مصیبت ہے۔ یہودی مہاجرت کی تحریک اہل فلسطین کی اس پونجی پر بھی دست تعدی دراز کر رہی ہے اور اسکی بدولت ان کی تہذیب سخت خطرہ کی حالت میں ہے۔ نومبر ۱۹۱۸ء کے اعلان کا شائع ہونا تھا کہ تمام اقطاع عالم کے یہودیوں کو فلسطین کی طرف دعوت دی گئی اور صیہونی کانگریس نے بڑے پیمانہ پر ہجرت کا بندوبست شروع کر دیا۔ آغاز ہجرت کے پہلے ہی سال وہ ۲۰ ہزار یہودیوں کو مشرقی یورپ سے لے گئے اور دوسرے سال ان کا دریا اس بری طرح اُمنڈ آیا کہ صیہونی لیڈروں کو مجبوراً ہجرت کی رفتار سست کرنی پڑی کیونکہ اتنی کثیر آبادی کیلئے اسباب عیش و تنعم کا مہیا کرنا اور ان توقعات کو پورا کرنا جنہیں لئے ہوئے وہ لوگ اپنے بسے بسائے گھر چھوڑ کر آئے تھے نہ صیہونی لیڈروں کے بس کا کام تھا اور نہ حکومت اسے انجام دے سکتی تھی۔ تاہم اب تک کم و بیش ۲ لاکھ یہودی مہاجرین ارض مقدس کے حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کی صفات کے متعلق یہ کہنا کہ وہ حریص اور حد سے زیادہ طماع ہیں ایک غیر ضروری سی بات ہے، کیونکہ یہ صفات یہودیوں کی جبلت میں داخل ہیں جن سے ہر شخص واقف ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی بے سود ہے کہ وہ جنت ملنے کی توقعات لے کر فلسطین پہنچے ہیں اور تمام ارض مقدس کو اپنے بزرگوں کا ترکہ سمجھ کر اس کی ہر چیز کو اپنی ملک سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح انہیں مہاجرت پر ابھارا گیا ہے اور تمام یہودی بستیوں میں صیہونی کانگریس نے جس قسم کی تبلیغ و اشاعت کی ہے اس کی بنا پر ہر یہودی کو ایسی ہی توقعات لیے ہوئے ہجرت کرنی چاہیئے۔ پس ان امور معلومہ کو چھوڑ کر میں ان غیر معمولی بہیمیت اور حیوانی صفات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو انسانیت سے کوئی دور کا علاقہ بھی نہیں رکھتیں اور جن کی بدولت یقینی اندیشہ ہے کہ فلسطین کی مقدس سرزمین میں تھوڑے ہی عرصہ میں پیرس کے بدترین اخلاق سوز مناظر

کی تماشا گاہ بن جائے گی۔ اس کیفیت کو اپنے الفاظ میں لکھنے سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ خود ایک فلسطینی عرب کے الفاظ یہاں نقل کیے جائیں جو بڑے تاثر اور دلی رنج کے ساتھ ان لوگوں کی حیا سوز تہذیب کا نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

مہاجرین زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے بالشویک عقائد اختیار کر لیے ہیں اور بولشوزم ہی کی آب ہوا میں تربیت پائی ہے۔ یہ لوگ اپنے ان اشتراکی اصولوں کو انسانیت کا نچوڑ سمجھتے ہیں اور اہل فلسطین میں ان کی اشاعت کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ اصول نظام بشری کے بالکل منافی ہیں اور انسانی تہذیب کے لیے مہلک ترین جراثیم اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کے ہیمانہ اخلاق کی صحیح کیفیت کو اپنے الفاظ میں لکھنا تو الگ رہا، اس کے تصور سے بھی میری شرافت کانپتی ہے۔ وہ لوگ جلوت و خلوت کو ایک سمجھتے ہیں، علانیہ بازاروں اور عام گزرگاہوں میں وہ وہ حرکات کرتے ہیں جو ایک شریف انسان چھپ کر بھی نہیں کرتا۔ ان کی عورتیں سینے کھولے ہوئے ہاتھ کہنیوں تک ننگے، پاؤں گھٹنوں تک برہنہ، اور باقی حصہ بدن بھی نہایت باریک کپڑوں سے ڈھانکے ہوئے سڑکوں پر پھرتی ہیں، نوجوان یہودی ان کو بغل میں لیے ہوئے علانیہ بوسہ بازی کرتے چلتے ہیں۔ عام طور پر ان کے مرد اور عورتیں سب کے سب دریا کے کنارے جا کر بالکل برہنہ ہو جاتے ہیں اور نہانے کی تفریح کے ساتھ ساتھ جانوروں کی طرح زنا کی تفریح بھی شروع کر دیتے ہیں۔ باقاعدہ مناکحت کا دستور ان میں نہیں ہے ایک مرد جب تک چاہتا ہے ایک عورت سے تعلق رکھتا ہے، اور جب ان کے دل بھر جاتے ہیں یا موافقت مزاج میں فرق آجاتا ہے تو دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ کر کہیں اور اپنے حیوانی جذبات کا ٹھکانا ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بعض نے اس حالت کو بھی ایک غیر حیوانی حالت قرار دیا ہے اور وہ لمبے علاقہ اور التزام کو بھی ایک بیجا بندش سمجھتے ہیں جو کچھ عرصہ تک مرد و عورت کے درمیان قائم رہے۔ ان کے نزدیک انسان کی خانگی زندگی کا منشائے اصلی محض اس تقاضائے بہیمیت کو پورا کرنا ہے جو قدرت نے بقائے نوع کے لیے ان کی جبلت میں پیدا کر دیا

ہے۔ پس وہ صرف ان چند لمحوں کے لیے عورت اور مرد کے تعلق کو ضروری سمجھتے ہیں جب وہ تقاضا ان دونوں کو باہم مواصل ہونے پر مجبور کر دے۔ اور اس کے لیے ضروری نہیں کہ ایک جوڑا صرف ان چند ساعتوں کی مواصلت کے لیے کسی خاص مدت تک التزام تعلق کی بندش میں مبتلا ہے۔ گویا ان کی سوسائٹی کا نظام انسان کے اس ابتدائی عہد کی طرف ترقی معکوس کر گیا ہے جبکہ انسان جانوروں سے آدمی کی شکل میں نیا ہی نیا آیا تھا اور شکل و صورت کے سوا اپنی تمام صفات میں بالکل جانور تھا۔

اگرچہ یہ حرکات رذیلہ انہی لوگوں تک مخصوص ہیں، اور ان کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے، مگر ہمیں خطرہ ہے کہ انہیں دیکھ دیکھ کر ہماری نئی نسلیں بالکل تباہ ہو جائیں گی، اور فرزندان اسلام ان سے سبق سیکھ سیکھ کر ایک روز انہی کی طرح حیوان بن جائیں گے ان کی سوسائٹی کی یہ آزادی ایک نوجوان کو پہلی نظر میں بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے اور اس کا جوش شباب اپنے لیے ان اشتراکی اصولوں میں بہت سی آسانیاں پاتا ہے، اس لیے ہمیں قوی اندیشہ ہے کہ ہمارے نوخیز بچے اس تہذیب کی مضرتیں محسوس کرنے سے پہلے اس کے شکار ہو جائیں گے اور انہیں دیکھ دیکھ کر ہمارے آباؤ اجداد کی ہڈیاں اپنی قبروں میں تڑپیں گی۔"

یہ الفاظ کسی اضافہ کے محتاج نہیں۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ صیہونی تہذیب فلسطین کے لیے اخلاقی حیثیت سے کس قدر مہلک اور تباہ کن ہے۔

اعراب فلسطین پر صیہونی مظالم کی داستان صرف یہیں تک نہیں، بلکہ وہ کچھ خونی اوراق بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہاں تک جو کچھ تھا اس کو ایک "پرامن" جدوجہد سے متہم کیا جا سکتا ہے، مگر صیہونیوں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے قتل و غارت سے کام لینے میں بھی کوئی کمی نہیں کی۔ آئے دن کے لڑائی دنگوں پر احاطہ کرنا تو ایک امر مشکل ہے اور اس کے لیے ان صفحات میں گنجائش بھی نہیں نکل سکتی۔ البتہ چند بڑے بڑے

ہنگاموں کو یہاں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں نے اپنی سالانہ عادت کے مطابق نبی موسیٰ علیہ السلام کی محفل زیارت منعقد کی۔ اس تقریب سے سڑکوں پر بیشمار زائرین جمع تھے اور ہزاروں مسلمان تکبیر و تہلیل کرتے چل رہے تھے۔ ایک صیہونی یہودی کو مسلمانوں کی یہ شان اور ان کا یہ نظام خوش نہ آیا، اور اس نے سیدنا ابراہیم خلیلؑ کے علم پر دفعۃً حملہ کر دیا۔ مسلمانوں میں اس حرکت سے ایک شدید ہیجان پیدا ہو گیا اور ایک عرب نے فوراً اس یہودی کا کام تمام کر دیا۔ یہ گویا اس بڑے ہنگامہ کی تمہید تھی جو یہودیوں نے ایک سوچے ہوئے نظام عمل کے ساتھ برپا کرنا چاہا تھا۔ مجمع میں ہر طرف یہودیوں کی مسلح ٹکڑیاں پھیلی ہوئی تھیں، اور ان کے کپڑوں میں آتشیں اسلحہ چھپے ہوئے تھے۔ ہنگامہ کا سگنل پاتے ہی انہوں نے یکبارگی ہر طرف سے آگ برسانی شروع کر دی اور قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ مسلمان بالکل نہتے تھے۔ اور لڑائی کا ان میں سان و گمان بھی نہ تھا۔ اس لئے ابتداءً ان میں ایک انتشار پیدا ہو گیا مگر بعد میں جب انھوں نے سنبھل کر حملہ کیا تو یہودی قوت پس کر رہ گئی یہ قدس شریف کا پہلا حادثہ تھا جس میں ہزاروں مسلمان شہید و مجروح ہوئے۔

مئی ۱۹۲۱ء میں بولشویک یہودیوں نے یافا میں ایک مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرہ کا مقصد اصلی خواہ کچھ ہی ہو، مگر تمام مظاہرین راستہ چلتے ہوئے سب سے بڑا کام جو کر رہے تھے وہ مسلمانوں کو چھیڑنا تھا۔ آخر مسلمانوں سے نہ رہا گیا اور انھوں نے برابر کا جواب دینا شروع کر دیا۔ یہ چھیڑ چھاڑ بڑھتے بڑھتے ایک زبردست جنگ کی صورت اختیار کر گئی اور تمام یہودی مظاہرین اپنے چھپے ہوئے ریوالور اور رائفلیں لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو گئے مسلمان یہاں بھی نہتے تھے اس لئے کثرت سے مجروح شہید ہوئے، مگر انھوں نے نہتے ہونے کے باوجود یہودی قوت کو بالکل توڑ دیا۔ بعد میں حکومت نے اس بلوہ کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ارکان خود انگریزی فوج کے افسر تھے۔ اس کمیٹی کے

سامنے یہودیوں نے اپنے عزائم کھلے کھلے الفاظ میں ظاہر کئے ہیں جو رپورٹ کے مطالعے معلوم ہوتے ہیں۔

۲ رنومبر ۲۲ء کو مسلمانوں کا ایک جم غفیر بارگاہ الٰہی میں فریاد کرنے کے لیے مسجد اقصیٰ میں جمع ہوا۔ اور تمام مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کرکے ان بڑی و بحری بلاؤں سے نجات طلب کی جو منتقم حقیقی نے ان کے اعمال کی سزا دینے کے لیئے دنیا ہی میں بھیجدی ہیں۔ دعا اور فریاد کے بعد جب یہ مجمع باہر نکلا تو یہودی ایک بڑی تعداد میں ریوالور اور رائفلیں لیئے ہوئے ان کے استقبال کو موجود تھے۔ انہوں نے باہر نکلنے والوں پر دفعۃً آگ برسانی شروع کر دی اور مسجد اقصیٰ تک گرد خاک و خون کا ایک ہالہ طیار ہو گیا۔ اس مرتبہ بھی نہتے مسلمانوں نے یہودیوں کو سخت شکست دی مگر اُن کو شدید جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔

یہ مسلح ہنگامے بڑی طیاریوں کے بعد بپا کیئے گئے ہیں اور ان طیاریوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہودی لیڈر یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ خونریزی کیئے بغیر وہ فلسطین کے مالک نہیں بن سکتے۔ اور ان کے ذمہ دار رہنماؤں نے اپنے اس خیال کو کھلے کھلے لفظوں میں ظاہر بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ داؤد بلین نے جو صیہونیوں کے اکابر رجال سے ہے، کارلسباڈ کانفرنس میں کہا تھا کہ :-

"فلسطین میں ہماری خواہشات خونریزی کیئے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں"

اسی طرح صیہونی کانگریس کی مجلس انتظامیہ کے ایک کن موسیو جابوٹنسکی نے کہا تھا کہ :-

"ہمیں اپنے مقاصد حاصل کرنے کیلئے ایک یہودی فوج مرتب کرنی پڑے گی تاکہ ضرورت ہو تو ہم عربوں کا تلوار سے بھی استیصال کر سکیں"

ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے سب سے پہلے ان کی اعانت اور ہمت افزائی

خود حکومت سنے کی۔ وہ صیہونی کانگریس کے ارادوں سے بے خبر نہ تھی بلکہ اسے خود صیہونیوں سے بھی کچھ زیادہ ان کا علم تھا۔ مگر اس نے جان بوجھ کر خونریزی کا سامان کیا اور اواخر ۱۹۲۱ء میں حفاظت نفس کے بہانہ سے یہودیوں کو ہتیار رکھنے کی اجازت دے دی۔ مسلمانوں نے اس پر سخت احتجاج کیا اور آئینی حیثیت سے بحث شروع کی کہ اگر یہودیوں کی جانیں خطرہ میں ہیں تو حکومت کو ان کی حفاظت کرنی چاہیئے اور اگر حکومت حفاظت سے عاجز ہے تو اسے ملک میں ہتیار رکھنے کی عام اجازت دینی چاہیئے کیونکہ ہر شخص کو حفاظت نفس کی ضرورت ہے، اس کے لیے کچھ یہودیوں کی تخصیص نہیں۔ مگر وہاں تو بحث واستدلال کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ کیونکہ اصل مقصد تو یہودیوں کی ہمت افزائی تھی جس کے لیے حفاظت نفس کا محض بہانہ اختیار کیا گیا تھا۔

یہودیوں کو اتنا سہارا کافی تھا۔ اُنھوں نے خفیہ طریقوں سے ہر قسم کے ہتیاروں کی تہریب[۱] شروع کر دی اور غیر ممالک سے ہتیار لانے کے لیے ایک زبردست سازش سے اپنا کام کرنے لگی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح کتنے ہتیار ناجائز طور پر ملک میں درآمد ہوئے مگر چند واقعات جو ظاہر ہوگئے، اس فراہمی کی رفتار بتلاتے ہیں۔

۱۹۲۲ء کے اوائل میں ایک دن بندرگاہ حیفا کے خلاصی بہت سے بھاری بھاری صندوق اُتار رہے تھے۔ اتفاقاً ایک صندوق ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ گیا اور اس میں سے ایک ریوالور باہر نکل آیا۔ خلاصیوں نے پولیس کو اطلاع کی۔ ایسی خلاف توقع خبر پر تمام بحری پولیس اکٹھی ہوگئی اور انہیں تمام صندوقوں پر شبہ ہوگیا۔ کھول کر جو دیکھا تو ہر صندوق ریوالوروں اور کارتوسوں سے بھرا ہوا تھا چالاکی یہ کی گئی تھی کہ ان صندوقوں میں اوپر کی طرف شہد کی مکھیاں پرورش کرنے کے چوبی خانے بنے ہوئے تھے

---

[۱] کسی چیز کو قانون کے خلاف چوری سے درآمد یا برآمد کرنا۔ یہ لفظ عربی میں (smuggling) کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

جن پر چنگی کا محصول معاف ہے اور اس لئے چنگی خانہ میں ان کی تفتیش بھی نہیں کی جاتی۔ اس قسم کے تین سو صندوق جہاز سے اُترے تھے اور سب کے سب ایک یہودی لیڈر کے نام پر تھے۔ حیفا کی مرکزی عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ جرم ظاہر ہے کہ سنگین تھا، ملزم کے مجرم ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا، وہ خود اقراری تھا کہ صندوق اسی کے نام پر ہیں، مگر باوجود ان سب باتوں کے ایک تھوڑا سا قانونی تماشہ کرنے کے بعد مجرم صاف بری کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد پولیس نے چند یہودیوں کو گرفتار کیا جو بظاہر تو سمندر کے کنارے نہا رہے تھے مگر دراصل پانی کی تہ میں سے ٹین کے صندوق نکال رہے تھے۔ پولیس نے ان صندوقوں کو کھولا تو ہتیاروں سے ملو تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ ایک سازش ہے۔ ان لوگوں کے دوست جہازوں میں یہ صندوق اپنے ساتھ لاتے ہیں اور ساحل کے سامنے پھینک جاتے ہیں۔ اس پر محکمۂ چنگی کو ہوش آیا اور اس نے سختی کے ساتھ تفتیش شروع کی۔ نتیجہ تفتیش یہ تھا کہ ہر پارسل جو کسی یہودی کے نام پر تھا، ہتیاروں سے خالی نہ تھا۔ حتیٰ کہ کتابوں تک میں ہتیار رکھے ہوئے تھے۔ مگر یہ لوگ قانون کی پکڑ سے بدستور آزاد ہیں اور کسی کو سزا بھی ملتی ہے تو برائے نام۔ حکومت کی اس رعایت نے یہودیوں کی ہمتیں یہاں تک بڑھا دی ہیں کہ وہ اب ایک باقاعدہ فوجی نظام قائم کر رہے ہیں جس کے ماتحت یہودی نوجوانوں کو فوجی تعلیم دی جاتی ہے۔

اعراب فلسطین پر ان زیادتیوں اور خلاف انسانیت مظالم کا جو کچھ اثر پڑھ رہا ہے وہ یہ ہے کہ وہی عرب جو کل تک انگلستان کو اپنا ہادی سیاست داعی حریت اور نجات دہندہ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھتے تھے، آج انہیں کا یہ حال ہے کہ انگریزی سیادت کے نام سے متنفر ہیں، برطانی مدبرین کو علانیہ برا بھلا کہتے ہیں اور ان دنوں کو ترستے ہیں جب ترکوں کی مشفقانہ حکومت میں وہ فلسطین کے آزاد شہری تھے۔ ایک عرب تاجر

جو فلسطین کی مہذب اور تعلیم یافتہ سوسائٹی کے ممتاز ارکان سے ہے، اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے کہ :-

"ہم نے اول اول انگریزوں کی ایمانداری پر اعتماد کیا تھا، مگر اب ہم اپنی اس غلطی پر افسوس کرتے ہیں۔ ہمیں زمانۂ جنگ کی اعانت و مددگاری کا بڑا اچھا بدلہ دیا جا رہا ہے۔ ہمارے گھر چھینے جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی زمینیں خالی کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ہماری تجارت زراعت کو برباد کیا جاتا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ یہودیوں کو اقطاع عالم سے لاکر ہماری جگہ بسایا جائے۔ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ تمہارے لیے اس سرزمین پر اب ایک انچ بھی نہیں رہا۔ تم اپنا بوریہ بستر اٹھاؤ اور اپنے گھر غیر ملکی یہودیوں کے لیئے خالی کرو۔ عربوں کی چیخ پکار اور نالۂ و شیون کے لیئے برطانی تدبر کے کان بہرے ہوگئے ہیں۔ فلسطین کی فضائیں عربوں کی صدا سے کوئی گونج نہیں پیدا ہوتی۔ عرب کی بات سننے کا جو وقت تھا وہ اب نکل گیا۔ اب اگر کوئی کام ہے تو وہ صرف بنو اسرائیل کی حرص و آز اور طمع و ہوس کی تواضع . . . میں ترکوں کے زمانہ میں انگریزوں کے گیت گاتا تھا، میری زبان ہر وقت 'انگریزی انصاف' فراخدلی، رواداری اور آئینت کی ثنا و صفت سے تر رہتی تھی۔ مگر اب میں اپنی اس بیجا عقیدت پر نادم ہوں، فلسطین کی حالت زار پر مجھے رونا آتا ہے۔ اور تجربہ نے ہم سب کو بتلا دیا ہے کہ ترکی حکومت ہمارے لیے رحمت تھی؟"

ایک اور عرب بیت المقدس سے لکھتا ہے :-

"شام اور فلسطین کے عربوں نے اپنے دینی بھائیوں سے بغاوت کرکے جو زبردست حماقت کی ہے، اس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی۔ ہماری اس حماقت کا ایک ادنیٰ نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم ان ترکوں سے زیادہ بربادی و تباہی میں مبتلا ہیں جن کا گلا گھونٹ کر ہم نے نجات حاصل کرنی چاہی تھی۔ اب ہمیں ترکی حکومت کا پرامن زمانہ یاد آتا ہے، اور ہم ہی نہیں خود عیسائی عرب بھی اسے یاد کرکے روتے ہیں؟"

خود ایک انگریز جو برسوں فلسطین میں رہا ہے لکھتا ہے کہ :-

"میں یہاں برسوں رہا ہوں۔ مجھے اہالی فلسطین کے صحیح جذبات و حسیات کا گہرا علم ہے۔ اس علم کی بنا پر میری یہ قطعی و یقینی رائے ہے کہ عربوں کو یہودیوں سے جتنی نفرت ہے وہ حق بجانب ہے۔ یہ باہر سے آئے ہوئے اجنبی اہل ملک کو جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ سخت وحشیانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ ان کی آپس میں تو یہ حالت ہے کہ کتے بلی کی طرح لڑتے ہیں، مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں سب ایک ہیں اور حکومت ان کی پشت پر"

ضرورت نہیں کہ اس تمام بحث پر اب کوئی اختتامی تبصرہ کیا جائے۔ ہر شخص جو اس مضمون کا مطالعہ کرے گا وہ خود ہی فیصلہ کرے گا کہ جن عربوں کو ترکی حکومت میں آزادی کی سخت ضرورت تھی، اور جنھیں آزادی دلانے ہی کے لئے برطانیہ عظمیٰ نے مشرق میں آگ اور خون کا کھیل کھیلا تھا، انہیں کیسی اچھی آزادی و خود مختاری عطا کی گئی، اور پھر جن عربوں کی بدولت برطانیہ عظمیٰ کو مشرق میں بالادستی حاصل ہوئی اور جنھوں نے محض اس کے عہود و مواثیق پر اعتماد کر کے اپنے دینی بھائیوں کے خلاف اس کی مدد کی انہیں ان خدمات کی کیسی اچھی جزا دی گئی۔ یہ بات کہنے سننے کی نہیں بلکہ ہر شخص کے خود محسوس کرنے کی ہے۔

فلسطین کی آبادی :-

قضاء	مسلمان	عیسائی	یہودی	ادیان مختلفہ	مجموع
قدس شریف	۱۳۷۴۵۷	۳۷۰۶۳	۳۳۴۸۷		۲۰۸۰۰۷
یافا	۱۱۹۴۰۶	۱۵۲۵۰	۲۵۳۷۸	۱۲	۱۶۰۰۳۷
غزۃ	۶۸۵۳۸	۵۸۵	۳۱۱		۶۹۴۴۴
الخلیل	۶۱۸۲۶	۱۳۱۳۰	۱۱۹۲۴	۱۷۲۵	۸۸۶۰۵
فینیقیہ	۶۸۹۸۸	۱۹۹۱۵	۹۷۴۸	۵۳۱۸	۱۰۳۹۵۹
السامرہ	۲۶۵۱۶	۱۹۱۰	۳۸۷	۱۵۸	۱۰۴۹۷۵
بیر السبع	۲۶۵۱۶	۲۰۵	۳۸		۲۶۷۵۹
	۵۸۵۲۷۱	۸۸۰۳۹	۸۱۲۴۳	۷۲۱۳	۷۶۱۷۹۶

مختلف اقوام کے مدارس کو حکومت کی اعانتیں :-

مدارس اسلامیہ کو	۴۱۰	گنی سالانہ
مدارس مسیحی کو	۱۹۶۵	،،
مدارس یہودیہ غیر صیہونیہ کو	۸۷۵	،،
مدارس یہودیہ صیہونیہ کو	۲۶۴۵	،،

عہد عثمانی کے مصارف سے موجودہ دور برطانی کے مصارف کا مقابلہ :-

محکمہ	موجودہ حکومت کے مصارف سالانہ	عہد عثمانی کے مصارف سالانہ
(۱) ہائی کمشنر کا دفتر	۱۱۰۰۰ گنی	×
ناظر مدنی	۳۰۰۰۰ ،،	×
نظارت عدلیہ	۷۸۰۰۰ ،،	×
ساتوں اضلاع کے دفاتر انتظامی	۷۲۰۰۰ ،،	×
سکرٹریٹ کے کل مصارف	۱۹۱۰۰۰ ،،	۲۸۰۰۰ گنی
(۲) محکمہ مال	۳۲۰۰۰ ،،	۷۵۰۰ ،،
(۳) پبلک ورکس اور اسباب خوراک	۱۰۰۰۰ ،،	×
(۴) تجارت وصنعت	۵۰۰۰ ،،	×
(۵) گودیاں اور روشنی کے منارے	۱۱۰۰۰ ،،	۱۳۰۰ ،،
(۶) حفظان صحت	۱۷۳۰۰۰ ،،	۵۰۰۰ ،،
(۷) امن نامہ اور جیلخانے	۲۱۶۰۰۰ ،،	۳۰۰۰۰ ،،
(۸) دفاع	۹۱۰۰۰ ،،	×
(۹) ڈاک تار اور ٹیلیفون	۱۱۹۰۰۰ ،،	۲۲۰۰۰ ،،
(۱۰) ریلوے	(۹۰ کیلومیٹر) ۷۴۵۰۰۰ گنی	۲۶۰ کیلومیٹر) ۴۱۰۰۰ گنی
(۱۱) محاجرة اور آثار قدیمہ	۷۶۰۰۰ گنی	×
(۱۲) رفاہ عام	۱۷۲۰۰۰ ،،	۱۸۰۰۰ گنی
کل	۱۸۱۱۰۰۰ ،،	۱۵۲۸۰۰ ،،

مطبوعات جدیدہ

ابن رشد - از مولوی محمد یونس انصاری مرحوم فرنگی محلی -

مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڈھ

دار المصنفین اعظم گڈھ کے علمی کارناموں میں ایک گرانبہا اضافہ "ابن رشد" کی اشاعت سے ہوا ہے جو سلسلہ دار المصنفین کی اُنیسویں کتاب ہے۔ ابن رشد اندلس کا نامور فلسفی دنیائے اسلام کی قابل فخر ہستی ہے۔ اس کے علمی کارنامے یورپ ایشیا میں یکساں مشہور ہیں۔ لیکن اپنی بے حسی و علمی پستی کے بدولت ابن رشد کی صحیح علمی حیثیت اور اُس کے مساعی و خدمات کا کوئی مکمل تذکرہ ہماری زبان میں موجود نہ تھا۔ موجودہ کتاب صرف زبان اُردو ہی میں نہیں بلکہ پوری مشرقی دنیا میں اندلس کے اس نامور فلسفی کے حالات زندگی اور فلسفہ و کلام پر پہلا ناقدانہ تبصرہ ہے، جس کی اشاعت کا فخر بجا طور پر دار المصنفین کو حاصل ہے۔

مولوی محمد یونس مرحوم مصنف کتاب نے اپنے دیباچہ میں موضوع کی اہمیت، ترتیب و تہذیب کی دشواریاں اور ماخذ کتاب کا تفصیلی حال لکھا ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کا یہ دعوٰی کہ "اُردو زبان میں ابن رشد کے متعلق ممکن سے ممکن تحقیقات فراہم ہو گئی ہیں" بالکل بجا ہے۔

پوری کتاب تین حصوں پر تقسیم ہے۔ جس میں ابن رشد کے حالات زندگی اور اس کے فلسفہ کی نوعیت اور تاریخ پر علی الترتیب متعدد ابواب میں بحث کی گئی ہے لیکن ضمناً اس میں مسلمانوں کے علم کلام اور فلسفہ کی تاریخ و تنقید کے علاوہ یورپ میں اسلامی علوم و فنون کی ترقی و اشاعت کی نہایت مفصل تاریخ موجود ہے۔ اسی وجہ سے کتاب محض فن فلسفہ کے خشک و بے مزہ مباحث تک محدود نہیں بلکہ علمی و تاریخی معلومات سے مالامال ہے اور بلاشبہہ اس دور کی بلند پایہ تصانیف میں شمار ہونے کے لائق ہے

نگارستان ۔ از مولانا نیاز فتحپوری۔ دفتر نگار بھوپال   قیمت دو روپیہ ۸؍

مولانا نیاز فتحپوری ادب اردو میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں، ابتداءً ان کی شہرت کا باعث ان کے وہ ادبی مضامین ہوئے تھے جن کو اگر نثر شاعری کہا جائے تو بیجا نہیں اور جس کا خاص علمبردار "نقاد" مرحوم تھا۔ ان مضامین کا مجموعہ "ادب لطیف" میں بڑی گنجائش ہے اور شاعری کا میدان ایشیا میں کبھی محدود نہیں رہا۔ "مشرق" "دنیائے آب و رنگ" ہے اور رنگینی و گلکاری اس کی مایہ الامتیاز خصوصیت۔ نیاز صاحب کے ادبی مضامین بھی اپنے جذبات کی فراوانی، بیان کی دلآویزی، اور ادبی جدت طرازیوں کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں۔ کیوپڈ و سائیکی یونانی علم الاصنام کا مشہور فسانہ ہے جس کو ایک خاص انداز سے نیاز صاحب نے اپنی طرز خاص میں لکھا تھا اور وہ اس وقت بھی اسی شوق سے پڑھا گیا جیسا کہ اب اس مجموعہ میں تلاش کیا جاتا ہے۔ "نگارستان" میں کل ۲۱ مضامین ۲۰۲ صفحے ہیں۔ جن میں بعض ترجمے، کچھ طبعزاد فسانے، اور چند تقلیدی مضامین ہیں تمام مضامین شاعرانہ جذبات نگاری کے اس خاص رنگ میں لکھے گئے ہیں جو نثر اردو میں اس سے قبل موجود نہ تھا اور جس کی مثال مغربی لٹریچر اور فرانسیسی و انگریزی فسانے ہیں۔ "دل زیر سنگ" کے عنوان سے وکٹر ہیوگو کے بعض جملوں کا ترجمہ و اقتباس ملاحظہ ہو

"ساری کائنات کا سمٹ کر صرف ایک ہستی میں سما جانا"

"ایک تنہا ہستی کا پھیل کر آلہانہ وسعت اختیار کر لینا"

یہ ہے محبت"

"محبت سلام ہے فرشتوں کا تاروں کو"

کلام شاد۔ از مولانا سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ پریس علیگڈھ
قیمت قسم اول ۱۲ قسم دوم ۸

مولانا شاد عظیم آبادی اُن ممتاز شعرائے اردو میں سے ہیں جن کیلئے آج کہ وہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ خدمت زبان و ترقی شعر میں صرف کر چکے ہیں کسی قسم کی تعارف کی حاجت نہیں۔ عظیم آباد نے دہلی کی بربادی کے بعد زبان اُردو کے جو گرانمایہ جوہر پیدا کیے اُنیں مولانا شاد غالباً سب سے زیادہ مشہور اور قابل قدر ہیں۔ آپ کا کلام ایک عرصہ سے اخبارات و رسائل میں برابر شائع ہوتا رہتا ہے۔ لیکن دامن شوق کے بھر دینے کیلئے وہ بھی کافی نہ تھا چنانچہ اس سے قبل مولانا حسرت موہانی نے ایک مختصر انتخاب اُن کے کلام کا شائع کیا۔ اس کے بعد امید تھی کہ حضرت شاد خود اپنا مجموعہ کلام شائع فرمائیں گے اس لیے کہ دولت سخن کی جو فراوانی اُن کے یہاں ہے اس کے اعتبار سے اب تک جو کچھ اہل ذوق تک پہنچا ہے وہ گویا برائے نام ہے لیکن اس مرتبہ کلام شاد حصہ اوّل کے نام سے جو کچھ شائع ہوا وہ بھی مکمل نہیں

کلام شاد پر تفصیلی نظر ڈالنے کے لیئے یہ مختصر سطور کافی نہیں تیکن بعض غزلوں سے جستہ جستہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین خود اندازہ کرلیں کہ شاد محض زبان کے ہی مالک نہیں بلکہ واقعی شاعر ہیں اور جس طرح فن شعر میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں چشم حقیقت بیں بھی پائی ہے۔ کلام میں جذبات و خیالاتِ معرفت و حقیقت کی وہ جھلک ہے جو صرف ایک حقیقت شناس دل اور ایک قادر الکلام شاعر ہی پیش کرسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو

محبت میں نہ کیوں جی سے گزرتا ۔۔۔ مثل سچ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا
معدوم ہے لطف زندگانی ۔۔۔ بس طول حیات اِتھر یانی
پھر گئے رستے سے وہ گرد و غبار دیکھ کر ۔۔۔ رہ گئی میری بیکسی سوئے مزار دیکھ کر
شاد سخن کی جان ہے بادہ و نغمہ و سرور ۔۔۔ آپ تو شعر کہتے ہیں آپ کو احتراز کیوں
چمن کو یاد کرکے گھڑیوں ہی آنسو بہاتا ہوں ۔۔۔ کوئی تنکا جو مل جاتا ہے اُجڑے آشیاں کا

کلام شاد کی تقطیع ۲۶×۲۰ عمدہ سفید کاغذ اور نہایت اچھی طباعت ہی۔
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ علیگڑھ

ندائے اسلام - اڈیٹر مولانا محمد منظر الدین۔ دائرہ علمیہ الامان دہلی۔

دہلی کے جدید رسائل میں "ندائے اسلام" کا اور اضافہ ہوا ہی جو مولانا منظر الدین صاحب کے زیر ادارت بڑی تقطیع پر مہینہ میں دو بار شائع ہوتا ہی۔ ہمارے پیش نظر اس وقت اس کا تیسرا نمبر ہی۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سوشل اصلاح کے علاوہ دہلی کی فضا سے متاثر ہو کر ندائے اسلام بھی شدھی، سنگٹھن، آریہ سماج اور چھوت چھات پر خصوصیت سے توجہ کرتا ہی "صبح ترکی" کے نام سے مسٹر پکتھال کے مشہور ناول "اربی آدرس" کا ترجمہ بھی شائع ہو رہا ہی جو قاضی اشتیاق حسین صاحب قریشی کے زور قلم کا نتیجہ ہی۔ مضامین نظم و نثر اور عنوانات کے تنوع نے رسالہ کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہی۔ کتابت و طباعت بھی دیدہ زیب۔
قیمت سالانہ للعہ ر

رفیق صادق - اڈیٹر پیرزادہ ولی اللہ مخدومی۔ گوجرانوالہ۔

صوبہ پنجاب نے جہاں اردو کی نہایت قیمتی خدمات انجام دئے ہیں وہاں بعض مرتبہ نادانستہ طور پر اردو زبان پر بعض ناواجب یادتیاں بھی روا رکھی ہیں جو اس صوبہ کے اہل قلم کی طرف تو منسوب نہیں کی جا سکتی ہیں لیکن اُن کی بے اعتنائی کو ضرور اس کا ذمہ دار قرار دینا پڑتا ہی۔ اور اس کی وجہ زیادہ تر وہاں کے رسائل و اخبارات کی کثرت اور ان میں تجارتی اغراض پر علمی و ادبی خوبیوں کی پامالی ہی۔ 'رفیق صادق' بھی پنجاب کے کثیر التعداد ماہوار رسائل میں سے ایک ہی۔ جس کی طباعت و کتابت زیادہ اچھی نہیں کاغذ بھی معمولی ہی۔ لیکن مضامین کا تنوع قابل دید ہی جس میں مذہبی علمی سیاسی ادبی نثر و نظم ہر قسم کے مضامین ہیں۔ ایک مضمون کا عنوان "ایک رقت انگیز و سنسنی خیز داستان" بھی ہی۔ قیمت سالانہ ۔ے ر

الہلال - اڈیٹر فضل حسین صدیقی - ہلالی پریس - دہلی -

۱۸×۲۲ کی خوشنما تقطیع اور اچھے سفید کاغذ پر عمدہ لکھائی چھپائی سے یہ ماہوار رسالہ دہلی سے نکلتا ہے - لیکن مرتب صاحب کی جرأت قابل داد ہے کہ وہ مضامین کے انتخاب اور اس جستجو میں اپنا وقت ضائع نہیں ہونے دیتے کہ خواہ مخواہ اوریجنل اور جدید مضامین ہی شائع کیے جائیں بلکہ پرانے رسالوں سے ہر قابل پسند مضمون بے تامل اپنی ضرورت کے مطابق شائع فرماتے رہتے ہیں - چنانچہ "لذت درد" "نقاد" مرحوم کے دور اول کا ایک مختصر و پر لطف ادبی مضمون بھی ہے جس کے لکھنے والے نے گو اس وقت اس کو "آشنائے درد" کے نام سے شائع کیا تھا لیکن فرضی نام کی وجہ سے وہ اپنے حق کی تصنیف سے دست بردار ہونے کو آج بھی آمادہ نہیں ہیں - اسی طرح عارف صاحب کی پرانی غزل جو اس سے قبل شائع ہو چکی ہے اس رسالہ میں بھی موجود ہے قدیم اساتذہ کا کلام بھی کسی موقع سے درج رسالہ کر دیا جاتا ہے - چنانچہ حصہ نظم میں عراقی کے ایک مشہور غزل کی نقل کی گئی ہے جس کا یہ شعر ہمیں کبھی نہیں بھولتا ؎

به عالم هر کجا درد و غمے بود   بہم کردند و عشقش نام کردند

تکبیر - مجلس دار التصنیف دہلی - اڈیٹر اکبر حیدری -

یہ رسالہ ماہ مارچ سے نکلنا شروع ہوا ہے - پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے - ۱۸×۲۲ تقطیع ہے اور طباعت و کتابت عمدہ ہے - مذہبی و ادبی مضامین زیادہ ہیں حصہ نظم میں مشہور شعراء کی بہت سی غزلیں درج ہیں بعض دلچسپ مذہبی و علمی مضامین کے علاوہ چند ادبی مضامین بھی ہیں اور "پیغام" کے عنوان سے افتتاحی مضمون جس میں تکبیر کے اغراض و مقاصد کا اعلان کیا گیا ہے خطیبانہ بلند آہنگی کی عمدہ مثال ہے -

قیمت سالانہ عہ/

حسن و عشق - ایک ماہوار روحانی رسالہ۔ اڈیٹر ابو محمد مصلح ابو العلائی مقام اشاعت ڈہری ضلع شاہ آباد - آرہ -

رسالہ کا نام اور اس پر "روحانی" ہونا بجائے خود ایک عجیب حیثیت ہے۔ لیکن جس طرح نام اور اس کی صفت کا صحیح علاقہ بہ یک نظر ذہن نشین نہیں ہوتا اسی طرح رسالہ کے مضامین کو روحانیت سے کوئی خاص علاقہ نظر نہیں آتا - یہ ممکن ہے کہ "حسن و عشق" کی اصلاح میں روحانیت کا کوئی خاص مفہوم ہو -

رسالہ ۲۰×۲۶ تقطیع پر دو جزو کی ضخامت کے ساتھ شائع ہوتا ہے - مضامین زیادہ تر عام ادبی اور شاعرانہ رنگ کے ہیں جن کے لیے اب اصطلاحاً روحانی کہنا زیادہ مناسب ہوگا - مضامین ادب اردو کے لحاظ سے بلند پایہ نہیں کہے جا سکتے - حصہ نظم میں غزلیات زیادہ ہیں - چندہ سالانہ ۸ر

"ناقد"

نقد و نظر

اخبار ٹائمز نے انگلستان کے مشہور شاطر سر والٹر پیریٹ کی وفات کا اعلان کرتے ہوئے اُن کے بعض کمالات کا ذکر کیا ہے اور بالخصوص شطرنج میں جو دستگاہ اُن کو حاصل تھی اُس کا حال لکھا ہے۔ ان کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ وہ پیانو بجا رہے تھے اور ساتھ ہی چھ بساطیں شطرنج کی بچھی ہوئی تھیں اور وہ ان سب بازیوں کی چالیں خود بتا رہے تھے اور اس دوران میں اُن کے احباب ان کو پریشان کرنے کے لیے برابر اُن کے اوپر تکیہ اور چھوٹی چھوٹی چیزیں پھینک رہے تھے۔

لارڈ ایسٹر نے حال میں ایک وفد کی سرکردگی قبول فرمائی جو ہوم ممبر انگلستان کے پاس اس غرض سے حاضر ہوا تھا کہ ۱۹۲۰ء سے جو عورتوں کو محکمہ پولیس میں ملازمت کا موقع دیا جاتا ہے اس کی توسیع کی جائے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ ایک کمیٹی اس غرض سے متعین کی جائے کہ اس عرصہ میں عورتوں نے جو کچھ کام پولیس میں انجام دیئے ہیں ان کا لحاظ کرکے آیندہ کے لیے زیادہ مواقع خدمت کے دیئے جائیں۔ ہوم ممبر نے فرمایا کہ گورنمنٹ اس اصول کو تسلیم کر چکی ہے کہ عورتوں کی پولیس مستقلاً قائم کر دی جائے۔

سر وسوسارایا نے حال میں اپنے ایک مضمون میں ہندوستان کی موجودہ حالت پر ماہرین سیاست اور مجالس قانون ساز کو توجہ دلائی ہے ہندوستان کی معاشی حالات کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ:-

ہندوستان میں دولت کا اوسط بحساب آبادی صرف تین سو روپیہ فی کس ہے اور سالانہ آمدنی فی کس ۴۵ روپیے (گویا ۴ روپے ماہوار

سے بھی کم ، اسی کے مقابلہ میں انگلستان کی دولت فی کس ۵۰۰ ۴ روپئے اور ماہوار آمدنی ۷۰۰ روپئے ہو۔ اس کمی دولت کالازمی نتیجہ یہ ہو کہ غریب ہندوستانی امراض اور وبا کا بہ آسانی شکار ہوجاتا ہو۔ اسی لئے اوسط اموات ہندوستان میں ایک میل کے رقبہ میں ۱۴۲ اشخاص سالانہ کا ہو اور انگلستان میں اسی رقبہ اور تناسب سے صرف ۱۵ اشخاص۔ اوسط عمر کے اعداد بھی اسی طرح مختلف ہیں۔ انگلستان میں اوسط عمر کا اندازہ ۴۸ سال کیا جاتا ہو اور ہندوستان میں صرف ۲۳ سال ہو۔

بدھ مذہب کے پیرو ایک عرصہ سے یہ مطالبہ کررہے ہیں کہ گیا میں گوتم بدھ کی عبادتگاہ اور اس کے متعلق زمین بدھ مذہب کے لوگوں کو مل جانا چاہیے اور اس وقت تک چونکہ حکومت نے کوئی شنوائی نہیں کی اسلیئے وہ کہتے ہیں کہ اگر مذہب بدھ کے پیرو بھی دوسرے لوگوں کی طرح بغاوت اور نقص امن کرتے تو اُن کے مطالبات بھی پورے ہو جاتے۔

روہر کا قبضہ روہر کے قبضہ سے برطانیہ کے پتھر کے کوئلے کی تجارت کو بہت نفع پہونچا ہو۔ روہر کے قبضہ کے بعد سے جرمنی کا کوئلہ بازاروں سے ناپید ہو گیا۔ یہ کمی ولایتی کوئلے سے اس طرح پوری ہوئی کہ برطانیہ نے انگریزی کوئلے کی تعداد ۲ کروڑ ۶ لاکھ ٹن سے جو گزشتہ سال تھی ۹ کروڑ ۴ لاکھ ٹن بڑھادی گویا ۱۵ فیصدی گزشتہ جنگ کے زمانہ سے زیادہ ہو گئی۔ جنوری ۱۹۲۳ء سے جون ۱۹۲۳ء تک انگلستان کی کوئلے کی پیداوار ۱۴ کروڑ ٹن تھی، حالانکہ انھیں ایام میں سال ماسبق میں ۱۳ کروڑ ٹن تھی۔ گویا اس طرح سے کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے بھی بڑھ گئے۔ ان کی تعداد اس وقت ۱۲ لاکھ ہو۔ جو گزشتہ سال سے ایک لاکھ ستر ہزار زیادہ ہو۔ اسی طرح سے کوئلہ کی قیمت اس وقت ۲۷ شلنگ فی ٹن ہو جو ایک سال قبل صرف ۲۲ شلنگ ۲ پنس

تھی - مزدوری میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ ۲ پنیس فی نفر سے زیادہ نہ بڑھی۔ یہی شرح جون ۱۹۲۲ء میں تھی۔ اس وقت تو اس سے بھی کسی قدر کم ہے؛ پیداوار کے اخراجات ۱۸ شلنگ فی ٹن سالانہ سے صرف ۱۶ شلنگ فی ٹن سالانہ رہ گئی؛ ناگہانی واقعات کی تعداد زیادہ ہوگئی، گزشتہ سال ۸۰۴ کام ہوئیں۔ امسال صرف نصف سال میں ۶۰۰ واقعات ہو چکے ہیں۔

المختصر سرمایہ دار کی تجارت کی کامیابی کا یہ ایک بہترین وصحیح خاکہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ فراوانی اس وقت بھی رہے گی جبکہ زوہر کی کانوں سے کوئلے پھر آنے لگیں گے؟

تاج - تعمیر کے لیے آگرہ کے جنوب میں ایک وسیع قطعۂ زمین راجہ جے سنگھ (مان سنگھ کے پوتے) سے خرید کیا گیا اور فن تعمیر کے ماہرین نے نقشے پیش کرنے شروع کیے۔ چنانچہ شاہ جہاں نے ایک نقشہ پسند کیا اور اُس کے مطابق پہلے لکڑی کا ایک نمونہ طیار کیا گیا۔

۱۶۳۲ء کے ابتدا میں تعمیر شروع ہوئی اور ۱۶۴۳ء میں (حسب بیان منتخب اللباب و بادشاہ نامہ) پچاس لاکھ روپیہ صرف ہونے کے بعد انجام کو پہونچی۔ دیوان آخر یدی میں نو کروڑ سترہ لاکھ کا تخمینہ کیا گیا ہے۔ سلسلۂ تعمیر میں امانت خاں شیرازی طغرا نویسی کی خدمت پر مامور تھا اور استاد عیسیٰ معماروں کا سردار تھا۔ استاد پیر کے سپرد نجاروں کا اہتمام کیا گیا اور رام مل کشمیری چمن بندی کا ذمہ دار قرار پایا۔ علاوہ ان کے اسمٰعیل خاں رُومی جو تعمیر گنبد کا ماہر تھا اور بنوہر، چھٹ مل و زورآور جو بہترین سنگتراش تھے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بعض اُردو کی کتابوں میں اور بھی بہت سے کاریگروں کے نام لکھے ہیں۔ لیکن وہ قابل وثوق نہیں اور نہ اُن کے ماخذ کا پتہ چلتا ہے۔

دیوان آخریدی میں لکھا ہی کہ تاج کی تعمیر میں بیس قسم کے قیمتی پتھر صرف ہوئے ہیں جو نہایت کاوش و صرف کثیر سے فراہم کیے گئے ہیں۔

عقیق	قندہار	سے مہیا کیا گیا	فیروزہ	بابا بڈھن کی پہاڑی	سے مہیا کیا گیا
لاجورد	لنکا	"	سنگ موسیٰ	کوہ سینا	"
سنگ سلیمانی	ولایت بالاد (؟)	"	سنگ گوالیری	دریائے گوالیار	"
سنگ زریں	بصرہ	"	زبرجد	ایران	"
تینجا	دریائے نیل	"			
عجوبہ	کماؤں کے کوہستانی دریاؤں	"	دال چنا	دریائے اسن	"
مرمر	مکرانا	"	سنگ یمنی	یمن	"
مرمیہ	بصرہ	"	سنگ سرخ	تمام اطراف ملک	"
مونگیر	بحر اطلانطک	"			
تابنڑہ	دریائے گنڈک	"			

چرخہ اور جرمنی

"گزشتہ دو سال سے جرمنی نے دیسی صنعت و حرفت کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ خصوصاً اُس نے چرخہ کاتنے اور کپڑا بننے پر بہت زور دیا ہے۔ ملک کے ہر گوشہ میں کسانوں نے چرخہ اور کرگہ کا استعمال زور شور سے جاری کر دیا ہے۔ اور اس تحریک نے ایک عظیم الشان صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ امر بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ یہ حالت نہ صرف جرمنی کی ہے بلکہ ہنگری کا بھی یہی حال ہے۔ اخبارات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہنگری میں اس وقت ۸ ہزار کرگھے زیر استعمال ہیں جن میں سے دو ہزار برابر چلا کرتے ہیں۔ وزیر تجارت ہنگری نے پچاس ہزار پونڈ سوت کے خرید کی اجازت دی ہے تاکہ اُس سے ان کرگھوں میں کپڑے بنے جائیں۔ باوجودیکہ جرمنی کی اقتصادی و صنعتی حالت ہنگری سے کہیں زیادہ بہتر ہے تاہم ان دونوں ممالک کے باشندے اس قدر غریب ہیں کہ وہ مشین کے بُنے ہوئے کپڑے نہیں خرید سکتے۔ جس کی وجہ سے روئی اور سوت کی درآمد لازمی ہوگئی ہے۔ چاہے اُس کے لیے کتنی ہی قیمت نہ دینی پڑے۔"

چرخہ کی تحریک نہ صرف ہندوستان ہی کی موجودہ اقتصادی حالت کے لیے مفید ہے بلکہ پتہ چلتا ہے کہ زمانہ حال کی اقتصادی حالت چرخہ ہی کے ذریعہ سے سنورے گی۔ مبارک ہیں وہ قومیں جو اپنے تنزل کے اسباب کے علاج میں لگ جاتی ہیں!

روس کے پیمانے "دی میٹرک ایسوسی ایشن" نے جس کے صدر جارج ایف کنز ہیں، حال میں یہ اعلان کیا ہے اُسے روس سے ایک حکم موصول ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روسی گورنمنٹ ناپنے اور تولنے کے لئے صرف میٹرک طریقہ کو روا رکھے گی۔ مسٹر ہاورڈ، ناظم "میٹرک ایسوسی ایشن"، لکھتے ہیں کہ اُس نئے قانون کے اجرا سے برطانوی اور روسی تعلقات پر خاص روشنی پڑتی ہے۔" وہ بیان کرتے ہیں کہ "برطانوی

کوارٹ، گیلن، اور سیال اشیاء کے ناپنے کے دوسرے پیمانوں میں جواب تک روس میں رائج اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پیمانوں میں قریب قریب ۲۰ فیصدی کا فرق تھا۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد سے برطانوی اور روسی تجارتی لین دین میں تول اور ناپ کیلئے اب صرف میٹرک سسٹم برتا جا سکے گا۔

"ناظر"

پیامِ ہستی

تبسم کی ہوس ہو، زخم دامن دار پیدا کر
جو گریہ آرزو ہو، چشم دریا بار پیدا کر

مرض ہی کیا، مداوا جس کا آساں ہو طبیبوں پر
نہ پہچانے مسیحا جس کو وہ آزار پید

تجھے اے دل عدو کو ہو اگر چبھتی ہوئی کہنا
تو ہر ہر حرف میں تیزیِ نوکِ خار پیدا کر

حیاتِ جاوداں کی ہو خریداری اگر منظور
دلِ بے مدعا جیسا دُرِ شہوار پیدا کر

اگر اس مجلسِ گیتی میں اوروں کو رُلایا ہے
دلِ درد آشنا و دیدۂ خونبار پیدا کر

مجھے یہ ہمتِ مردانہ کہتی ہے کہ "اے دل
جو قبل از موت ہی مرنے پہ ہو تیار پیدا کر"

تنازع للبقا جاری ہے، تو میدانِ ہستی میں
نہ ہو جس کی سپر ایسی کوئی تلوار پیدا کر

بقائے اقویا کے مسئلہ پر بحث سے پہلے
تنِ سہراب و زورِ حیدرِ کرار پیدا کر

سمجھتا ہے جسے تو زندگی، عزمِ تسلط ہے
جو جینا ہے، سرشتِ دیوِ آدم خوار پیدا کر

جو اس عالم میں جینا ہے تجھے حکمِ اعدوا پر
تو استعدادِ دفعِ حملۂ اغیار پیدا کر

اگر منظور ہے تجھ کو ملے عالم کی جو پائی
تو اپنے پاؤں میں پھر گردشِ پرکار پیدا کر

اگر ہے چونکنا منظور قرآں کی تلاوت سے
برائے زخمِ غفلت مرہمِ زنگار پیدا کر

اگر تیری تمنا ہے کہ شایانِ خلافت ہو
تو شوقِ بندگیِ واحدِ قہار پیدا کر

"صدائے خاموش"

تصنیف و تالیف جامعہ ملیہ اسلامیہ

کی

جدید مطبوعات

تاریخ الدولتین | از مولنا نیاز فتح پوری (بنی امیہ و بنی عباس کے عہد کی سب سے زیادہ موثر دلکش قابل استناد تاریخ ایک جلد میں صرف اسی کتاب میں نظر آئے گی جو جرجی زیدان مصری کی شہرۂ آفاق تاریخ اسلامی کی بنا پر اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے طرز بیان کی خوبی اور عبارت کی دلکشی کے لیے مولانا نیاز فتح پوری کا نام کافی ضمانت ہے قیمت . . . . عہ

انتخاب کلام میر | از مرتبہ مولوی نورالرحمن بی اے. اردو زبان کے بہترین شاعر اور استاذ الاساتذہ میر کی حیثیت میر کے ضخیم کلام کا انتخاب مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے لیکن جس سوز و گداز نے میر کو خدائے سخن بنایا ہے اس کے صحیح نمونے صرف اسی انتخاب میں نظر آتے ہیں جو نہایت مختصر ہونے کے ساتھ ہی میر کی تمام غزلیات کا جوہر ہے ابتدا میں حالات زندگی اور ایک بسیط مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں اردو شاعری کی تاریخ مختصر اور موجودہ فن تنقید کے اصول پر اس عہد کے شعرا کا موازنہ شعرائے قدیم سے کیا گیا ہے قیمت . . . عہ

عرض جوہر | مولانا محمد علی مرحوم کی غزلیات کا مجموعہ اس سے قبل شائع ہو چکا ہے لیکن زندان چھندواڑہ کے مکاشفات اس میں نہیں ہیں عرض جوہر میں مولانا کا تازہ ترین کلام اور وہ بے نظیر غزلیں موجود ہیں جو صرف چھندواڑہ کے زندانی ہی کی زبان سے ادا ہو سکتی تھیں قیمت . . . .

قواعد عربی (علم صرف) | از علامہ محمد یوسف السورتی استاد عربی جامعہ ملیہ علم صرف پر اردو میں کوئی تصنیف اس سے زیادہ مکمل و مستند اب تک نہیں شائع ہوئی اور طلبۂ صرف کا ترجمہ و ادبیات عربی میں مطبوعہ یہ کتاب اس وقت تک اپنی نظیر آپ ہے قیمت . . . ——

جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

مطبوعات شرکت کاویانی برلن (جرمنی)

(صرف مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو ہندوستان میں ان کتابوں کی فروخت کا حق ہے)

۱- سفرنامہ حکیم ناصر خسرو | سید شاہ ناصر سادات ناصر خسرو مصنف چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوا۔ اس سفرنامہ میں ... کے جغرافیائی حالات نہایت عجیب و عبرت آموز ہیں جن میں مصنف کی دو جلدوں ... پر مشتمل ہیں ... ایرانی نسخہ کے مطابق مطلا و رنگین کاغذ نہایت اعلیٰ ... کر کے چھاپا گیا ہے طباعت نفیس قیمت .... ۶؍

۲- زاد المسافرین | حکیم ناصر خسرو کی یہ دوسری معرکۃ الآرا کتاب ہے جو عرصے سے ناپید تھی اور اب مطبع کاویانی نے نہایت صحت و اہتمام کے ساتھ طبع کرائی ہے فلسفہ و تصوف و حکمت اسلامی کی یہ مستند کتاب ہے قیمت ۔۔۔ ۶؍

۳- گلستان | شیخ سعدی شیرازی کی شہرۂ آفاق کتاب جدید قالب میں لفظ آئی ہے کاغذ عمدہ طباعت نفیس اور سرورق خوبصورت قیمت .... ۱۲؍

۴- سیاحت نامہ | از مرزا ملکم خان ناظم الدولہ جن کی علمی و قلمی جد و جہد سے ایران دوبارہ زندہ ہوا۔ یہ ان کے ... رسالوں کا مجموعہ ہے جس میں گذشتہ صدی کے نظام حکومت ایران کی ابتری کی تصویر دکھائی گئی ہے فارسی ... قدردان اس تحفہ کو بڑی قدر سے قبول کریں گے قیمت .... ۱۲؍

۵- ہوش و گربہ فارسی | از خواجہ عبید زاکانی جو آٹھویں صدی کا ہجو گو اور مشہور شاعر تھا چوہے بلی کی جنگ کا قصہ ... ابتک عصری ... جو عہد حاضر کے لیے بھی یکساں ... ہر صفحہ پر رنگین و دلاویز تصاویر ... بچوں کے واسطے بھی نہایت موزوں ہے قیمت .... ۸؍

۶- تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء | مولفہ حمزہ ابن الحسن اصفہانی ... میں لکھی گئی نہایت ... کے ساتھ ... ایرانی ... و عرب کے متعلق تمام ... کی تفتیش و تحقیق ... نہایت دلچسپ نسخہ ہے قیمت .... ۱۲؍

۷- حساب الصبیان | ... کے واسطے بہترین ... قیمت ۱۰؍

۸- ... | ... کی ... ۸؍

۹- ... | [illegible] ۸؍

۱۰- ... | [illegible]

قرآن مجید

معہ ترجمہ جدید

فتح الحمید

اِس وقت تک جس قدر نسخے کلام مجید کے معہ ترجمہ شائع ہوئے ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ دلکش اور واضح و روشن ہی۔ ترجمہ نہایت سلیس بامحاورہ حمائل متن ہی از مولینا فتح محمد خاں صاحب جالندھری ملک کے مقتدر اور قابل وثوق اہل علم کی اس ترجمہ کے متعلق بہترین رائیں ہیں جو شروع میں درج کردی گئی ہیں۔ ۲۰×۳۰ سائز کی حمائل ہی جو ظاہری و معنوی دونوں خوبیوں میں قابل تعریف اور لائق زیارت ہی بیرونی خانہ کعبہ و مدینہ منورہ کے رنگین و خوشنما بلاکس سے مزین جلد پر نام سنہرے حروف میں کندہ ہی ہدیہ ے،

مجموعہ کلام جوہر

مولینا محمد علی مظلہ کے کلام کا مجموعہ اب دوسری بار طبع ہوا ہی۔ مولوی عبدالماجد صاحب بی اے نے ایک مکمل و بسیط اور دلکش مقدمہ میں مولینا کے حالات زندگی اور کلام پر مکمل ریویو کیا ہی با تصویر

قیمت ۱ر



عرض جوہر

مولینا محمد علی مظلہ کے کلام کا پہلا مجموعہ جب شایع ہوا تو اُس میں اُن کا وہ تمام کلام جو بیجاپور جیل میں مرتب ہوا ہی شائع نہ ہوسکا مولینا کی رہائی کے بعد یہ دوسرا حصہ جس میں آخری حصہ کلام موجود ہی شایع کیا گیا قیمت ۸ر

تاریخ الامت

ابتدائے اسلام سے آج تک کی مکمل تاریخ ہوگی جس کے چار حصے شائع ہو چکے ہیں۔ نہایت معتبر و مستند ماخذوں سے آسان عام فہم سلیس اور دلکش زبان میں اس سے بہتر بطرز جدید ابتک کوئی تاریخ امت اسلامیہ کی موجود نہیں ہی کتاب اس قابل ہی کہ ہر مسلمان کے پاس اس کا ایک نسخہ رہنا ضروری ہی حصہ اول سیرۃ الرسول قیمت عہ مجلد عہ حصہ دوم خلافت راشدہ قیمت ۱۲، مجلد [illegible] حصہ سوم خلافت بنی امیہ قیمت [illegible] حصہ چہارم خلافت عباسیہ قیمت ۱۲،

محجوب الارث | فقہ اسلامیہ کے مشہور مسئلہ پر اجتہادی رنگ میں دلچسپ بحث ہی قیمت . . . . ۴؎

تاریخ القرآن | (از مولینا محمد اسلم جیراجپوری) جس میں قرآن حکیم کے ابتدائے نزول سے لیکر آج تک کے تمام تاریخی حالات اور اس کے متعلق ہر قسم کی معلومات اور لطیف علمی مباحث نہایت تحقیق اور اختصار کے ساتھ مختلف زبانوں کی مستند کتابوں سے اخذ کر کے لکھے گئے ہیں قیمت عہ، مجلد . . . ۱۲؎

حیات جامی | مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ کی نہایت مکمل اور مقبول سوانح عمری ہے قیمت . . . . ۸؍

حیات حافظ | مولانا حافظ علیہ الرحمتہ کے مکمل حالات زندگی کے ساتھ ان کے کلام پر نہایت دلآویز تنقید قیمت . . . . عہ

حقائق اسلام | فلسفۂ اسلام پر عقلی دلائل و براہین از مفتی انوار الحق صاحب ایم اے نئی روشنی کے حضرات کے واسطے قابل قدر تحفہ ہی قیمت . . . . . ۱۲؎

مکاتیب | نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر دلچسپ پر از معلومات بہترین مجموعہ مرتبہ مولوی محمد امین صاحب زبیری مہتمم تاریخ بھوپال قیمت . . . . عہ

خطبۂ صدارت شیخ الہند مرحوم | بہ تقریب افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ قیمت ۲؍

خطبۂ صدارت مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مدظلہ | بہ تقریب جلسۂ اول تقسیم اسناد جامعہ ملیہ قیمت . . . . ۲؍

خطبۂ صدارت | از مولانا محمد علی مدظلہ جو جناب موصوف نے بہ حیثیت صدر انڈین نیشنل کانگریس بمقام کوکناڈا ارشاد فرمایا تھا۔ (انگریزی) و اردو . . . . عہ

الوراثتہ فی الاسلام | قانون وراثت پر مولانا کا مجتہدانہ کارنامہ (عربی) قیمت . . . . ۸؍

تصانیف خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی پروفیسر جامعہ ملیہ علی گڈھ

القرآن فی معارف القرآن

قرآن حکیم کی اس سے بہتر زبان اُردو میں کوئی تفسیر ملک میں موجود نہیں مولانا کی یہ خدمت قابل قدر و ستائش ہے۔ آپ جن مضامین کو وقت و زمانہ کے لحاظ سے ضروری اور اہم خیال فرماتے ہیں پہلے انھیں کو ترتیب فرمارہے ہیں۔ ابتک دو حصے شائع ہوچکے ہیں۔

حصہ اوّل **الخلافۃ الکبریٰ** سورۂ بقر کی مکمل و مفصل تفسیر حجم ۲۲۴ صفحات قیمت للعہ مجلد ۱۲

حصہ چہارم **الصراط المستقیم** سورۂ انفال و توبہ کی مبسوط تفسیر۔ شروع میں مسئلہ جہاد پر ایک بصیرت افروز مقدمہ کا اضافہ ہے حجم ۴۰۰ صفحات کاغذ ولایتی سفید و چکنا قیمت . . . . عہ

بصائر حضرت موسیٰ اور فرعون کے واقعات، زمانہ حاضرہ سے تطبیق طبع جدید جس میں بعض مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے قیمت ۶ر

اِن کتابوں کے علاوہ اُردو زبان کے تمام مشہور مصنفین مولانا شبلی، حالی، سرسید، مولوی نذیر احمد، اور زمانہ حال کے مصنفین مولانا سید سلیمان ندوی مولانا نیاز فتح پوری حضرت خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری وغیرہ وغیرہ کی جملہ تصنیفات اور مطبوعات انجمن ترقی اُردو و دار المصنفین وغیرہ ہمہ وقت موجود رہتی ہیں۔

منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ علی گڈھ سے

مفصل فہرست طلب کیجئے

فہرست مضامین

جلد ۳ | ماہ شوال و ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ مئی و جون سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۵ و ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

نمبر ۵ و ۶	ماہ شوال و ذیقعد سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق ماہ مئی و جون سنہ ۱۹۲۴ء	جلد سوم

سلاطین مغل کے عہد میں پولیس کا انتظام

از

مولوی ابوالجلال ندوی، رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

مغل بادشاہوں کے عہد کی تصویر یورپین مورخین جن الفاظ میں پیش کیا کرتے ہیں ان کا خلاصہ صرف یہ ہوتا ہے کہ انگریزوں سے پہلے ہندوستان میں کوئی متمدن حکومت نہ تھی - محمد شاہ رنگیلے کے عہد سے ملک میں جو بدانتظامیاں پیدا ہوئیں اُن میں محض ہندوستانی ہاتھ شامل نہ تھے اگر غور کیا جائے تو کچھ غیر ہندوستانی دماغ بھی تھے جو اس بدامنی کو بھڑکا رہے تھے - اس عہد میں حکومت کے تمام اختیارات خودسر نوابوں اور راجاؤں کے ہاتھ میں تھے، اگر خزاں سے بہارِ گلستان کا اندازہ لگایا جانا صحیح ہے تو لودی عہد“ یا طوائف الملوکی پر اکبر و عالمگیر کی حکومت کا قیاس کرنا

صحیح ہے، لیکن اگر بہار وخزاں کے نقشے الگ الگ ہوں تو اس عہد کی دشواریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے "شخصیت" پرستی کے علاوہ مغلوں کا نظام حکومت ملک کے لئے موجودہ حکومت کے اعتبار سے بُرا نہیں کچھ اچھا ہی تھا مگر افسوس یہ ہے کہ "قلم درکف دشمن است" ہمارے قدیم مورخین تو کسی کے طرز حکومت کی تفصیل کرنا فرض ہی نہیں سمجھتے حال کے یورپین مورخین کی تاریخیں ان کے سیاسی مقاصد کا پروپاگنڈا ہوتی ہیں جن کے اثر سے بہت کم دماغ محفوظ رہ سکتے ہیں ۔ ذیل کی سطور ہماری اس تمہید کی تفسیر کریں گی ۔

(مدیر)

پروفیسر جادو ناتھ سرکار فرماتے ہیں[۱]۔

"مغل گورنمنٹ رفتار زمانہ کے ساتھ وسعت اور ترقی کے قابل نہ تھی وہ بیرونی حملوں اور اندرونی بغاوتوں سے ملک کی رکھوالی کرتی تھی، شہروں میں اپنے عاملوں کے ذریعے سے لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرتی تھی مگر دیہات کے وسیع رقبہ کی امنیت اور پولیس کے فرائض خود مقامی آبادی کے سر ڈال دیئے گئے تھے یہ کام گاؤں کے چوکیدار انجام دیتے تھے جو نہ تو سرکاری ملازم تھے نہ سرکاری نگرانی میں تھے، خود گاؤں کے لوگ ان کے خرچ کے کفیل تھے، گورنمنٹ نے گاؤں کی حفاظت کے ساتھ پاس پڑوس کی سڑکوں سے گذرنے والے مسافروں کی امن و امان کی ذمہ داری کا بار بھی گاؤں ہی والوں پہ

(رفعود)

[۱] "مغل ایڈمنسٹریشن"، ص ۱۲

ڈال دیا تھا، البتہ ایک عہدہ فوجدار کا ہوتا تھا مگر اس کا حلقۂ
عمل اتنا وسیع ہوتا تھا کہ وہ تمام گاؤں کی پولیس کی نگرانی نہیں
کر سکتا تھا۔"

یہ وہ خیالات ہیں جن کی ہندوستان کے ایک مایہ ناز مورخ نے ادا کیا ہے، کیا ہم یوروپین مورخین کی تاثیر سے اب بھی انکار کر سکتے ہیں؟

مغل سلاطین کے عہد میں پولیس کے دو مستقل نظام تھے یعنی ڈسٹرکٹ پولیس، یا مسلح جرایم کے انسداد کرنے والا محکمہ جو محکمۂ "فوجداری" کے نام سے موسوم تھا۔ اور شہری پولیس کو "کوتوالی" کہا جاتا تھا۔

فرائض فوجدار | فوجدار کا کام بغاوتوں کی روک تھام، ڈاکوؤں کا استیصال، راہداری اور گذرگاہوں کا انتظام اور حسب ضرورت، زمینداروں، جاگیرداروں، اور عملگذاروں کو وصولی زر میں امداد دینا تھا۔ مسلح حملہ کرنے سے پہلے اکبری عہد کے قانون کے مطابق فوجدار کو "اعیان" یعنی جوار کے مشہور اور بڑے بڑے لوگوں سے "نوشتہ" یعنی تحریری اجازت نامہ لینا پڑتا تھا[1]۔ میرے ایک مورث اعلیٰ دیوان یعقوب خاں نے تعلقہ بہادر پور پرگنہ تھہو پور سرکار جونپور (حال تحصیل گھوسی ضلع اعظم گڈھ۔ یوپی) میں کچھ زمینداری خریدی، زمینداروں کو مسلح حفاظتی دستے ملازم رکھنے اور چھوٹے پیمانے کے قلعے یا کوٹیں بنانے تک کا رسمی قانون کے مطابق حق تھا۔ چنانچہ انہوں نے بہادر پور میں ایک کوٹ بنائی اس کے نشانات آج تک موجود ہیں، یہ زمانہ شاہجہاں کا تھا، پاس کے ایک مسلمان خاندان نے فوجدار کے پاس شکایت کی کہ یہ دیوان یعقوب خاں مشہور ڈاکو یعقوب خاں ہیں، فوجدار کو حملہ سے پہلے "نوشتہ" لینا ضروری تھا۔ اس لئے ایک محضر نامہ تیار ہوا جس میں دیوان یعقوب خاں کے خاندانی حالات کی تشریح کی گئی۔ جس سے الزام رفع ہو گیا[2]۔

---

[1] آئین اکبری، بیان فوجدار۔ [2] اصل نوشتہ موجود نہیں اس کی نقل میں نے دیکھی ہے۔

تقرر | بڑے بڑے فوجداروں کا تقرر فرمان شاہی کے ذریعہ سے ہوتا تھا[۱] خاص خاص مقامات کی فوجداری بعض اوقات "ضمیمہ نظامت" کر دی جاتی تھی، چنانچہ عالمگیر نے نواب جعفر خاں کی درخواست پر ہگلی کی فوجداری کو ضمیمہ خدمت نظامت و دیوانی کر دیا تھا[۲] "ضمیمہ خدمت" بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان مقامات کے فوجداروں کا عزل و نصب ناظم کے اختیار میں ہو جاتا تھا۔ بعض بعض فوجداروں کے نام کے ساتھ مختلف حلقوں کا ذکر ہوتا ہے چنانچہ عالمگیر کے زمانہ میں اللہ وردی خاں صوبہ دار الہ آباد پہلے اودھ اور گورکھ پور دو سرکاروں کے فوجدار تھے[۳]۔ نواب ابراہیم خاں کے زمانہ میں نور اللہ خاں جیسور، ہگلی، بردوان اور میدنی پور چار حلقوں کے فوجدار تھے[۴]۔ نواب شجاع الدین محمد خاں کے عہد میں سرفراز علیخاں کی نیابت میں مرزا محمد سعید گھوڑا گھاٹ، رنگپور اور کوچ بہار تین حلقوں کے فوجدار تھے[۵] اس سے یہ قیاس کرنا چاہئے کہ بعض "فوجدار نشین" مقامات خالی رہتے تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ان مقامات کی فوجداری ایک فوجدار کا "ضمیمہ خدمت" ہوتی تھی۔

رقبہ عمل | ہمارے مشرقی مورخین زیادہ تر صرف جنگ نامے لکھا کرتے ہیں اس لئے کتب تاریخ میں صرف ان فوجداروں کا نام مل سکتا ہے۔ جو یا تو کسی اہم جنگ میں نمایاں رہے ہوں یا کسی اہم موقع پر بادشاہوں نے ان کا تقرر کیا ہو۔ پروفیسر جادو ناتھ سرکار کو فوجداروں کے حلقۂ عمل کی وسعت کے متعلق شبہ ہوا۔ اس لئے کہ ان کو بہار اور بنگال میں صرف معدودے چند مقامات کے نام معلوم ہو سکے جن میں فوجدار رہا کرتے تھے۔ بنگال میں ان کو ہگلی۔ جیسور، چوہاٹی، سلہٹ، مدنی پور صرف فوجدار نشین مقامات کا علم ہو سکا ہے۔ بیربھوم، بردوان، پٹنہ، پورنیہ، اور ندیہ کے نام ان کو شاید خیال نہ رہے۔ کہ یہاں بھی فوجدار رہا کرتے تھے، تعجب ہے کہ چکلہ ونیاج پور کا نام بھی ذہن سے اتر گیا۔ حالانکہ یہ ہی وہ بدقسمت حلقہ تھا جہاں سے انگریزی اقتدار کی بنیاد پڑتی ہے۔ کس کو نہیں معلوم کہ انگریزوں کی پوزیشن ہندوستان میں پلاسی کی جنگ کے بعد سے مضبوط ہوتی ہے۔ جنگ پلاسی کی اصل وجہ نواب قاسم خاں کا یہ عمل تھا کہ اس نے

[۱] آئین اکبری [۲] ریاض السلاطین ص ۲۴۳ [۳] عالمگیر نامہ ص ۴۰۳ جلد ۱ [۴] ریاض السلاطین ص ۲۲۲ [۵] ریاض السلاطین ص ۲۹۳

دیگر تاجروں کی طرح انگریزوں سے بھی ٹیکس وصول کرنا چاہا انگریزوں نے شورش کرنی شروع کی نواب قاسم خاں نے فوجداروں کے نام حکم نافذ کیا کہ انگریزوں سے جبریہ طور پر ٹیکس وصول کیا جائے مگر ہندوستان کا پہلا نمکحرام صدرالحق خان فوجدار چکلہ دیناج پور تھا جس نے سرتابی کی اور انگریزوں کا ساتھ دیا۔

مورخین کبھی کبھی فوجدار کو ضابط یا ناظم مہام کے لفظ سے بھی تعبیر کرتے ہیں چنانچہ عالمگیر نامہ جلد ۱۰ میں عبد النبی خاں فوجدار چکلہ اٹاوہ کو ناظم مہام کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے،

اگر ہم ہر نام پر جس کے ساتھ، فوجدار، ناظم مہام یا ضابطہ کے الفاظ ملتے ہیں غور کریں تو فوجداروں کے حلقہ عمل کے قابل شکایت وسعت سے انکار کر دینا پڑے گا۔

کتب تاریخ میں اکثر ناموں کے ساتھ فوجدار سرکار اور اکثر کے ساتھ فوجدار چکلہ کے الفاظ ملتے ہیں اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مغل سلاطین کے عہد میں ہر سرکار اور ہر چکلہ میں فوجدار رہا کرتے تھے۔ کہیں کہیں ایک سرکار میں ایک سے زیادہ فوجدار بھی رہا کرتے تھے چنانچہ سرکار سالگاؤں (بنگال) میں ہگلی اور دیناج پور دو مقاموں کا "فوجدار نشین" ہونا یقینی ہے، سرکار اکبرآباد میں بیرون دارالخلافت حوالی شہر، چکلہ متھرا، اور چکلہ اٹاوہ چند مقامات پر فوجداروں کے وجود کا ثبوت نہ مل سکے تو اس سے ان کے حلقہ عمل کی وسعت کا فیصلہ کرنا ضروری نہیں کیونکہ ہمارے مورخین نے نظام حکومت کی تشریح کو اپنا فرض ہی نہ سمجھا، کون جانتا تھا کہ ایک دن ہمارے روزمرہ کے کام بھی معرض بحث میں آجائیں گے۔ دیوان میٹھا لال کی مرأت احمدی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد آباد (گجرات) کے تقریباً ہر پرگنہ میں ایک فوجدار رہا کرتا تھا۔

پرگنہ حویلی کا فوجدار مقام کرؤ میں رہتا تھا پرگنہ ار ہر ما تہر میں ۹ تھانے ماتحت فوجداری تھے اور ۱۰ مقام کے تھانہ دار ناظم و دیوان کی تجویز کے مطابق حضور سے متعین ہوتے تھے پرگنہ اعظم آباد کے ۱۲ موضع جن کی جمعدامی ۱۵۶۱۰۰۰ دام یا ۳۹۰۲۵ روپیہ تھی مشروط فوجداری تھے۔ پرگنہ ایڈر میں وہاں کا قلعہ دار ہی فوجدار ہوا کرتا تھا ۴۰۰ سوار اور ۷۰ موضع جن کی جمعدامی ۱۲۰۰۰۰۰ دام یا

..... ۳ روپیہ تھی فوجداری و قلعہ داری کے لئے مقرر تھے۔ پرگنہ احمد نگر کے فوجدار کے لئے ، ۴ موضع مقرر رہتے جن کی جمعدامی ۹۰۰۰۲۰۰۰ دام تھی ، پرگنہ بھیل میں پہلے مستقل فوجدار رہتا تھا یہاں ایک " فوجدارنشین قلعچہ تھا جو تباہ ہوگیا۔ لیکن بعد کو یہاں کی فوجداری ضمیمہ فوجداری اعظم آباد ہوگئی پرگنہ بارہ سینورس فوجدار کے ماتحت ۱۰۰ سوار تھے ، عالمگیر نے یہاں ایک مستحکم فوجدارنشین قلعچہ بنایا تھا۔ پرگنہ پانچ میں ایک احاطہ فوجدارنشین تھا ، اسی طرح ، بیرم گاؤں ، پیپلو ، تھامنہ۔ بیرپور۔ چوراسی بند۔ رکھنبایت ، ہر پرگنہ میں کم از کم ایک فوجدار رہا کرتا تھا۔ بعض بعض پرگنوں کے فوجداروں کے ماتحت کئی ایک فوجداریاں ہوتی تھیں چنانچہ فوجدار کردکے ماتحت بارہ حاجی پور بارہ فیروز پور ، اور دیگر ، اناکوں کا فوجدار تھا۔

اگر احمد آباد کی طرح ہم کو ہر سرکار کی تفصیلی حالات معلوم ہوسکتے تو ہمکو قیاس سے کام لینا نہ ہوتا۔ اور تاریخوں کے استناد کے ساتھ ہم کہدیتے کہ مغلوں کے زمانہ میں ہر پرگنہ میں ایک نہ ایک فوجدار رہا کرتا تھا۔

تاریخوں میں تو ہم کو صرف ایسے فوجداروں کا نام ملتا ہے ، جو بہت بڑے منصب دار تھے۔ فوجداری سے ترقی کرکے ناظم صوبہ ہوجاتے تھے یا دو اور دو سے زائد سرکاروں کی فوجداری ان کا ضمیمہ خدمت ہوتی تھی۔ لیکن ان فوجداروں کے ماتحت بھی کچھ فوجدار ہوتے جو اپنے مستقر کے فوجدار کہے جاتے تھے ، ناظم کے ماتحت صوبہ چند بڑے بڑے حلقوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ ہر حلقہ میں ایک فوجدار ہوتا تھا ، پھر ہر سرکار ، ہر چکلہ ، اور ہر پرگنہ میں سرکاری فوجدار رہا کرتے تھے کیا اس کے بعد بھی یہ قیاس قابل تسلیم ہوسکتا ہے کہ

" فوجدار کا حلقہ عمل اتنا وسیع ہوتا تھا کہ تمام گاؤں کی پولیس کی نگرانی نہیں کرسکتا تھا"

علاوہ بریں ہر فوجدار کے ماتحت کچھ تھانے ہوتے تھے۔ تھانے سے مراد سوار، پیادہ، تفنگچی اور کمانڈار وغیرہ مسلح پولیس کا ایک مختصر دستہ ہے۔ جو چوروں اور ڈاکوؤں کی تادیب کے لئے خطرہ کے مقامات پر متعین رہا کرتے تھے صرف فوجدار گردکے ماتحت ۲۳ تھانے اور ایک ایک کوس کے فاصلہ پر تھے[1]۔ اِن تھانہ داروں کا تقرر عموماً فوجداروں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اس عہد کے تھانہ دار برٹش انڈیا کے تھانہ داروں سے کچھ ہی کم ہوتے تھے۔ مگر بادشاہ، ناظم اور بالادست فوجداروں کے جاسوس، خفیہ نویس، گوئندے اور واقعہ نویس کے ذریعہ سے حکام کو رتی رتی خبر پہونچتی تھی۔ کیونکہ مغل بادشاہوں کا عموماً اور عالمگیر کا خصوصاً یہ حکم تھا کہ۔

آنہاے جنس واقعہ نگار و خویش ویا ور دیوان

راعامل و فوجدار نباید کرد (دستور العمل آگہی)

انیسویں صدی مسیحی کی تعلیم یافتہ پولیس کی نگرانی، دنیا کی بڑی سے بڑی اور ہوشیار سے ہوشیار حکومت جس قدر کرسکتی ہے ہندوستانیوں سے مخفی نہیں۔ آج پولیس کے مظالم کی خبر وزیر پولیس تو کیا ضلع کے افسروں تک نہیں پہونچ سکتی، لیکن مغلوں کے ذرائع واقفیت موجودہ تمدن کی آسانیوں سے محرومی کے بعد بھی اس قدر مکمل تھے کہ گجرات کے بعض تھانہ داروں نے کچھ مظالم کئے، جس کی خبر عالمگیر کو بہت آسانی کے ساتھ ہوگئی تو اس نے اپنے فرزند عالیجاہ معظم شاہ کو لکھا۔

امان اللہ بیگ ولد وضع تونچانہ و دیوان خانہ را فوجدار

نواح متقرر کردہ اند و اوتھانجات بخویشان خانہ مردار

خوار سپردہ .... فوجداری بیکے

از گجراتیان مثل صفدر خان و پسران بہلول شیروانی باید داد

---

[1] مراۃ احمدی ص۱۴۲ و ص۱۱۵ ملخصاً

کیا اس سے اندازہ نہیں ہوسکتا کہ مغل گورنمنٹ ہر گاؤں کی پولیس پر کافی نگرانی رکھتی تھی۔
پاس پڑوس کی سڑکوں سے گذرنے والے مسافروں کے امن و امان کی ذمہ داری صرف گاؤں والوں کے سر نہ تھی بلکہ وہ تو صرف شریک ذمہ داری ہوتے تھے، ورنہ راہداروں اور گذربانوں کا انتظام عام تھا۔ ہر چلتی سڑک پر کچھ فاصلے اور چوکیاں تھیں فوجداروں کی نگرانی میں ہر مرحلہ پر کچھ راہدار رہتے تھے۔ ان راہداروں کا اصلی کام یہ تھا کہ تاجروں اور ڈاک کے ہرکاروں کو اپنے مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک پہنچا کر وہاں کے مرحلہ دار کے سپرد کردیں، عام مسافروں کی حفاظت اور امنیت بھی راہداروں کا فرض تھا۔ کوئی مسافر بغیر پروانہ راہداری کے کہیں کا سفر نہیں کرسکتا۔ پروانہ راہداری کوتوال یا اس کے قایم عامل دیتے تھے سلاطین کی طرف سے کبھی راہداری کا محصول مقرر نہیں تھا۔ البتہ بعض بعض مقامات کے باختیار حکام اور صوبیدار کچھ فیصدی تاجروں سے محصول راہداری وصول کرتے تھے اور اسے حق الخدمت سمجھتے تھے مگر شاہان دہلی کو جب خبر ہوتی تو عموماً محصول راہداری کی معافی کا حکم نافذ کیا کرتے تھے۔ اعظم شاہ کو ایک خط میں عالمگیر لکھتا ہے کہ۔

> "با فضل خان بگوئید کہ پانزدہ ہزار روپیہ ہر سال از راہداری پرگنہ ۔ بوئی می آید ۔ در اصل مال عوام محض حرام است اگر صد و پنج یا پنجاہ و یک گرفتہ اند مضایقہ ندارد ۔ ایں راہداری نیست ۔ راہ زنی است ۔ طرفہ اینکہ امین و فوجدار زیادہ از دو ہزار روپیہ اخذ نمیکنند بلایں تقدیر خیانت امین ظاہر میشود بنا براں در باب تحقیقات فرمان بنام صوبہ منفر لیسم بعد اثبات تنبیہ خواہد شد۔"

عالمگیر کے اس خط سے اندازہ ہوسکتا ہے، کہ مغل سلاطین کس قدر جزئی جزئی باتوں کی خبر رکھتے تھے اور ان کا انتظام راہداری کس قدر مکمل تھا۔ میرے خیال میں پاس پڑوس کی سڑکوں کی ذمہ داری تنہا گاؤں والوں پر ڈالدینے کا الزام بہت حد تک صحیح نہیں ہے بے شک آس پاس کی سڑکوں سے چلنے والے مسافروں کے جان و مال کی ذمہ داری میں مقامی لوگوں کو بھی شریک کرلیا گیا تھا جسکی وجہ یہ ہے کہ مغلوں کا ہندوستان آج جیسا بے دست و پا اور خالی ہاتھ نہ تھا ہندوستان میں "خالصہ شریفہ" علاقوں کے علاوہ، مرزبانوں کی ریاستیں اور زمینداریاں اور تیولداروں کی جاگیریں اور بڑے بڑے ایمہ داروں کی معافیاں ایک طرح کی نیم آزاد ریاستیں تھیں، زمیندار اپنے علاقہ میں قلعے رکھتے تھے، فوجیں ملازم رکھسکتے تھے، عموماً صاحب منصب ہونے کی صورت میں کچھ فوج رکھنا بادشاہوں کی طرف سے ان پر ضروری ہوتا تھا، اپنے علاقہ کے بازاروں کا انتظام، اور کلہم ضروری امور وہ اپنی آزاد مرضی کے

مطابق انجام دیتے تھے جب تک وہ نذر و پیشکش[1] ادا کرتے رہتے تھے اور بغاوت یا لوٹ مار وغیرہ مسلح جرائم کے مرتکب نہ ہوا کرتے گورنمنٹ ان کی سیاسی آزادی میں بھی مانع نہیں ہوتی تھی۔ زمیندار تو زمیندار معمولی درجہ کے بیوپاریوں اور تجارت پیشہ لوگوں تک کو بھی حق تھا کہ وہ اپنے لئے مسلح گماشتوں کے دستہ نوکر رکھیں یہی وہ رواجی قانون تھا جس نے برطانیہ کی ایک تاجر جماعت کو ایک فوجی طاقت اور بالآخر ہندوستان کا آقا بن بیٹھنے کا منحوس موقع دیا۔ یہ زمیندار اور مرزبان عموماً شیر شاہ کی طرح یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ

ملک نہ گیرد بتدبیر کسے تا نزند شمشیر رودستی بسے

ایسی صورت میں مقامی آبادی کو آس پاس کے امن و امان کی ذمہ داری میں شریک کرنا خلاف انصاف نہ تھا خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ فوجدار کو آئینی حیثیت سے کسی جماعت پر اس وقت تک حملہ کرنے کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ جب تک "اعیان" نوشتہ نہ دیدیں۔ اس لئے آس پاس کے لوگوں کا فرض تھا کہ اصل ملزم کا پتہ چلانے میں گورنمنٹ کے عاملوں کو مدد دیں ورنہ وہ بھی شریک جرم سمجھے جاتے تھے۔

کوتوالی | شہری پولیس یا کوتوالی کا انتظام صرف بڑے بڑے شہروں تک محدود نہ تھا البتہ مرزبان اور جاگیردار اپنی سول پولیس یا چوکی اور پہرہ کا انتظام چوکیدار وں کے ذریعہ سے خود کرتے تھے کیونکہ یہ لوگ اپنے علاقہ میں ایک درجہ کے نیم خود مختار راجہ یا نواب ہوتے تھے۔ "خالصہ شریفہ" کے تقریباً بڑے شہر، قصبہ، اور گاؤں میں کوتوال ہوا کرتا تھا؛ چنانچہ اکبر نے کوتوال کا جو آئین[2] مقرر کیا تھا اس کی عبارت کا پہلا فقرہ یہ تھا۔

باید کہ کوتوال ہر شہر و قصبہ و دِہ ساختہ الخ

اس سے معلوم ہوا کہ کم از کم بڑے گاؤں، قصبہ اور شہر میں جو خالصے تھے، سلاطین کی طرف سے کوتوال کا تقرر ہوا کرتا تھا جن مقامات پر کوتوال یا بادشاہی شحنہ نہ ہوتا وہاں کی کوتوالی کے فرائض مقامی عامل حکومت کا ضمیمہ خدمت ہوجاتے تھے؛ ہر عامل کا حکم تھا!

اگرجاگو توال نباشد فصول قانون اور اگاہ داشتہ رواج دہد

کوتوال کا کام محض چوکی پہرہ کی نگرانی نہ تھی، بلکہ وہ "چبوترہ" کا مہتمم بھی ہوتا تھا، اس

[1] نذر و پیشکش کو ہمارے متعصب فرنگی مآب مورخین "رشوت" بتاتے ہیں حالانکہ یہ الفاظ صرف مالگذاری کے مہذب نام ہیں، [2] آئین اکبری۔ مرآۃ احمدی۔ ابوالفضل۔

لئے ضروری تھا کہ بازار میں کوئی عامل کوتوالی مقرر ہو۔ چبوترہ سے مراد وہ مقام ہے جہاں تاجروں کو آکر جمع ہونا اور چنگی دینا ہوتا تھا، کوتوال کے متعلق دلالی کا انتظام بھی تھا، دلالی سے مراد یہ ہے کہ ہر بازار میں کوتوال کچھ تجربہ کار تجارت پیشہ لوگوں کو بازار کا نگران کار مقرر کرتا تھا، دلال کا لفظی ترجمہ ہے "ٹھیک ٹھیک بتانے والا" اس کا کام یہ تھا کہ ہر چیز کا صحیح بھاؤ معلوم رکھے بازار میں گراں فروشی نہ ہونے دے اور نہ فریب و دغا ہوسکے، دلال کے فرائض میں یہ بھی تھا کہ پاس پڑوس کے صناع اپنی بنائی ہوئی چیز بازار میں لاتے تھے اور ان کو خود بیچنے کا موقع نہ ہوتا، یا کسی دوکاندار کے ہاتھ بیچ نہ سکے ہوں تو اگر وہ مناسب سمجھتے اپنی چیزوں کو چبوترۂ کوتوالی پر دلالوں کی نگرانی میں بھیج دیتے، دلال ان کی مصنوعات کو بازار میں بیچ کر ان کو قیمت ادا کردیتے تھے۔ اکثر جگہ اب بھی اس قسم کی دلالی کا رواج ہے مگر یہ دلال سرکار سے تعلق نہیں رکھتے بادشاہوں کا منشا یہ تھا کہ یہ کام بے اجرت انجام دیا جائے، مگر اکثر دلال اس کام کے لئے کچھ اجرت، یا رسوم دلالی "وصول کرتے تھے، اور ناظموں اور صوبہ داروں کو بہت کم اس پر اعتراض ہوتا، لیکن سلاطین کی طرف سے عموماً محصول دلالی کی معافی کا فرمان نافذ ہوا کرتا تھا، عالمگیر نے محصول دلالی کی سخت مخالفت کی گجرات کے دلالوں کے متعلق معلوم ہوا کہ انھوں نے رسوم دلالی جمع کیا ہے، تو نصف آمدنی بحق سرکار ضبط کرلینے کا حکم نافذ کیا تھا۔[1] کوتوالوں کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ

بیکاراں را بہ ہنرمندی برنشاند (آئین اکبری)

ان کاموں کو انجام دینا محض کوتوال کے ذمہ نہ تھا۔ بلکہ اس شہر اور قصبہ کے عام باشندے مشترکہ فرائض کوتوال کی ذمہ داری میں شریک تھے، کوتوال کے لئے یہ مقررہ آئین تھا کہ ہر اپنے مستقر کے شہر کو چند محلوں میں تقسیم کرکے ہر محلہ میں ایک میر محلہ اور خبردار کا انتخاب کرے، میر محلہ کی حیثیت ایک مشیر کی ہوتی تھی کیونکہ کوتوال کو حکم تھا کہ

---

[1] مرآۃ احمدی

تینک و بد آن محله بصوابدید او شود "

کوتوالی کا انتظام صرف خالصہ شریفہ، علاقوں میں تھا غیر خالصہ علاقوں کے مرزبان اور جاگیردار اپنی مقامی پولیس یا پہرہ چوکی کا انتظام خود کرتے تھے۔

کوتوال میر آتش کے رسالہ کا ایک سوار اور اسی کی سند مہری کے ذریعہ سے بادشاہ اور ناظم کی طرف سے مقرر ہوتا تھا۔ چنانچہ دیوان سیٹھا لال احمد آباد کے کوتوال کے متعلق لکھتے ہیں۔

کوتوال برسالہ میر آتش و سند مہری او
مقرر میشود .... و اکثر تا عہد
حضرت خلد مکان کوتوال از حضور تعین یافت
و بعضے اوقات از جانب ناظم

احمد آباد کے کوتوال کی ماہوار تنخواہ ۱۱۳ روپیہ تھی کوتوال کے لئے کبھی کبھی شحنہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے غالباً گاؤں کی ہر بڑی بوڑھی عورت کو جس نے غدر سے پہلے کے واقعات اپنے بچپن میں سنے تھے شحنوں کے مختلف قصے یاد ہوں گے۔

مختصر یہ کہ مغلوں کے عہد میں پولیس کا نظام بہت برا نہ تھا۔ یہ ضرور تھا کہ ہر گاؤں میں کوتوال یا شحنہ نہیں ہوتا تھا، لیکن فوجدار، تھانہ دار، مرحلہ دار، گذربان، راہ دار، اور چوکیدار، وغیرہ الفاظ جو مغلوں کی تاریخی یادگار ہیں، جو اب بھی گاؤں کے لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں مغلوں کی بد انتظامی پر مبسوط سے مبسوط کتاب کا مناسب ردپیش کر سکتے ہیں۔

آئین اکبری اٹھا کر دیکھو ہر پرگنہ یا محال میں کچھ پیادے اور سواروں کی تعداد ملیگی، کیا یہ پیادے اور سوار امن و انتظام کے ذمہ دار نہ تھے؟ وہ صرف لوٹ مار کے لئے نوکر تھے؟

ابو الجلال ندوی

مبادی سیاسیات

سلطنتوں کی تقسیم

(۱) ارسطو کی تقسیم | علم سیاست کا موضوع سلطنت[1] کا مطالعہ ہے۔ لیکن دنیا میں لاتعداد سلطنتیں گذری ہیں اور ہر سلطنت کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے اس لئے

---

[1] ذیل میں سلطنت کی کچھ تعریفیں نقل کی جاتی ہیں:۔

(۱) "سلطنت آزاد لوگوں کے اس مجموعہ کو کہتے ہیں جو مشترکہ فائدہ کے حصول کے لئے آپس میں متحد ہوں تاکہ اپنے حقوق سے بہ طمانیت خاطر لطف اندوز ہوں اور دوسروں کے حق میں انصاف کریں"۔ عدالت عالیہ ریاستہائے متحدہ امریکہ

(۲) "سلطنت سوسائٹی کی جبری قوت کے نفاذ کا نام ہے جو مقررہ طور پر اور یقینی صورت میں ہو"۔ مسٹر جھیرنگ

(۳) "سلطنت ایک ملک کے لوگوں کی ترتیب یا فتہ سیاسی شخصیت کو کہتے ہیں"۔ بلنٹشلی

(۴) "سلطنت ان اشخاص کو کہتے ہیں جو قانون کے لئے ایک مخصوص حصہ زمین پر منتظم ہوئے ہوں"۔ مسٹر ڈرووکس

(۵) "سلطنت لوگوں کے ایک بہت ہی بڑے اجتماع کا نام ہے جو کسی مخصوص حصہ زمین کے مالک ہوں اور جن میں کثرت یا قابل تعین گروہ کی رائے اکثریت کے باعث اپنی جماعت کے مخالفوں پر غالب آئے"۔ ہالینڈ

ان تعریفوں کی تشریح آگے چلکر معلوم ہوجائے گی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سلطنتوں کو اس طرح تقسیم کریں کہ ہر ایک قسم کی خصوصیات فرداً فرداً نمایاں ہو جائیں۔ کیونکہ ہر نوع کی جو خصوصیت ہوگی وہ ہی خصوصیت اس نوع میں ہر سلطنت کی ہوگی۔ تمام علوم میں اسی قاعدہ پر عمل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک علم حیات کا ماہر ہر ایک پودے اور حیوان کا مطالعہ نہیں کرتا بلکہ ان کو انواع و اجناس میں تقسیم کرلیتا ہے۔ جیسے نیم، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ۔ ہر بات جو کسی نوع یا جنس پر صادق آتی ہے وہ اس جنس کے ہر پودے اور ہر حیوان کے لئے صحیح ہوگی۔

آجتک سلطنتوں کی جتنی تقسیمیں کی گئی ہیں ان میں ارسطو کی تقسیم سب سے مشہور ہے وہ سلطنتوں کو دو اصولوں پر تقسیم کرتا ہے۔ اول یہ کہ حکمرانوں کی تعداد کیا ہے۔ اس صورت میں صرف تین صورتیں ممکن ہیں۔ حکمران سلطنت میں ایک یا چند یا بہت سے ہوں دوئم یہ کہ حکومت کا مقصد کیا ہے؟ حکومت کے مدنظر سلطنت کے ہر شخص کی بہتری ہے یا حکمرانوں کی محض ذاتی منفعت۔ ارسطو کا خیال تھا کہ پہلی صورت میں سلطنت مفید یا "طبیعی" ہوگی بصورت دیگر مضرت رساں یا "منحرف"۔ حکمرانوں کی تعداد اور مقصد حکومت ان دو اصولوں کو یکجا کرنے سے ذیل کا نقشہ مرتب ہوتا ہے

حکمرانوں کی تعداد	مقصد حکومت	
	طبیعی	منحرف
ایک	ملوکیت	فرعونیت
چند	امرائیت	استبدائیت
بہت (کثرت)	آئینیت	عمومیت

* آجکل عمومیت کے معنی بالکل اس کے برعکس ہیں جو ارسطو کے ذہن میں تھے۔ عمومیت سے اس کی مراد مفسدوں کی حکومت۔ بلوہ یا اور اس قسم کے تکلیف دہ واقعات تھے عمومیت کے

بالفاظ دیگر ایسی حکومت جس کا مقصد عوام کا فائدہ ہو اگر ایک شخص کی ہے تو اس کو ملوکیت کہتے ہیں یا اگر چند لوگوں کے اختیار میں ہے تو اس کو امرائیت کہتے ہیں اسی طرح آئینت وہ حکومت ہوگی جو کثرت کے ہاتھ میں ہو۔ ارسطو نے ان تمام قسموں کو پسندیدہ، مفید، اور "طبیعی" بتایا ہے۔ ان کے مقابلہ میں سلطنت کی اور قسمیں مضر یا "منحرف" ہیں مثلاً فرعونیت استبدادیت اور عمومیت جن پر بالترتیب ایک یا چند یا اکثر حکمران ہوں اور با اختیار اشخاص کا مقصد سلطنت کے عام فائدہ کو نظر انداز کر کے محض ذاتی مفاد حاصل کرنا ہو۔

(۲) متاخرین کی تقسیم | زمانہ حال کی سلطنتوں کے لئے ارسطو کی تقسیم ناکافی ہے۔ مثلاً انگلستان جیسے ملک میں محض بادشاہ کو دیکھ کر ہم وہاں کی حکومت کو ملوکیت کہہ سکتے ہیں اور اگر غور کریں کہ دارالعوام کو اختیار اعلیٰ ہے تو حکومت امرائیت معلوم ہونے لگے گی اسی طرح ہم اس حکومت کو عمومیت بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ممبروں کا انتخاب انگلستان کے ان مردوں اور عورتوں کی کثرت رائے سے ہوتا ہے جو قانونی شرائط اور عمر کی قید کو پورا کرتے ہوں لہذا ایک ایسی تقسیم جس سے ہم انگلستان کو "طبیعی" سلطنت کی تینوں قسموں میں شمار کر سکیں تقریباً بیکار ہے۔ افسوس ہے کہ متاخرین انیک سلطنتوں کی خاطر خواہ تقسیم نہ کر سکے تاہم ذیل کی تقسیم و تخصیص موجودہ یورپ کی سلطنتوں کے مطالع میں کارآمد ثابت ہوگی؟

(الف) شہری سلطنتیں اور ملکی سلطنتیں۔ سلطنتوں کی ایک مشہور تقسیم ان کی وسعت کے

موجودہ معنی ارسطو کی آئینت یا حکومت عوام کے مرادت ہیں یعنی ایک ایسی سلطنت جس میں رائے عامہ سب پر فوقیت رکھتی ہے اور جس کے پیش نظر عوام کی فلاح ہو وقارونیت، سرمایہ داروں کی حکومت کا نام ہے۔ اور مولویت، ملاؤں کی حکومت کو کہتے ہیں۔

لحاظ سے کی گئی ہے۔ شہری سلطنت صرف ایک شہر اور اس کے اطراف تھوڑے سے حصہ زمین پر ہوتی ہے۔ ملکی سلطنت ایک پورے ملک کی حکومت کو کہتے ہیں۔ شہری سلطنت کا نظام ملکی سلطنت سے زیادہ سلجھا ہوا ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم کی شہری سلطنتوں ہی میں تہذیب اور جمہوریت کی ابتدا ہوئی اور ان کے ارادتاً متحد ہوجانے یا ایک دوسرے پر فتح حاصل کرنے سے ملکی سلطنتیں بن گئیں۔ زمانہ حال کی تمام سلطنتیں ملکی ہیں مگر شہری سلطنتوں کی مثالیں مشرق و مغرب کی تاریخ میں بہت سی ملتی ہیں۔ سلطان محمود کی تخت نشینی سے پہلے غزنی اور رسول عربی کے زمانہ میں مدینہ شہری سلطنت تھے۔ روم اور ایتھنس اپنی ابتدائی تاریخ میں شہری سلطنت کی بہترین مثالیں ہیں۔ زمانہ قدیم کی شہری سلطنت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے نظام حکومت کی سادگی باخبر رائے عامہ کے پیدا ہونے اور نو یافتہ اور جان بخش عمومیت کے ترقی پانے میں مدد دیتی تھی جس کے لئے آج کل کی بڑی بڑی سلطنتیں باوجود صحافت اور خطابت کے قاصر ہیں۔ لیکن فوجی نقطۂ نظر سے شہری سلطنتیں بڑی سلطنتوں کے مقابلہ میں بے بس ثابت ہوئیں اور یکے بعد دیگرے پامال ہوگئیں۔ شہری سلطنت کی حریت اور ملکی سلطنت کی قوت کو کسی انتشاری طریقہ پر متحد کرنا زمانۂ حال کا بہت ہی ضروری اور اہم مسئلہ ہے۔

(ب) وحدتیہ اور وفاقیہ سلطنتیں۔ وحدیہ سلطنت وہ ہے جس میں مرکزی حکام کو ہر معاملہ میں اختیار اعلیٰ ہو۔ وفاقیہ سلطنت مختلف سلطنتوں کے اس مجموعہ کا نام ہے جو اتحاد کے ساتھ ساتھ اختیارات اعلیٰ کا کچھ حصہ تو اپنے پاس رکھتی ہوں اور بقیہ حکومت اتحاد کے سپرد کردیتی ہوں۔ حکومت وفاقیہ تحفظ باہمی کے لئے اُن مختلف اقوام کو متحد کردیتی ہے جو بصورت دیگر ایک دوسرے سے الگ رہتیں۔ کئی طرح کی وفاقیہ حکومتیں زمانہ ماضی میں گذری ہیں۔ قرون وسطیٰ کے ابتدا میں راجپوتانہ کی سلطنتوں میں ایک سطحی وفاقیت پائی جاتی تھی جن کا سردار رانا چتور تھا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال پر مرہٹہ

نے جس حکومت کی بنیاد ڈالی وہ بھی وفاقیہ تھی۔ انگلستان اور فرانس موجودہ وحدیہ حکومت کی عمدہ مثالیں ہیں۔ دونوں ملکوں میں مرکزی حکومت (انگلستان میں پارلیمنٹ اور فرانس میں مجلس ملیہ) ہر معاملہ میں اختیار اعلیٰ رکھتی ہے۔ حکومت وفاقیہ کی بہترین مثال ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے۔ وہاں کے دستور کے موافق چند متعینہ اختیارات حکومت اتحاد کو دیدئے گئے ہیں۔ حکومت اتحاد صدر، کانگریس اور عدالت عالیہ پر مشتمل ہے۔ وہ اختیارات جو حکومت اتحاد کو نہیں دئے گئے ان ریاستوں کے پاس ہیں جو جنگ حریت امریکہ کے بعد آپس میں ملکر ایک قوم ہوگئیں۔ حکومت اتحاد ریاستوں کے ان معاملات میں دخل نہیں دےسکتی جو ان پر چھوڑ دئے گئے ہیں۔ اور نہ ریاستیں فوج، بحری بیڑے یا اور اس قسم کے ان معاملات میں مداخلت کر سکتی ہیں جو دستور نے حکومت اتحاد کے سپرد کر دئے ہیں آج کل کے سیاسی خیالات کا رجحان وفاقیت کی جانب ہے۔

(ج) دستوری سلطنتیں اور غیر دستوری سلطنتیں۔ بعض سلطنتوں میں رائے عامہ قطعیاً اعلیٰ رکھتی ہے اور حکومت ان قوانین کے ذریعہ سے کی جاتی ہے جن کو عوام کے نمائندوں نے بنایا ہو۔ ایسی سلطنت کو دستوری کہتے ہیں۔ دستور اُن اساسی قوانین کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ جن کی رُو سے حکومت کا عملدرآمد ہو۔ اکثر دستور ایک مکتوبہ دستاویز کی صورت میں ہوتے ہیں۔ مگر بعض ممالک مثلاً انگلستان وغیرہ میں دستور کا بیشتر حصہ غیر مکتوبہ ہوتا ہے۔ حکومت غیر دستوری رائے عامہ کے مطابق نہیں کی جاتی۔ اس کا دارمدار ایک یا چند مستبدین کی مرضی پر ہوتا ہے۔ سیاسی امور میں عوام کا نہ کوئی دخل ہوتا ہے اور نہ وہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ موجودہ ترقی پذیر اقوام میں کسی نہ کسی طرح کی دستوری حکومت ضرور پائی جاتی ہے۔

(د) عسیر الترمیم سلطنتیں۔ پروفیسر اے۔ وی۔ ڈائسی نے دستوری قوانین کی اس طرح تعریف کی ہے کہ "وہ تمام قوانین جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اختیارات اعلیٰ کے

نفاذ یا اون کی تقسیم پر اثر ڈالتے ہیں دستوری قوانین کہلاتے ہیں، مثلاً پارلیمنٹ کے انعقاد یا دارالعلوم یا دار الامرا سکے اختیارات کے متعلق قوانین۔ بقیہ قوانین "معمولی قوانین" کہلاتے ہیں جیسے قانون وراثت یا قانون تعزیرات۔ دستور لیسیر الترمیم اس وقت کہلائے گا جبکہ "معمولی قوانین" کے نافذ کرنے والی جماعت دستوری قوانین بنانے اور ان میں رد وبدل کرنے کی بھی مجاز ہو مثلاً انگلستان میں جس کا دستور لیسیر الترمیم ہے پارلیمنٹ معمولی اور دستوری دونوں قوانین وضع کرسکتی ہے۔ زمانہ حال کی اکثر سلطنتوں کا دستور عسیر الترمیم ہے۔ مجلس واضع قوانین معمولی قوانین بنا سکتی ہے لیکن دستوری قوانین بہت ہی پیچیدہ طور پر وضع ہوتے ہیں جس کا رواج ہر ملک میں جدا گانہ ہے۔ فرانس میں معمولی قوانین بنانے کے لئے مسودہ قانون کو دارالنائبین اور سینٹ (مجلس شیوخ) کی علیحدہ علیحدہ منظوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ دستور میں ترمیم کرنے کے لئے اول تو دونو مجالس کو کثرت مطلق* سے یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ دستور میں ترمیم کی ضرورت ہے اس کے بعد دونوں مجالس کے ممبران پیرس کی بجائے ورسائی میں کہیں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، اور اس مجموعی ہئیت کا نام مجلس ملیہ ہوتا ہے۔ دستور میں ترمیم صرف اس وقت ممکن ہے کہ مجلس ملیہ کثرت مطلق سے ترمیم پر اتفاق کرے۔ سوئٹزرلینڈ میں دستور اسی وقت ترمیم ہو سکتا ہے کہ جملہ اہالیان جمہوریت ایک عام جلسہ پر سے مراجعہ کہتے ہیں جمع ہو کر کثرت رائے سے ترمیم کی تائید کریں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دستور تبدیل کرنے کا طریقہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ جو آیندہ بیان کیا جائے گا۔

---

* اگر کسی مجلس کے کل ارکان کی تعداد میں سے نصف سے زاید ایک جانب رائے دیں تو فیصلہ "کثرت مطلق" سے ہوگا۔

(۲) سلطنت کی ابتدا

نظریہ عقد اجتماعی

(۱) نظریہ قوت۔ کہا جاتا ہے کہ سلطنت کی ابتدا قوت سے ہوئی اور سب سے زیادہ طاقتور کو حکومت کا حق حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطنت ایک تنظیم یافتہ قوت کو کہتے ہیں اور حکومتوں کی نشو ونما کا ایک پہلو غارتگری اور ملک گیری بھی ہے۔ بایں ہمہ محض قوت ہی سے بنائے سلطنت کی تشریح نہیں ہوسکتی۔ ڈیوڈ ہوم کے قول کے مطابق "قوت ہمیشہ رعایا کے پاس ہوتی ہے اور حکمرانوں کے پاس ان کی امداد کے لئے سوائے رائے عامہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔" قوت کبھی نہ کبھی رائے عامہ کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ ہر زمانے میں حکومت کا انحصار بالآخر رائے عامہ پر رہا ہے۔

۲۔ نظریہ الہیت شاہی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ خدائے بزرگ و برتر نے خلافت ارضی حضرت آدم علیہ السلام کے سپرد کی تھی اوران کے بعد یہ اختیارات شاہان یورپ تک سلسلہ بہ سلسلہ چلے آئے۔ اس خیال کے مطابق شاہان یورپ رعایا کے بجائے خدا کے سامنے اپنے افعال کے جوابدہ ہیں۔ اس نظریہ کو سترہویں صدی میں خاص مقبولیت حاصل تھی اب یہ غلط ثابت ہوچکا ہے اور کسی تردید کا محتاج نہیں۔

(۳) نظریۂ عقد اجتماعی یہ نظریہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں بہت مقبول تھا۔ اس کی رو سے انسان سب سے پہلے "حالت فطری" میں تصور کیا جاتا تھا جس میں نہ کوئی حکومت تھی اور نہ کوئی قانون۔ ہر شخص جو اس کا جی چاہتا کرتا۔ اس حالت کو ناقابل برداشت پاکر لوگوں نے "مدنی جماعت" قایم کرنے کے لئے ایک باہمی معاہدہ یا اقرارنامہ کرلیا۔ یہ 'مدنی جماعت' ایک ایسے فرمانروا کے تحت میں قایم کی گئی جو ہر شخص کو حق تلفی سے بچاسکے 'حالت فطری' میں انسان کو ہر چیز کا اختیار تھا۔

'مدنی جماعت' میں کچھ حقوق تو فرمانروا کو دیدے گئے اور بقیہ حقوق جو 'فطری' یا غیر منقولہ تھے رعایا کے پاس بدستور رہے مثلاً آزادی ضمیر وغیرہ۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ فرمانروا رعایا کے 'فطری حقوق' کو جائز طور سے پامال نہیں کرسکتا۔ ہابز، لاک، روسو اس نظریہ کے سب سے مشہور واضعین گذرے ہیں۔

(الف) ہابز (۱۵۸۸ء۔۱۶۷۹ء)۔ ہابز ملوکیت کا حامی تھا۔ اُس نے اس نظریہ کو موڑ توڑ کر اپنے نتائج خیال کے مطابق کرلیا۔ اس کے نزدیک 'حالت فطری' حالت مساوات وجنگ کا نام ہے جس میں ہر شخص ایک دوسرے کا دشمن تھا۔ اس لا انتہائی جنگ کی بدولت انسانی زندگی "حقیر، ذلیل، وحشیانہ، اور قلیل تھی"؛ لوگ 'قوانین فطرت' کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے جو ان کو ہر جایز و ناجایز ذرائع سے ذاتی منفعت حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ حالت فطری کا خاتمہ کرنے کے لئے لوگوں نے 'عقد اجتماعی' کی بنیاد ڈالی۔ اس کی رو سے انھوں نے اپنے تمام حقوق ایک فرمانروا کے سپرد کردئے جو انسان کی 'حالت فطری' کے مجموعی اختیارات پر قابض ہوگیا۔ لیکن فرمانروا بذات خود اس معاہدہ میں شریک نہ تھا اور نہ اس کا پابند تھا۔ برخلاف رعایا کے وہ اب بھی حالت فطری میں تھا اور جو جی چاہتا کرسکتا تھا۔ رعایا جو ایک بار اپنے فرمانروا سے غیر مشروط اطاعت کا وعدہ کرچکی تھی وعدہ خلافی نہیں کرسکتی تھی اور اپنے معاہدہ کی پابند تھی لیکن اگر فرمانروا سلطنت سے نکال دیا گیا ہو یا کسی اور طرح اپنی رعایا کی حفاظت سے معذور ہو تو رعایا اپنی اطاعت کو کسی غاصب کی جانب منتقل کرسکتی تھی۔

(ب) لاک (۱۶۳۲ء۔۱۷۰۴ء)۔ لاک آئینی ملوکیت کا حامی تھا اور وہ انقلاب انگلستان ۱۶۸۸ء کی حمایت میں اس نظریہ کو کام میں لایا۔ 'حالت فطری' میں 'قانون فطری' رائج تھا۔ اس حالت میں زندگی زیادہ ناگوار نہ تھی۔ ذاتی ملکیت کا بھی وجود تھا اس لئے کہ لوگ جس زمین پر کاشت کرتے وہ ان کی ہوجاتی۔ اس حالت میں بعض

اہم مشکلات تھیں ۔ نہ فرائض کی اہمیت کا احساس تھا۔ اور نہ کوئی مرتب قانون رائج
سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی غیر جانبدار اور مشہور منصف کا وجود نہ تھا۔ اس لئے جب ایک مرتبہ
جنگ کی ابتدا ہو جاتی تو اسے ختم کرنا دشوار ہو جاتا۔ عقد اجتماعی کی رو سے جس میں فرمانروا
خود شریک تھا وہ اختیارات جو رعایا سے لئے جا سکتے تھے فرمانروا کی طرف منتقل کر دئے
گئے۔ لیکن رعایا کے 'فطری حقوق' اس کے پاس رہے مثلاً یہ کہ ان پر سوائے
ان کے نمایندوں کی صلاح کے اور کوئی ٹیکس نہ لگا سکے۔ معاہدہ کی شرائط سے یہ ظاہر ہوتا ہے
کہ فرمانروا آئینی بادشاہ ہوگا اور اگر وہ رعایا اور فرمانروا کے مابین شرائط کی خلاف ورزی کرے
تو عوام کو اسے تخت سے برطرف کرنے کا مجاز ہے جیسا کہ جیمز ثانی شاہ انگلستان کے
ساتھ ہوا۔ مگر لاک انقلاب پسند نہ تھا اور وہ ان مخصوص حالات کے بیان سے گریز کرتا
ہے جن کی بنا پر رعایا آخری تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ اس کا عقیدہ تھا کہ پارلیمنٹ میں
لوگوں کے فطری اختیارات کا استعمال صرف اُن کے نمایندے ہی کر سکتے ہیں۔ مگر اس نے
مسئلہ 'حکومت عوام' کی انتہائی معنوں میں تاویل نہیں کی۔

(ج) روسو (۱۷۱۲ء - ۱۷۷۸ء) - اس کی تکمیل کا سہرا جین جیکویس روسو کے
سر رہا۔ یہ سویزرلینڈ کا باشندہ تھا اور اس کی تصانیف فرانس کے انقلاب پسندوں
کے لئے کلام ربانی کا حکم رکھتی تھیں۔ روسو نظریہ عقد اجتماعی کو تشریحی حیثیت سے پیش
کرتا ہے۔ نہ کہ تاریخی نقطۂ نظر سے۔ اس کے نزدیک اس نظریہ سے اس امر کا پتہ نہیں
چلتا کہ سلطنت کی ابتدا کس طرح ہوئی بلکہ سلطنت کی اخلاقی بنیاد کی تشریح ہوتی ہے
روسو نے اپنی ابتدائی تصانیف میں 'حالت فطری' کو انتہائی خوشحالی کا زمانہ قرار دیا
ہے۔ اس کا خیال تھا کہ 'حالت فطری' میں انسان تہذیب کے تباہ کن اثرات سے انحطاط
پذیر نہ ہوا تھا۔ اور خوش و خرم و با اخلاق تھا۔ لیکن اپنی معرکۃ الآرا کتاب سوشیل کنٹراکٹ
میں اس نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ 'حالت فطری' میں بسر کرنے والوں پر ایک ایسا

دور آیا کہ انھوں نے محسوس کر لیا کہ ہر شخص اپنی حفاظت کے لئے جو قوتیں کام میں لاسکتا ہے وہ اس کی مخالف قوتوں کے مقابلہ میں ناکافی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ اپنی آزادی سلب کرانے کے لئے آمادہ نہ تھے ان کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ ایک "ایسی جماعت بنائیں جو اپنی مجموعی قوت سے ہر فرد اور اس کی ملکیت کو محفوظ و مامون رکھے اور اس جماعت میں ہر شخص باہمی اتحاد کے باوجود صرف آپ اپنا حکم مانے اور حسب سابق آزاد رہے"۔

یہ مدعا ایک 'عقد اجتماعی' کے بدولت حاصل ہوا جو مفصلہ ذیل امور پر مبنی تھا۔

"ہم میں سے ہر شخص اپنی ذات اور قوت کو "رضائے عامہ" کے تابع کرتا ہے اور اپنی ذاتی حیثیت سے ہم ہر رکن کو کل کا ناقابل تقسیم جز خیال کرتے ہیں"۔ بالفاظ دیگر اتحاد کے فوائد کو 'حالت فطری' کی آزادی کے ساتھ ملاتے ہوئے لوگوں نے عوام کو بہ حیثیت مجموعی، اپنا فرمانروا بنا لیا نہ کہ ایک یا چند اشخاص کو جیسا کہ ہابز اور لاک خیال کرتے ہیں قانون سازی کا اختیار ان چند مخصوص اشخاص کو نہ تھا جو باعتبار حسب و نسب کے منتخب کئے گئے ہوں بلکہ مجمع عوام کی رائے پر تھا۔ متقدمین کے نزدیک جس سلطنت میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا وہ ناجائز غضبیت ہے روسو کے نزدیک ہر زمانہ اور ہر ملک میں حکومت عوام کے اختیار میں ہے اور ہونی چاہیئے۔ اسطرح پر ہر شخص حاکم ہی کیونکہ وہ قانون سازی میں شریک ہے اور محکوم بھی ہے کیونکہ بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت اس کے فرائض میں داخل ہے۔ عوام ہمیشہ اپنی سلطنت کی بہبود کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور اپنی جماعت کے کسی فرد کو نقصان نہیں پہنچاتے لہذا ایسی سلطنت جس کی اطاعت ہمارا اخلاقی فرض ہو صرف وہ ہی ہوسکتی ہے جس میں "رضائے عامہ" فرمانروا ہو۔ "رضائے عامہ" ہر شخص کی بہتری کی خواہش کا نام ہے۔

لیکن قانون سازی کے اختیارات اعلیٰ کو قانون نافذ کرنے کے اختیارات سے امتیاز کرنا چاہیئے۔ نفاذ قانون حکومت کا کام ہے اور قانون سازی عوام کا۔

عوام اپنے بنائے ہوئے قوانین اگر ایک شخص کے سپرد کر دیں تو وہ طرز حکومت ملوکیت کہلائیگی
اگر چند لوگوں کے سپرد کریں تو امرائیت کہلائیگی اور اگر عوام خود اس کام کو انجام دیں تو طرز
حکومت عمومیت کہلائے گی۔ ارکان حکومت ہر حال میں "فرمانروا عوام" کے ماتحت اور ان کے
جوابدہ ہوتے ہیں۔ "فرمانروا عوام" ان کو حسب چاہیں برطرف کر سکتے ہیں۔ نیز فرمانروائی
وہ چیز نہیں کہ دوسروں پر منتقل کی جا سکے۔ "اختیار حکومت تو البتہ منتقل ہو سکتا ہے لیکن
"رضا" منتقل نہیں ہو سکتی"۔ اس لئے عوام کے نمایندوں مثلاً انگریزی دارالعلوم کے
اراکین کو اختیار اعلیٰ نہیں ہو سکتا۔ آج کل جس کو حکومت نیابیہ کہتے ہیں وہ روسو کے نزدیک
ناجایز ہے۔

نظریہ عقد اجتماعی پر متواتر تنقید و تبصرہ ہوتا رہا ہے اور اب اس کی حیثیت بجا طور
پر "اس متروک ایجاد کی سی ہے جو بیکار منصوبوں کے ردی خانہ میں پھینک دی گئی ہو" اس
نظریہ پر دو اعتراض ہیں۔ اول یہ کہ تاریخی نقطۂ نظر سے، اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ ہمارے
پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ "حالت فطری" در اصل کیا تھی۔ انسان ہمیشہ ایک
کنبہ یا قبیلہ کا فرد رہا ہے اور مدنی حیثیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں عقد اجتماعی اور اس
کے شرائط کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

یہ تمام تخیلات محض ذہنی تصویریں ہیں۔ اس نظریہ کے حامی اپنے اپنے نقطۂ
خیال کے مطابق بہت ہی مختلف نتائج پر پہونچے ہیں۔ اگر اس میں کوئی حقیقت ہوتی
تو یہ دعویدار صداقت اس قدر متضاد نتائج پر نہ پہنچتے۔

دویم روسو اور مشہور جرمن حکیم کانٹ نے اس نظریہ کی توضیح یہ کی ہے کہ یہ سلطنت
کی ابتدا کو تاریخی حیثیت سے پیش نہیں کرتا بلکہ صراحتاً نظریہ کی اخلاقی بنیاد کی تشریح کرتا ہے۔
تاریخی لحاظ سے وہ اس کو صحیح نہیں مانتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ ایک ابتدائی معاہدہ کا افسانہ
محض اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے گھڑا گیا تاکہ معلوم ہو کہ انسان کن وجوہات سے سلطنت کے

لاتعداد احکام کو ماننے کے لئے اخلاقی طور پر مجبور ہے اور سلطنت کیوں اپنی رعایا کی بہبودی کا خیال رکھے۔ ان تشریحات کے باوجود اس نظریہ کے خلاف بہت سے اہم اعتراضات ہیں۔ انسانی تعلقاتِ معاہدہ ابنائے جنس کے دعوی سے واضح نہیں ہوتے۔ چونکہ معاہدہ کے معنی اقرارنامہ کے ہیں جس کا ہونا یا نہ ہونا اختیاری ہے۔ اس سے ایک قسم کا اختیا ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن دراصل انسان لابدی طور پر سوسائٹی اور سلطنت کا رکن ہے نہ کہ اختیاری طور پر۔ ہر شخص جیسا سوسائٹی اس کو بناتی ہے بن جاتا ہے۔ اس کے خیالات و جذبات، اس کے افعال و اقوال تمام اس کے تمدنی ماحول کے نتائج ہیں۔ اس کا تعلق سوسائٹی سے معاہدہ کی رو سے نہیں بلکہ فطری ہے۔ جیساکہ ارسطو نے مدت دراز ہوئی کہا تھا کہ "انسان سیاسی حیوان ہے"۔ نظریہ عقد اجتماعی غلط ہے۔ اس لئے کہ وہ انسان کی لابدی مدنی طبیعت کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ بایں ہمہ نظریہ عقد اجتماعی کے واضعین کا رتبہ جدید سیاسی خیالات کی نشو و نما میں بہت ہی بلند ہے۔ "قانونی فرمانروائی" کو سب سے پہلے سمجھنے اور تشریح کرنے کا سہرا ٹامس ہابز کے سر ہے۔ اس کی بحث آئندہ آئیگی۔ نظریہ عقد اجتماعی سے قطع نظر کرکے روسو کے خیالات 'رضائے عامہ' اور 'فرمانروائی' کے متعلق ایک مستقل اور پائدار حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ زمانے کے رواج کی پابندی میں اپنے خیالات نظریہ عقد اجتماعی کے افسانہ کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔

مترجمہ جماعت امتیازی شعبۂ تاریخ و سیاسیات

طنزیات

۲

(رشید احمد صدیقی (علیگ) لکچرر اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

موجودہ ناقدین میں یہ امر متنازعہ فیہ ہے کہ اہالیان روم نے یونانیوں سے طنزیات اخذ کیا یا یہ خود ان کی ہی افکار دماغ کا نتیجہ ہے۔

جولیس سکیلیگر اور ہینسی اس اول الذکر خیال کے علمبردار ہیں۔ رگیلبشی اس اور کیسبن موخرالذکر نظریہ کے معتقد۔ لیکن قبل اس کے کہ ان عقائد پر کوئی بحث کی جائے اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ لعن وطعن، سب وشتم، ہر قوم میں خود بخود نشوو نما پاتے ہیں اس لئے یہ بحث کہ اس فن کو اہالیان روم نے یونان سے اخذ کیا یا اس بارہ خاص میں یونانی اہالیان روم سے مستفید ہوے۔ ایک حد تک بے سود اور غیر متعلق ہے۔ اسکیلیگر کو اصرار ہے کہ یہ سعادت یونان سے روم کو منتقل ہوئی ہے۔ اور ثبوت میں یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ لفظ "سطائر" (طنز یا ہجو) "سطیرس (ایک قسم کا مختلف الاعضا جانور یا بقول دیگر آلہتہ الفلاحت جس کی ہیئت بکرے اور آدمی کے شکل سے مرکب تھی) سے ماخوذ ہے۔ کبن کیسبن اور اس کے مقلدین اس مفہوم سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اور بعضوں کے قول کے مطابق بجا کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "سطیرس" سے سطیرا [illegible] (نظم کے مفہوم میں) اخذ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سطیرا اسم نہیں بلکہ صفت، نظر براں اسے 'سطائر' نہیں بلکہ 'سطائری' کہہ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ آلہتہ الخمر اور الہتہ الفلاحت کے لئے سال کی اولین مختلف زرعی پیداوار ایک چنگیر میں بطور نذر و تہدیہ پیش کیجاتی تھی، اس چنگیر کو "سطورا لنیکس" ([illegible]) کہتے تھے۔

اسی بنا پر سطائر کا مفہوم ایک ایسی نظم سے بھی وابستہ کیا جاتا ہے۔ جس میں مختلف اقسام کے پست ورکیک طعن وطنز مختلف بحروں میں ادا کیجاتی تھیں۔ بہر حال ان صرفی یا نحوی موشگافیوں سے قطع نظر کر لیا جائے تو کم سے کم یہ حقیقت تو ضرور آشکار ہو جائے گی کہ سطائر (طنزیات) کا وجود کسی نہ کسی نوعیت سے دونوں مقامات (روم اور یونان) پر رہا ہے۔ دونوں ملکوں میں شاعری کی ابتدا اور نشان نزول تقریباً یکساں ہے۔ اور اس کے محرک اعلیٰ وہ والہانہ شیفتگی تھی جو ہر مخلوق کو اپنے حقیقی یا خود ساختہ خالق سے تھی۔

یونانیوں کے ہاں ایک اور چیز تھی جسے "سِلِی" کہتے تھے۔ یہ ایک طرح کی دشنامی نظمیں ہوا کرتی تھیں اور رومن سطائر سے مشابہ تھیں۔ طاآن نے جو سلی لکھی تھی اس کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس میں کثرت کے ساتھ "پیروڈیز" ایک قسم کی نظم جس میں کسی معقول اور سنجیدہ نظم کے الفاظ اور جملوں کو الٹ پھیر یا بدلکر مضحک بنا دیتے تھے۔ تھیں۔ یہ صنف کلام اہالیان روم میں بھی عام تھا

انسونیس نے جو قطعات لکھے تھے اس میں ورجل کے الفاظ اور جملوں کو الٹ پھیر کر پوری نظم کو مضحک بنا دیا ہے۔ توتطلین اور ہوریس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ طنزیات کی تکوین اور نشوونما لاطینی فضا میں ہوئی ہے اور وہاں سے یہ یونان کو منتقل ہوئی ہے۔

طنزیات کے سلسلہ میں اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے فی الحقیقت تھیٹر اور ڈراما کے اولین اشارات، انہیں رنگ رلیوں، عریانیوں اور ہنگاموں سے لئے گئے ہیں جو تمدن اور معاشرت کی ابتدائی دور میں برسر کار رہتے! یہ کچھ تھیٹر اور ڈراما ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ خود موجودہ عہد کے جتنے مذہب یا غیر مہذب، رسمی، مذہبی یا روایتی عید یا تیوہار ہیں ان سب کی تاریخی اور نفسی ماہیت اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں عروس البلاد کے عالم وجود میں آنے سے چار سو سال بعد تک، رومیوں کو یہ نہ معلوم تھا کہ اسٹیج کیا چیز ہے اور تھیٹر اور ڈراما کی کیا نوعیت تھی۔ ابتدا میں رومیوں کے ہاں

ہم کو دو چیزیں نظر آتی ہیں "سطرنی" اور "فیسینی"۔ باعتبار نوعیت یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ سطرنی کی ابتدا اس عہد سے ہوتی ہے جب اٹلی میں سیطرن (زحل) کی کارفرمائی تھی اور "سطرنیلیا" (عید الزحل) کی شان نزول یہی روائت ہے۔ فیسینیا اٹلی میں ایک مقام ہے جہاں سب سے پہلے اسے ترتیب دیکر برسرکار لایا گیا۔ یہ دونوں چیزیں ان رنگ رلیوں اور بدمستیوں پرمشتمل تھیں جو کسی عید یا تقریب کے موقع پر روا رکھی جاتی تھیں۔

مرور ایام سے معاشرت اور مذاق میں بھی انقلاب پیدا ہوا۔ اب وہی چیز جو کسی وقت غیر مرتب اور غیر منتظم صورت میں موجود تھی کسی قدر مرتب اور منتظم نظر آنے لگی۔ فیسینی جو کسی وقت وزن اور قافیہ سے بالکل معرا تھی اب ان صفات سے کسی قدر متصف ہو کر زیادہ وسیع اور مقبول ہوگئی۔ یہانتک کہ جولیس سیزر نے جب گالس پر فتح پائی۔ اس وقت یہ عسکریوں کے زبان پر تھی لیکن ابھی اس کو وہ رتبہ نصیب نہیں ہوا تھا کہ یہ مہذب حلقوں میں باریاب ہوسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ روم کے ابتدائی عہد میں طنزی شعرا کی حیثیت ان مغنیوں کی سی رہی ہوگی جو کسی عید یا تیوہار کے موقع پر شراب سے بدمست ہو کر ناچتے گاتے اور آپس میں ایک دوسرے سے فحاشی یا پھکڑ بازی روا رکھتے ہوں گے۔ کچھ عرصہ کے بعد زمانہ کے تصرف سے، ان پر کس قدر شعور اور تہذیب کا عمل ہوا اور انہوں نے اظہار خیال میں زیادہ سلیقہ اور سلامت روی کو دخل دینا شروع کیا یہانتک کہ رفتہ رفتہ فحش اور سوقیانہ عنصر بالکل حذف کردیا گیا۔ یہ گویا طنزیات کے علم و فن کا بحیثیت علم و فن کے۔ اولین سنگ منزل تھا۔ یہ ہی وقت تھا کہ لیویئس انڈرونیقاص ([illegible]) کا دور دورہ ہوا۔ یہ پہلے یونانی نژاد غلام تھا۔ اور لوئیس سلینطار ([illegible]) اس کا آقا تھا اس نے غلام سے خوش ہوکر پروانہ آزادی عطا کیا تو یہ روم کا آزاد شہری بن گیا۔ روم کے اسٹیج پر جس نے طنزیات کو ایک مستقل وجود کی صورت میں پیش کیا۔ وہ یہ ہی یونانی نژاد انڈرونیقاص تھا۔ یہ اپنے وطن کے وہ طور وطریق مطالعہ کرچکا تھا۔ جو وہاں کے

اسٹیج پر بھی اس نے انہیں خدوخال کو نمایاں کرنا شروع کر دیا۔ بعضوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ روم میں اس نے یونانی اسٹیج کے طور طریقہ ہی نہیں نمایاں کئے بلکہ طرز انشا و طریقۂ تصنیف پر بھی انہیں کے نقوش ثبت کر دیے۔ اس نظریہ کے تسلیم کرنے میں تامل کی یوں گنجایش نہیں رہتی کہ اس کی بزمیہ (کومیدی) اَرسطافینس اور یوپالسس کی تصانیف کا آئینہ ہے۔ اس طور پر گویا روم کی تاریخ طنزیات میں تین نمایاں مراحل نظر آتے ہیں۔

(۱) وہ طعن و طنز جو بالکل ابتدا میں محض برجستہ فحاشی، پھکڑ بازی اور رنگ رلیوں پر مشتمل تھی۔

(۲) وہ درمیانی زمانہ جب طنزیات میں سے فحش اور سوقیانہ عنصر حذف کر دیا گیا اور اس قسم کی بے محابہ رنگ رلیوں میں ایک طرح کی سہولت اور سلاست پیدا ہو گئی۔ یہ گویا ایک قسم کی بے ہنگام نقالی اور ہنرالی کا دور تھا جس میں نہ تو ابتدائی عہد کی فحاشی اور رکاکت تھی اور نہ بعد کے تماشوں کی ترتیب و تنظیم۔

(۳) لیوئیس اندرونیقاس کا دور، جس نے طنزیات کو ایک مستقل صورت دیکر اسٹیج کے قابل بنا دیا اور جس کے متعلق یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے یونانیوں کے قدیم بزمیہ کا احیا کیا۔

لیوئیس کو روم میں اسٹیج قایم ہوئے ابھی ایک نہایت ہی مختصر زمانہ گذرا تھا کہ اینی اَس (Ennius [illegible]) پیدا ہوا۔ اس نے اپنے ہموطنوں کی ذہانت اور طباعی کا پورے طور پر احساس کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ جہانتک طنزیات کا تعلق اسٹیج سے تھا، اہالیان روم کے نزدیک اس کی چند نوعیتیں قابل گرفت نہیں۔ نظر براں اس نے سب سے پہلے یہ اصلاح پیش کی کہ رکاکت اور عامیانہ پن کا عنصر کلیتہً حذف کر کے اسے زیادہ لطیف اور سلیس بنا دیا جاسے۔ اس نے یہ التزام بھی کیا کہ آیندہ سے اس میں علمی رنگ کا بھی اضافہ کرنا چاہیئے یعنی اس کا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ مطالعہ بھی کیا جا سکے۔ اس

تمام تصانیف کی بنیاد ہر قسم کی نوک جھونک، ظرافت اور زہرناکیوں پر تھی۔ اسنے اپنی نظموں کے لئے مختلف بحریں اختیار کیں۔ لیکن سب کا موضوع ایک ہی (طنزیات) قایم رکھا۔ کوسیر (...) کا قول ہے کہ اینی اس کے سامنے بیوئیس اندرونیقائیس کی تصانیف نہ تھیں جن کی تمامتر بنیاد یونانی بزمیہ پر تھی بلکہ اس نے اپنی تعمیر کی بنیاد اولین رومن سطائر پر رکھی تھی لیکن ڈرائڈن کا خیال ہے کہ اس کی تصانیف کا ماخذ یونانی بزمیہ اور اس کی دلکش اور دلنشین نوک جھونک ہی اور جس کا مظہر اندرونیقاص کی تصانیف تھیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ اینی اُس گو اطالوی تھا لیکن یونانی السنہ کا زبردست عالم تھا۔ یہانتک کہ اس کا عقیدہ تھا کہ ہومر کی روح نے اس کی کالبد کو اپنا نشیمن بنایا تھا۔ نظر براں یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنے ہموطنوں کے مزخرفات اور مضامین سے کبھی استفادہ کرنا گوارا کیا ہوگا۔ بہرحال اسنے یونانی بزمیہ سے استفادہ کیا یا اُن سے محابا اور بے ہنگام نقل نقالیوں سے فائدہ اٹھایا جو روم میں مروج تھیں یہ امر مسلمہ ہے کہ ای نیس رومن طنزیات کا اولین مصنف ہے۔ اس کا بھانجہ لوسی لئس (...) اس کے بعد پیدا ہوا۔ اسنے اپنے ماموں ہی کے نقش قدم کو اپنا خضر راہ بنایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اینی اس نے اس کی تعلیم و تربیت اپنے مخصوص نہج کی ہو۔ لوسی لیس کے دوران حیات ہی میں بتقو ویتق نمودار ہوا۔ اس نے یونانی بزمیہ کو اور زیادہ لطیف پیرایہ سے اختیار کیا جس کا اولین رومن طنزیات میں لوئیس اندرونیقاص کے عہد تک وجود نہ تھا۔ ہورئیس کا خیال ہے کہ رومیوں میں اولین طنزی شاعر لوسی لیس ہے۔ لیکن ڈرائیڈن کا بیان ہے کہ اسنے اینی اس کی طنزیات میں صرف ایک طرح کا بانکپن پیدا کردیا۔ اور یہ خیال بعید از قیاس ہے کہ خود اسنے کسی قسم کی طنزیات وضع کی۔ مگر زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ جوں جوں رومن زبان زیادہ سنجیدہ اور سلیس ہوتی گئی۔ اس میں یونانی زبان کی شیرینی اور لطافت قبول کرنے کی استعداد بڑھتی گئی۔ یہ غلط ہے کہ

کہ لوسی لیس نے خود کسی قسم کی طنزی شاعری کی بنیاد رکھی، بایں ہمہ ہورکیس اور تو نطلیس دونوں لاطینی طنزیین میں لوسی لیس کو فضل تقدم دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ طنزیات کی ایک دوسری قسم کو بھی یہاں بیان کر دینا مصلحت سے خالی نہ ہوگا۔ طنزیات کی یہ قسم بھی قدما کی میراث ہے اور انہیں سے منتقل ہوتی آئی ہے۔ عام طور پر اسی وارو نی طنزیات کہتے ہیں۔ (لیکن وارو جس سے یہ قسم وابستہ کی جاتی ہے۔اسے مینپی بناتا ہے) روم کی دنیائے ادب میں وارو علامہ اجل تصور کیا گیا ہے یہ مینپیر و غدارنی کا تبیع تھا جو فلسفہ کلبی کا معتقد تھا۔ اینیس کی طنزیات کی مانند اس میں (وارونی طنزیات میں) نہ صرف مختلف اقسام کی نظمیں شامل تھیں بلکہ اس میں نثر کی بھی آمیزش تھی اور یونانی زبان میں لاطینی کے بھی چھینٹے نظر آنے لگے تھے وارونی طنزیات کا اب پتہ نہیں لگتا۔ سوا سے چند ان مختلف اجزا کے جو اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے بالکل مسخ ہو چکے ہیں۔ خود وارو کا بیان ہے کہ اس نے اپنی تصانیف میں نہ صرف مطائبات اور مضحکات کو دخل دیا ہے بلکہ ان میں فلسفہ کے پیچیدہ اور دقیق مسائل بھی شامل کر دئے ہیں۔ منپس کے متعلق بعضوں کا خیال ہے کہ وہ (Diogenes) کا خوگر تھا اور ہومر کے بعض سنجیدہ خیالات میں الفاظ کی الٹ پھیر سے ظرافت کا رنگ بھر دیا کرتا تھا۔ لیکن وارد کے انداز کلام کے متعلق طوبی کا خیال ہے کہ اس کی نظمیں نہایت سنجیدہ مکمل اور پُرشوکت ہوتی تھیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نے منپس کا اتباع کیا اس لئے یہ نتیجہ نکالنا غالباً قرین قیاس ہوگا کہ وارو نے منپس سے مخفی اصفادوع ماکذ کے اصول پر استفادہ کیا۔ وارو کے تبعین میں سے بطرونیس ارنطار ہے جسکی تصانیف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہالینڈ میں شائع ہوئی ہیں دوسرا اسینیکا ہے جسکی متعدد تصانیف (مثلاً کلاڈیس، سمپوزیم وغیرہ) ہیں۔ دور جدید میں ارسمیس اور بارکلے وغیرہ گذرے ہیں انگریزی ادب میں وارد نی اتباع کا یہ پہلو کہ اس میں نثر کا حصہ بھی شامل ہوتا تھا صرف اسپنسر اور ڈرائیڈن کی بعض تصانیف میں نظر آتا ہے۔

یہ ایک نہایت مختصر ذہنی اور تاریخی روداد تھی رومن طنزیات کی۔ اب موجود بحث کے اس پہلو پر غور کرنا چاہیئے جہاں سے یہ فن ایک مستقل صورت اختیار کرکے دنیائے علم و ادب کے سامنے آتا ہے۔ کسی بحث پر اظہار خیال کے دو عام طریقے ہیں ایک تو یہ کہ بالکل ہی ابتدا میں اس کی ایک جامع اور مانع تعریف کر دی جائے اور اس کے بعد اس کی تشریح اور توضیح کی جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مسئلہ زیر بحث کے جتنے نمایاں اور ضروری پہلو ہوں ان کو صاف اور سلیس طور پر بیان کر دیا جائے اس کے بعد انہیں بیانات کی تحت میں اس کی تعریف کر دی جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خود مطالعہ کرنے والا دلائل اور براہین کے حسن و قبح، تفصیل کی تنوعات، استخراج نتائج کی صحت و سقم پر نہایت سہولت اور کامیابی کے ساتھ عبور حاصل کر لیتا ہے۔ موخر الذکر اصول کے بنا پر مسئلہ زیر بحث کے ابتدائی مدارج کی بنیاد رکھی گئی ہے نظر بر اں ناظرین کرام کے سامنے ابھی طنزیات کی ایک جامع، قطعی اور مختصر تعریف نہیں پیش کی جاتی بلکہ ان تاریخی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوے جو اس سلسلہ میں اب تک نمایاں کئے جا سکے ہیں ایک ایسی تعریف پیش کیجاتی ہے جسے ایک حد تک تعریف کی ایک مختصر تفصیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہنٹی آس نے ہورِس پر مضمون لکھتے ہوے طنزیات پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

طنزیات ایک قسم کی نظم ہے جس میں کسی واقعہ یا عمل کا تسلسل نہیں پایا جاتا، جو ہمارے ذہن و دماغ کو آلائشات سے پاک کرنے کے لئے وضع کی گئی ہے۔ جس میں انسانی دماغ غلطیوں، جہالتوں اور ان دیگر عوارض کو جو انسے مترتب ہوتے ہیں، فرداً فرداً مورد لعن وطعن قرار دیا جاتا ہے؛ کبھی اسے کرکے ریطور ڈراما دکھایا جاتا ہے۔ اور کبھی یونہی اور بعض اوقات دونوں طریقوں پر لیکن اکثر استعارۃً اور کنایۃً وہ بھی پست اور بے تکلفانہ انداز سے طریق گفتار تجنز و تلخ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ظرافت اور تمسخر کی بھی

رعایت رکھی جاتی ہے جس کا مقصد تنفر تمسخر یا ہنسی اور قہقہہ کا اکسانا ہوتا ہے۔
لیکن جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے یہ تعریف صرف ہوریس پر صادق آتی ہے۔ اس کے دو اور
مقابل جوونل اور پرسی اس۔ اس سے بہت دور ہیں پست اور بے تکلفانہ انداز سے" ایسی
صفات ہیں جن کا حامل صرف ہوریس ہے اس لئے ہوریس کے نقائص کو (طنزیات)
کی خوبیوں میں شمار کرنا روا نہ ہوگا۔

رومن طنزیات کے بعض نہایت نمایاں پہلوؤں سے آشنا ہونے کے لئے یہ ضروری
ہے کہ چند مشہور اور مستند لاطینی طنز نگار (مثلاً ہوریس، جوونل اور پرسی اس وغیرہ) کے کلام
پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے کیونکہ جب تک ان شعرا کے انداز کلام پر پورا عبور نہ ہو جائے گا
آئندہ چل کر جب ان مسائل پر انتہائی دقت نظر کی ضرورت ہوگی۔ ناظرین کا ذوق صحیح تشنہ رہ جائے گا
ہنسی اس ([illegible]) اور ڈیسیر، ہوریس کو جوونل اور پرسی اس پر فوقیت دیتے ہیں۔ اسکیگر اور رگیلشییر
[illegible] جوونل کو ترجیح دینے کیلئے ہوریس پر نفرین کرتے ہیں کیسبن، پرسی اس کا نام اچھالنے کے لئے جوونل
اور ہوریس پر خاک ڈالتا ہے اسمیٹن ([illegible]) کا قول
ہے کہ ہوریس، پرسی اس اور جوونل ہر ایک نے کم و بیش لوسی لیس کی طنزیات سے
استفادہ کیا ہے۔ ہوریس نے اس فن کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ اس نے لوسی لیس کی
طنزیات کو ان مخصوص حالات اور واقعات، رسم و رواج اور طور طریقہ کا ہم آہنگ بنا دیا
جو عہد آگسٹس کے امتیازات خصوصی تھے ہوریس نے اپنے سنجیدہ اور شگفتہ مذاق طعن و طنز
میں ایک قسم کا مذہبی تقدس پیدا کر دیا تھا۔ آگسٹس کے عہد حکومت میں غیر ملکی عنصر جب روم پر غالب
آنے لگا تھا اور روم کے مہتم بالشان سیرت خصوصی پر اس کا جیسا کچھ مذموم اثر پڑ رہا
تھا ہوریس نے بعض نہایت دلدوز اور دلگداز حملے کئے ہیں۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا کہ وہ
طغیان و عصیان کا ایک ناقد اور مبصر کی حیثیت سے مطالعہ کر رہا تھا کبھی یہ محسوس
ہوتا کہ وہ خود اس عصیان زار میں گردش کھا رہا ہے۔ اس کے بعد یکایک اس کا لب و لہجہ

بدل جانا اور وہ سوسائٹی کے سفاہت اس کی شقاوت اور اس کی اس بے بصری کا ماتم کرنے لگتا تھا۔ جو مسائل حیات کی طرف برتنے جاتے تھے۔

کیسبن، پرسی اس کے اوزان اور اس کی زبان دونوں کی خامیوں کو تسلیم کرتا ہے جو وِنل اور ہورَیس کی بہ نسبت اس کی نظموں کے اوزان غیر مربوط اور غیر مرتب ہیں۔ معقول اور منتخب الفاظ کا فقدان ہے۔ اس کے جواز میں غالباً یہ عذر پیش کرنا بے محل نہ ہوگا کہ پرسی اس جو ونل اور ہورَیس کا پیش رو تھا۔ اسے زبان اور بیان کی جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ بعد میں خود بخود صرف دور ہی نہیں ہو گئیں۔ بلکہ ان میں کافی صفائی اور سلاست پیدا ہونے کے علاوہ مشکل خیالات یا بندشوں کو سہولت اور کامیابی کے ساتھ قبول کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے استعارے دور از کار، ترکیبیں ثقیل اور مفہوم نہایت پیچیدہ ہوتا تھا۔ ممکن ہے اس کا مقصد یہ رہا ہو کہ وہ بغیر دقت نظر کے سمجھا نہ جائے یہ بھی ممکن ہے کہ نیرو کے خوف سے اس نے اپنے مطالب کو الفاظ کی چیستان میں ظاہر کیا ہو یا پھر مرور ایام سے الفاظ اور ان کا مفہوم بالکل مسخ ہو گیا ہو۔ اور بہت سی اہمیں اور قصے معدوم ہو گئے ہوں۔ لیکن ان نقائص کے مقابلہ میں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ کہ اسے جوانا مرگی نصیب ہوئی اور شعر و شاعری کے لئے جس تجربہ مشق اور پختگی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے یہ بالکل محروم رہا ہو۔ اس لئے ایک طور پر یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ جو نقائص اس کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں ایک حیثیت سے اس کے موافق بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا نقائص کے علاوہ اسکیلیگر۔ پرسی اس کو ایک سفید انشا پرداز اور اپنے علم و فضل کے دکھاوے کا شیدائی بتاتا ہے۔ لیکن اس کا مربی کیسبن ان اعتراضات کا جواب دینے کے بجائے۔ ان کو قابل معافی گردانتا ہے اور جب ایسا نہیں کر سکتا تو وہ دوسروں کو بھی اسی جرم کا مرتکب قرار دیتا ہے اسے اس کا اقرار ہے کہ پرسی اس

کا انداز بیان بعض بعض مقامات پر محض کھلک ہی نہیں بلکہ بسا اوقات وہ مذاق سلیم پر بھی بار ہونے لگتا ہے لیکن اس کے نزدیک یہی حالت یونانی شعرا پندار تہیا فرطیس اور اسطافنین کی بھی ہے اور بقول کیسبن جو ونل اور ہورس بھی اسے ذیل میں آجاتے ہیں پرسی اس فلسفہ زینونی کا معتقد تھا۔ اور اس کی تصانیف تمامتر اسی عقیدہ کی ترجمان ہیں۔ اور جہاںتک اس حقیقت کا تعلق ہے۔ وہ جو ونل اور ہورس دونوں سے بازی لے گیا ہے۔ پرسی اس صداقت کا علمبردار ہے اور اس کی تصانیف میں یہ عنصر اس درجہ نمایاں ہے کہ فوراً یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اتنا ہی خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے۔ دوسری طرف ہورس ہے جس کے متعلق ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مذاق اور مزاح کو دخل دیتا رہا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے ہنس ہنس کر اور ہنسا ہنسا کر کہتا ہے۔ اس کی نظر دماغ پر نہیں پڑتی تھی وہ ہمیشہ حماقت اور سفاہت کی بچکنی پر آمادہ رہتا تھا۔ جو ونل کسی مخصوص عیب و ذم کو سرزنش کیلئے مخصوص کر لیتا تھا اور اس پر اپنا پورا زور قلم صرف کر دیتا تھا۔ رومن طنزیات کی اولین ترتیب اور تہذیب کا سہرا پرسی اس کے سر ہے اور یہ پہلا شخص ہے جس نے اس راز کا انکشاف کیا کہ طنزیات کی کامیابی اور کمال کے لئے لازم ہے کہ صرف ایک ہی مضمون اور موضوع ہو۔ ایک ہی فرد خاص ہو جس میں اگر دوسرے عیوب بھی ظاہر ہوں تو محض سرسری طور پر سرزنش کر دی جائے۔ پرسی اس کے وضع کئے ہوئے یہ وہ اصول تھے جنکی پیروی انگریزی ڈراما میں بھی ملحوظ رکھی جاتی ہے یہاں بھی صرف ایک ہی ترتیب اور تنظیم ہوتی ہے اور گو ایک ضمنی پلاٹ ہزل اور نقالی کا بھی ہوتا ہے۔ تاہم وہ اصل قصہ سے رہنموں رہتا ہے۔ ہورس کی غائر نظر اس حقیقت سے ناآشنا نہ تھی۔ بایں‌ہمہ اسنے اپنی طنزیات میں اس کلیہ کو مدنظر نہیں رکھا ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھکر کیسبن نے پرسی اس کو ہورس پر ترجیح دی ہے۔ لیکن ہورس کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اس کے ہاں وحدت و یکتائی کی یوں ضرورت نہ تھی کہ "سطائر" کا لفظ ہی مرادف ہے ایک الیگ

طباق کا جس میں مختلف اقسام کا خلط اور میل ہو۔ جووِنَل نے اپنی نظم کو "فیرگو" (مخلوط و ممزوج) قرار دیا ہے اور ہوریس کی نہیں بلکہ پرسی اَس کی تقلید کی ہے۔ لیکن جووِنَل سے قطع نظر کر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پرسی اِس کی اس جدّت کو یورپ کے زبردست ترین فرانسیسی طنزی شاعر بوائلو (Boileau) نے بھی جس کا فیصلہ دنیائے نقد و انتقاد میں نصِ قطعی کا حکم رکھتا تھا۔ خضرِ راہ بنایا ہے۔ اصل یہ ہے کہ طنزیات کا ایک مکمل نمونہ پیش کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شاعر ایک ہی خوبی یا فضیلت پر زورِ قلم صرف کرے یا ایک ہی برائی یا نقص سے اجتناب کرنے کی ہدایت کرے۔ رومن طنزیات اس حقیقت کی پوری پوری ترجمانی کرتی ہیں۔

حیات زنداں

عہد قدیم و جدید کی متمدن اقوام میں ہمیشہ جیل خانوں کا رواج رہا ہے۔ یونان و مصر و روما کی تاریخ قدیم سے زندان ہائے سیاہ کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت یوسف کا "زندان عزیز" مشہور ہے۔ سری کرشن جی مہاراج نے جنم ہی بندی گرہ میں لیا تھا۔ ہر زمانے میں برے اور بھلے آدمی رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ بروں کو سزا دینے کے لئے کوئی صورت ضرور ہونی چاہئے۔ اپنی اپنی تہذیب اور اپنے اپنے مخصوص رجحان خیال کے مطابق دنیا کی تمام سلطنتیں اخلاقی مجرموں کو اپنی مصالح ملکی کے لحاظ سے مجرمین سیاسی کو مختلف میعاد کے لئے جیل خانوں میں رکھا کرتی ہیں زمانہ قدیم میں جب کہ تہذیب و شائستگی کی کوئی عام ترقی نہ تھی اس لئے اس زمانے کے بندی خانوں کی حالتِ خراب کا تذکرہ ضروری نہیں ہے۔ لیکن کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر آج کل کے اعلیٰ درجہ کے مہذب و متمدن زمانہ میں ہم "حیات زندان" سے یہ مراد لیں کہ اس زمانہ میں محبوسین کی اصلاح کی جائے تاکہ رہا ہونے کے بعد وہ خود اپنے لئے مفید ثابت ہوں اور سوسائٹی کو بھی ان کے وجود سے کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہونچے۔

مضمونِ حاضر میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ جیل خانہ کی حالت جس پر کہ عام طور سے بہت ہی کم توجہ کی جاتی ہے بیان کیا جائے و نیز یہ بتلایا جائے کہ مجرمین کی قید و بند سے منشاء و مقصد کیا ہے اور ہندوستان کے و نیز بعض اور ممالک کے جیل خانوں سے یہ مقصد کس حد تک پورا ہوتا ہے۔ مسئلہ موجودہ کے بعض پہلو زیادہ روشن کرنے کے لئے بیانیہ طریقہ سے جیل خانہ کے بعض چشم دید حالات و حوادث کا تذکرہ اکثر کرنا پڑا ہے۔

جان ہاورڈ آج کل کے ہندوستانی جیل خانوں کی طرح اٹھارہویں صدی میں انگلستان اور

دیگر یورپین ممالک کے قید خانوں کا بُرا حال تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں ایک شریف النفس انگریز مسٹر جان ہاورڈ کو اتفاقیہ طور سے جیل خانے جانا پڑا۔ قیدیوں کی زار و زبوں حالت کو دیکھکر اُن کے قلب پر ایسا گہرا اثر پڑا کہ وہاں سے رہا ہونے کے بعد اُنہوں نے اپنی تمام عمر عزیز انگریزی اور دیگر یورپین حکومتوں سے انتظامات جیل درست کرانے اور قیدیوں کی اصلاح و بہبودی کی قابل ستایش کوشش میں صرف کردی۔ انگلستان کے ایک ایک جیل خانہ کا خود معاینہ کیا۔ حکومت وقت کو قیدیوں کی غذا۔ حفظان صحت اخلاقی اور معاشرتی حالت کی اصلاح پر آمادہ کیا۔ یورپ کے بعض اور جیل خانے بھی انہوں نے خود جا کر دیکھے اور وہاں کی حکومتوں کو اُن کی اصلاح کی صلاح دی چنانچہ اُنہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یورپ میں اوسطاً ہندوستان سے کم جیلخانے ہیں اور قیدیوں کی حالت بھی بہتر ہے۔

ہندوستانی جیلوں کے قیدی ہندوستانی جیلوں کا طریق انتظام کچھ ایسا خراب ہے کہ جو شخص اخلاقی جرم کی بنا پر وہاں آگیا (خواہ وہ واقعی مجرم ہو یا نہ ہو) پھر وہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے اخلاقی جرایم کا خوگر ہو کر نکلتا ہے۔ اور اس طرح بجاے اصلاح ہونے کے اُلٹا اثر پڑتا ہے۔ اُس کے "پہلے پہل داخل زندان" ہونے کے بعد سے آخر وقت تک جیل کے ہر اعلیٰ اور ادنیٰ ملازم کا برتاوٴ اس قدر خراب ہوتا ہے۔ کہ اچھا بھلا آدمی بھی اُن کی اور دوسرے قیدیوں کی صحبت بد کا اثر قبول کر کے انہیں جیسا بن جاتا ہے بات بات پر نہایت ہی خراب گالیوں کی بھرمار بینتوں اور ڈنڈوں کی بوچھار تو گویا "حضور" کا عام شیوہ ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ عام طور سے قیدی ہوتے ہی ایسے طبقہ کے لوگ ہیں جن کے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ تقریباً نصف قیدی باوڑے۔ سانسی۔ بھانتو وغیرہ جیسی جرایم پیشہ اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن علاوہ ان کے بھی ادنیٰ۔ اعلیٰ اور اوسط درجہ کے لوگ بعض اوقات بے جرم و بے گناہ محض

آپس کے مخالفین کی کارستانیوں اور قانونی وسیاسی دار و گیر میں سزا پاکر چلے آتے ہیں۔ فوجداری و زمینداری اور روادوستد کے معاملات میں تو اکثر سفید پوش ہی آتے ہیں۔ بقول ایک سرکاری ممبر کونسل کے گذشتہ چند سال میں اسیران سیاسی سے جیل خانوں کی "مردم شماری" بہت بڑھ گئی تھی۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ وہاں موجود ہوتے ہیں۔ جرایم کی نوعیتیں بھی جداگانہ ہوتی ہیں۔ اس لئے "فرق مراتب" ضروری ہے۔ لیکن یہ نہیں کیا جاتا سب کو یکجا رکھا جاتا ہے۔ ایک ہی طرح کا کھانا۔ ایک ہی مشقت۔ ایک ہی لباس الغرض بالکل یکساں ماند و بود سیاسی قیدی البتہ کچھ اپنے عادات و اطوار سے کچھ اپنے چال چلن سے کچھ اپنے اخلاقی اثر سے عام طور سے بدکلامی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں۔

جیل کی ماند و بود لباس و غذا وغیرہ

جیل خانے میں کھانا صبح کو گیارہ بجے اور شام کو پانچ بجے دیا جاتا ہے جو اس قدر خراب ہوتا ہے کہ پہلے چار پانچ روز نہیں کھایا جاتا۔ بعد میں اس لئے کہ کوئی چارہ کار ہی نہیں خود بخود عادت پڑ جاتی ہے۔ مراداباد جیل میں (جہاں کہ راقم الحروف کو ایک سال رہنے کا اتفاق ہوا تھا) جیل سپرنٹنڈنٹ (جو عام طور سے سول سرجن ہوتا ہے) جب کھانے کا معائنہ کرتا تھا تو روٹی توڑ کر اپنے کتے کو ڈالدیتا تھا اگر کتا کھا لیتا تو سمجھ لیا جاتا کہ قیدی بھی اس کو کھا سکتے ہیں۔ یہ روٹی گیہوں چنے اور جو کے مجموعی آٹے کی تیار کی جاتی ہے جس میں مٹی کا بھی خاصہ حصہ ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ "خاک وطن" سے آخر کوئی واسطہ خدمت وہاں بھی تو ہونا چاہئے۔ دوپہر کو اس روٹی کے ساتھ موٹھ یا مٹر کی بالکل سیاہ رنگ کی نہایت پتلی دال دی جاتی ہے جس میں تھوڑا سا نمک مرچ اور تیل بھی ہوتا ہے۔ شام کو بجائے دال کے ترکاری دی جاتی جو اس سے کہیں بدتر ہوتی ہے۔

لباس کے قسم سے ایک چھوٹا سا اونچا سا کرتہ اور جانگیہ اور ایک سرخ یا سیاہ رنگ کی ٹوپی کافی سمجھی جاتی ہے۔ مسلمان اسیران سیاسی کو نماز کے لئے ایک تہمد بھی دیا جاتا ہے

جو صرف نماز کے وقت چند منٹ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بچھانے کو ایک مونج کا فرش
گرمیوں میں ایک اور جاڑوں میں اوڑھنے کو گھوڑوں پر ڈالنے والے سیاہ رنگ کے کمبل
دئے جاتے ہیں۔ جن سے صرف ایک فرد کی برابر سردی سے۔ بچاؤ ہو سکتا ہے۔ ہر موسم میں
بند بارک میں سونا پڑتا ہے جس میں لوہے کے جنگلے ہوتے ہیں۔ سردی کے موسم میں
"بادِ زمہریر" کے آزار کیا کیا بیان کیجئے۔ گرمیوں کے موسم میں یہی جگہ دوزخ بن جاتی ہے۔
ہوا کی کمی مچھروں کی زیادتی۔ اور بارہوں مہینوں کا سب سے بڑا عذاب یہ کہ بارکوں کے اندر
تمام رات ہر پانچ پانچ دس دس منٹ کے وقفہ سے پہرہ دار و نمبردار اپنی بارک کے قیدیوں
کی شمار بلند آواز سے کرتا ہے۔ اور اس کی رپورٹ دوسری بارک کے پہرہ دار کو دیتا ہے
اور وہ تیسرے کو۔ اس طرح یہ سلسلہ تمام رات جاری رہتا ہے۔ تین سو پینسٹھ دن میں نیند
بھر کر سونا کبھی ایک رات بھی نصیب نہیں ہوتا برتن کی قسم سے ایک لوہے کا بے دستہ
کی کڑاہی کی شکل کا ایک برتن دیا جاتا ہے۔ قیدی اپنی اصطلاح میں اس کو تسلہ کہتے ہیں
اسی کے ساتھ ایک چھوٹا تسلہ اور ہوتا ہے۔ ان بڑے اور چھوٹے برتنوں کو بابو اربند گھوش
نے انگلو انڈین اور سویلین کہا ہے۔ شاید اس لئے کہ جس طرح حکومت اپنا تمام کام انہیں
کے ذریعہ سے چلاتی ہے قیدی بھی اپنی تمام ضروریات انہیں دو برتنوں سے پوری
کرتا ہے۔

جیل کی مشقت | جیل کی مشقت صبح سے چار بجے شام تک لی جاتی ہے۔ درمیاں میں
گھنٹہ دو گھنٹہ کا وقفہ بھی دیا جاتا ہے۔ ہر روز صاحب سپرنٹنڈنٹ نو دس بجے صبح کو معاینہ
کے لئے آتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک روز خاص طور سے معاینہ کیا جاتا ہے۔ جیل گورنمنٹ
دراصل تمام تر قیدیوں ہی کے وسیلہ سے چلائی جاتی ہے۔ پرانا قیدی نئے پر بڑی میعاد
کا قیدی چھوٹی میعاد کے قیدی پر افسر بنا کر رکھا جاتا ہے۔ اس خدمت کے عوض میں مہینہ
پیچھے دو دو چار چار روز اس کو رہائی کے ایام رعایتی عطا ہوتے ہیں۔ یہ قیدی نمبردار پہرہ

افسران بالا سے دوسرے قیدیوں کی چغلی اور شکایتیں کرتے رہتے ہیں۔ الغرض حکومت ہند کا پورٹ بلیر سے باہر ہر ایک جیل خانہ اسی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہوتا ہے۔ چکی چلانا۔ کھانا پکانا۔ کوئیں سے پانی کھینچنا۔ جھاڑو دینا۔ باغیچہ کھودنا۔ کولو چلانا۔ فرش بُننا۔ بان کی رسّی بنانا۔ مونج اور رام بانس کوٹنا۔ الغرض اندر کی ضرورت کے جملہ کام سب قیدی خود ہی کرتے ہیں۔ سرکاری ملازم تو اعلیٰ و ادنیٰ سب ملا کر سو قیدیوں کے پیچھے چار پانچ ہوں گے وہ بھی اپنا زیادہ تر وقت آرام کرنے اور رشوت لینے دینے میں صرف کرتے ہیں۔ بیمار قیدی اسپتال میں رکھے جاتے ہیں۔ ان کو کھانا کچھ بہتر ملتا ہے اور اکثر اوقات مشقت بھی معاف ہوتی ہے۔ لیکن قیدیوں کو اسپتال بھیجنا صرف جناب جیلر کی خاطر عزیز پر منحصر ہے۔

ایک مرتبہ راقم الحروف کے سامنے گرمیوں کے موسم میں دن کے دو بجے ایک نہایت بیمار قیدی سے مار مار کر چکی پسوائی جارہی تھی۔ جب وہ عذر کرتا تھا تو کہا جاتا تھا۔ کہ "یہ بہانہ ہے" حالانکہ وہ بیچارہ اسی روز شام کو فوت ہو گیا۔

قیدی کی جان | قیدی کی جان کی تو واقعی وہاں کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔ اسی کا مشہور مقولہ بالکل صحیح طریقہ سے حسرت موہانی صاحب نے نقل کیا ہے کہ "قیدی بھاگ جائے تو شیر اور مرجائے تو مکھی"۔ یعنی جیل سے کوئی قیدی کسی طرح سے بھی نکل بھاگے تو اس کی اس قدر جستجو کی جاتی ہے کہ جیل کے اندر اور باہر ایک تہلکہ مچ جاتا ہے گویا کہ شیر لوہے کے جال سے نکل بھاگا۔ لیکن یہی قیدی خواہ کارپردازان جیل کی غفلت یا زیادتی سے فوت بھی ہو جائے تو کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کسی سے کوئی بازپرس کی جائیگی۔ علاوہ مندرجہ بالا واقعہ کے راقم الحروف کے سامنے ایک سال میں نمونیہ سے پانچ آدمی فوت ہوئے لیکن کبھی یہ نہ کیا گیا کہ باوجود ممالک میں گنجایش ہونے کے قیدیوں کو جاڑے کے جاڑے میں تیسرا کمبل دیدیا جائے۔

ملزمین زیر تجویز | مقدمہ کے ختم ہونے سے پہلے کا زمانہ قیدی کا سخت مشکل و پریشانی کا ہوتا ہے اس لئے کہ میعاد سزا مقرر نہ ہونے کی وجہ سے طبیعت کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ یکسوئی قطعاً ناپید۔ اس زمانہ میں جیل خانہ کا کوئی کام بھی نہیں لیا جاتا "بیکاری و بے شغلی برائیوں کی ماں ہے"۔ بعض اوقات سال سال بھر مقدمہ فیصل نہیں ہوتا خودکشی بھی کبھی کبھی یہ لوگ کر بیٹھتے ہیں۔ جان ہاورڈ نے انڈر ٹرائلز سے بھی کام لینے کی سفارش کی تھی۔

سزا یافتہ لڑکے اور بچے | چھوٹے چھوٹے جرموں اور معمولی قصوروں کی بنا پر بہت سے دس دس بارہ بارہ پندرہ پندرہ برس کے لڑکے اور بچے بھی سزا پاکر چلے آتے ہیں۔ ان کی زندگی تباہ ہوتی ہوئی دیکھکر واقعی بڑی عبرت ہوتی ہے۔ اگر اور قیدیوں کے لئے نہ سہی تو ان کے لئے ضرور امریکہ اور یورپ کی طرح ریفارمٹیریز (دارالاصلاح) کھولدی جائیں تو ملک کے لاکھوں بچوں کی زندگیاں خراب ہونے سے بچ جائیں گی۔ جو بچپن میں جیل خانہ ہو آیا وہ ہمیشہ کے لئے دیدہ دلیر ہو جاتا ہے۔ اور جیل خانے سے رہا ہونے کے بعد گھر لعد میں جاتا ہے پہلے چوری۔ قمار بازی یا گرہ تراشی کا ایک واقعہ کرکے اپنی طبیعت اور ہاتھ کو رواں کر لیتا ہے۔

جیل لائف کا اثر قیدی کی ذات پر | کھانے پینے چلنے پھرنے۔ سونے جاگنے اور ہر قسم کے برتاؤ میں جب قیدی پر اتنی سختی کی جاتی ہے تو تھوڑے دنوں میں قدرتی طور سے اُس کی طبیعت پر نہایت ہی مسموم اثر پڑتا ہے۔ گالیاں کھاتے کھاتے خود گالیاں دینے کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔ کھانے پہننے کی چار پانچ اشد ضرورت کی چیزوں کے علاوہ اس کو کوئی شئے نہیں دی جاتی۔ انسان کی طبیعت اُس پر قناعت نہیں کر سکتی ادنی ملازمین کے ذریعہ جو ہر وقت باہر آتے جاتے رہتے ہیں وہ بیڑی۔ سگریٹ تمباکو دیا سلائی اور کھانے کی اشیاء حاصل کرنے کے لئے

وہ وہ جھوٹ بولتا اور فریب کرتا رہتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر یہ ممکن نہیں ہوتا تو بعض قیدی دوسرے قیدیوں کی ایسی ہی معمولی چیزیں چھپا لیتے ہیں۔ اس میں بھی بیسیوں جتن کرنے پڑتے ہیں۔ جیل خانے میں بھی آکر بغیر مزید چھوٹے موٹے جرایم کئے کام نہیں چلتا۔ کیونکہ کچھ زمانہ کے لئے بھی انھیں جھوٹ۔ چوری مکر اور فریب سے اجتناب کرنے کا موقع نہیں ملتا اس لئے ان کے دلوں پر "زنگ گناہ" کی سیاہی بڑھتی جاتی ہے۔ اگر چندے پرانی عادتیں چھوڑنے کا موقع ملتا تو ممکن تھا کہ ضمیر میں کچھ لطافت پیدا ہوتی۔ برخلاف اس کے وہ جیل خانوں کے ہتکنڈوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ پہلے پہل قدم رکھنے کی جو جھجک ہوتی ہے وہ بھی جاتی رہتی ہے۔ یہ ہی لوگ دوبارہ جاکر اپنا مجرمانہ پیشہ شروع کرتے ہیں جیل خانوں میں زیادہ تر یہ ہی دوبارہ سہ بارہ خوگر قیدی ہوتے ہیں۔ سال سال بھر چھ چھ مہینہ کی دس دس پندرہ پندرہ سزائیں کاٹے ہوے کم وبیش ہر جیلخانہ میں ہوتے ہیں۔

بلا شبہ کثرتِ جرائم اور ان تمام بد اخلاقیوں کی ذمہ دار جیلخانوں کا غیر سائنٹیفک طریق انتظام ہے۔ لیکن ہماری سوسائٹی کا بھی اس میں کچھ قصور ہے اس لئے کہ جو شخص ایک دفعہ جیل خانہ ہو آیا تو اوس کے محلہ اور اس کے خاندان کا اعتبار اوسپر سے بالکل اٹھ جاتا ہے۔ کوئی اس سے ہمدردی نہیں کرتا۔ نہ کہیں اسے روزگار ملتا ہے۔ نہ ملازمت وہ اپنے آپ کو اس معاشرتی مقاطعہ کے عالم میں دیکھکر ناچار اپنے مجرمانہ پیشہ کو اختیار کرتا ہے اور عمر بھر جیل خانے آتا جاتا رہتا ہے۔ باوجود اس کے ہمارا خیال ہے کہ حکومت کی غیر ہمدردانہ پالیسی ان خرابیوں کی زیادہ ذمہ دار ہے اس لئے کہ جب ایک مجتمع اور منتظم گروہ ان کی اصلاح نہیں کرسکتا تو مختلف طبقات کی منتشر و پراگندہ سوسائٹیاں کیا کرسکتی ہیں۔

مشقت قیدیوں سے کچھ ایسی الٹی اُلٹی لی جاتی ہے کہ معلوم نہیں صرف دینا دی عذاب دینے کے علاوہ حکومت کی اس میں اور کیا مصلحت ہوسکتی ہے۔ جتنے جیل خانے اور قیدی

ہندوستان میں ہیں اتنے کسی زمانے میں کہیں نہ ہوں گے لیکن اِن سے کوئی مستقل مفید کام نہیں لیا جاتا۔ اگر انہیں قیدیوں سے اُن کے آبائی پیشوں کے مطابق یا کوئی خاص پیشہ سکھلا کر ڈھنگ سے کچھ کام لیا جائے تو یقیناً محکمہ جیل کا تمام صرفہ نکل سکتا ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ مرادآباد جیل کا چون ہزار روپیہ سالانہ کا خرچ ہے اور چار ہزار روپیہ کی آمدنی بمبئی۔ سی۔ پی بنگال پنجاب اور اجمیر کے قیدیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے یہی حالت وہاں کی بھی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ کام نہایت بُرا۔ غیر مفید اور بھونڈا اور پھر نہایت بُری طرح لیا جاتا ہے۔ "مزدور خوشدل کند کار بیش" کے اصول کو بالکل بھلا دیا گیا ہے۔ ہر چند کہ قیدی کی حیثیت بہ مقابلہ مزدور کے نہایت سخت ہے لیکن جیلخانوں کے کاروبار سے صاف ظاہر ہے کہ باوجود اس قدر زور و ظلم کے قیدی سے پورا کام نہیں لیا جا سکتا۔ وہ کام کرتا کم اور بگاڑتا زیادہ ہے قیدی کے دل میں خوف خدا ڈالنے کی تو کبھی ادنیٰ سی بھی کوشش نہیں کی جاتی۔ انسان فطرتاً عبادت الٰہی سے گھبراتا ہے۔ جب اس طرف مائل کرنے کا برائے نام بھی کوئی ذریعہ نہ ہو تو انسان واقعی نہایت سیاہ قلب سخت دل اور ناحق شناس بن جاتا ہے۔ تجربہ یہ ہے کہ وہاں تکلیف سے گذرتی ہے اور خدا تکلیف میں بہت یاد آتا ہے۔ اس لئے بعض معمولی قیدیوں کو بھی دعائیں کرتے نمازیں پڑھتے اور پوجا پاٹ کرتے دیکھا گیا ہے لیکن بہت ہی کم۔ ہندو اور مسلمانوں کے اعتقادات کے مطابق اُن سے عبادت کرائی جائے اور گاہ بگاہ باہر سے مولوی اور پنڈت وعظ کرنے اور مذہبی باتیں سکھلانے بھیجے جائیں تو بھی بہت اصلاح ہو سکتی ہے۔

"عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو"

لیکن ایک ہوشمند سیاسی قیدی کے لئے جیلخانہ کی ہی خراب و خستہ زندگی میں بھی بہت سے سبق اور بے مثال سیاسی تربیت کے سامان موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو اُس کو یہ انتظام کرنا چاہئے کہ ازراہِ غرور نہیں بلکہ محض خراب سوسائٹی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے وہ جیل کے قیدیوں اور ملازموں سے کوئی سروکار نہ رکھے جن لوگوں کو یقین ہو کہ وہ اُن کی خراب صحبت کا اثر قطعاً قبول نہ کریں گے تو اُن لوگوں سے ملنے اور اُن کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کی کوشش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

جیل خانے میں اشد ضرورت کی چند چیزوں پر قناعت کرنے کی وجہ سے طبیعت میں ایک عجیب استغنا اور مضبوطی پیدا ہوجاتی ہے وہ سوچتا ہے کہ اللہ اکبر انسان کی واقعی ضروریات زندگی اسقدر قلیل ہیں۔ محض اپنی عادت اور حرص و ہوا کی وجہ سے صدہا قسم کے سامانِ تعیش کو وہ اپنے لئے لازمی سمجھلیتا ہے اور اُنہی کے مہیا کرنے میں طرح طرح کے مکر و فریب کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے اور بیجا خوشامد بن کرتا ہے۔ دوسروں کی غلامی بھی گوارا کرلیتا ہے حتیٰ کے مذہب فروشی اور خلاف ضمیر حرکات سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ قناعت کا یہ درس اوس کی آیندہ زندگی میں بہت کام آتا ہے۔ اگر اُس کی زندگی سیاسی رہے تو واقعی یہ تعلیم خودداری و خود فراموشی اس کیلئے بے انتہا مفید ہے۔

جیل خانے کی تکالیف و مصائب کی وجہ سے اس کو ایسی تربیت ملجاتی ہے کہ دنیا کی باہر کی مشکلات اُس کو بہت معمولی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور وہ بہ نسبت اور لوگوں کے اُنپر زیادہ آسانی سے فتح حاصل کرلیتا ہے نفس امّارہ کو قابو میں رکھنے یتہّ مار کر اطمینان و یکسوئی سے ایک کام کو کرنے۔ کم گوئی۔ فرمانبرداری۔ وقت کی پابندی جفاکشی اور اسی قسم کی مختلف خوبیاں انسان میں خود بخود پیدا ہوجاتی ہیں۔ جوکہ اسکول اور کالج کی تعلیم اور اونچی صحبتوں سے برسوں میں بھی پیدا نہیں ہوتیں۔

مشقتی قیدی کو بھی شام سے لیکر برابر بارہ تیرہ گھنٹہ فرصت رہتی ہے۔ باہر عالم کشمکش میں لوگوں کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ کچھ دیر اپنی تمام زندگی پر نظر ڈالیں اپنے اعمال کا محاسبہ کریں اور دیکھیں کہ خدا نے اُن کو کس لئے پیدا کیا ہے۔ قوم و وطن کے اُنپر کیا کیا حقوق ہیں۔ انسان ہونے کے لحاظ سے بنی نوع کے اُنپر کیا حقوق ہیں اور اُن کو وہ کس حد تک پورا کرتے ہیں۔ حیات زندان کا سب سے زیادہ حیرت میں ڈالدینے والا یہ ہی کرشمہ ہے کہ تنہائی کے عالم میں تاریک راتوں میں جب کہ آنکھوں کی نیند غایب ہوتی ہے انسان کے اندرون قلب کی ایک قوت اُس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی تمام گذشتہ زندگی پر ریویو کرے۔ ایک ایک گناہ جو اُس نے کیا ہے

اُس کو یاد آتا ہے۔ وہ اُس پر اپنے دل کو سخت ملامت کرتا ہے۔ اور آیندہ کے لئے توبہ کرتا ہے
ایک ایک اچھا سلوک جو اُس نے کسی کے ساتھ کیا ہے یا کوئی اچھا کام جو اُس سے بن پڑا
ہے وہ اُس کو یاد آتا ہے اور جیل خانہ کی تاریکی و تنہائی میں صرف اُسی خیال لطیف سے اُس
کی روح خوش ہوتی ہے۔ قلب میں ایک خاص رقّت و لطافت پیدا ہو جانے کے باعث
اپنے دل کی ہر ایک چیز کو وہ اسی رنگ میں دیکھتا ہے جس میں کہ فی الحقیقت وہ ہے۔ فوری
خیالات کا ہجوم اور فوری حرص و طمع کا کوئی زنگ اُس کے صفحۂ دل پر نہیں ہوتا اس لئے ضمیر
کی سچی آواز پر دل بے اختیار اُبل پڑتا ہے اور اپنے ضمیر کو دھوکا دینا اور ظاہری لیپ پوت کرنا
بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو اپنے قصور اور اپنے گناہ آئینہ کی طرح
نظر آتے ہیں۔ غم و غصہ بغض و کینہ کے جذبات کی فضولی سے آگاہ ہو کر یک لخت اُن کو
اپنے دل سے دور کر دیتا ہے۔

خویش و اقربا دوست و احباب مال و منال سے یکسر علیحدگی کے باعث انسان اپنے آپ
کو ایک خاص بے بسی لاچاری و مظلومیت کی حالت میں محسوس کرتا ہے نفس اور کیریکٹر
کی اصلاح کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ علاوہ اندرونِ دل کی خواہش اصلاح کے گرد و پیش
کے حالات بھی ایسے ہوں کہ کسی طرح سے اُس کے نفس و دل کو ابھارنے میں ممد و معاون
نہ ہوں۔ یہ بات دنیا کی ہر کشش و محبوبیت سے کنارہ کئے ناممکن ہے۔

راقم
سید محمد ہادی
متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

رفتار تعلیم

قارئین یہ خبر سنکر سخت متعجب ہوں گے کہ مہاتما گاندھی مصلح اور معلم اخلاق کے ساتھ ایک بہت بڑے ماہر تعلیم بھی ہیں ۔ اپنے زمانہ اسیری میں انھوں نے بچوں کے لئے ایک پرائمر لکھی تھی جو اس اسباق پر مشتمل ہے ۔ پہلے سبق میں انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ علی الصباح ۴ بجے ماں بچے کو جگا رہی ہے ۔ لیکن بچہ نیند کی وجہ سے اور سونے پہ مصر ہے ۔ ماں اسے یہ کہکر اٹھاتی ہے کہ دن اٹھ گئی ہے اور عبادت کا وقت قریب آگیا ہے ۔ بچہ اٹھتا ہے اور ماں اس سے نیم کی مسواک کرنے کے لئے کہتی ہے ۔ لیکن وہ ببول کی مسواک کرنی چاہتا ہے ۔ ماں اسے مختلف فوائد کا اسی کڑوی لکڑی کے چبانے کی ترغیب دیتی ہے بچہ ہاتھ منہ دھو کر عبادت میں مصروف ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد ۴ گھنٹہ چرخہ کاتتا ہے ، سبق کے ساتھ ساتھ ان مضامین کو بچوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے تصویریں بھی دی گئی ہیں ۔

جو لوگ مہاتما جی کو ہندوستانی نفسیات میں کامل سمجھتے تھے ، وہ یہ سنکر انہیں بچوں کی نفسیات انسانی ہی کے اعلیٰ ترین واقف کار اور نقاد ہیں ۔ بہر حال ہمیں اس خبر سے جس حیثیت سے غرض ہے وہ تعلیمی پہلو ہے ۔ ہندوستان میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لئے (جو مادی انقلاب کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے) سب سے پہلا اور پُر اثر قدم بچوں کی تعلیم سے شروع ہوتا ہے ہمارے ہندوستانی بچے جب اپنی آنکھیں کھولتے ہیں تو کتاب کے پہلے ہی صفحہ پر انگلستان کی ملکہ اور شاہنشاہ کی تصویر دیکھتے ہیں ۔ انھیں اگر کوئی قومی گیت سکھایا جاتا ہے تو وہ شہنشاہ انگلستان کی درازی عمر کی دعا ہوتی ہے ۔ بچہ کی بسم اللہ خدا یا ایشور کے نام کی بجائے کتے اور بلی کے الفاظ سے ہوتی ہے ۔ اس بنا پر یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ ہماری موجودہ نسل اپنے قومی و مذہبی جذبات و حسیات سے بیگانہ ، غیروں کے خیالات و عقاید کی

[illegible]

اسیر ہے ۔ مہاتماجی کی یہ کوشش بلاشبہ ہماری قومی تعلیم کی رفتار میں ایک نئی قوت ثابت ہوگی۔

جنگ عظیم نے منجملہ اور بہت سے جدید خیالات کے بین الاقوامی، اور عالمگیریت، کے خیال کو بھی پیدا کیا ہے۔ کم و بیش ہر ملک میں ایسے افراد پیدا ہو گئے ہیں جو قومی یا ملی حدود سے آگے بڑھکر بین الملی اور عالمگیر مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ابھی حال میں ایک بڑے صنعتی شخص رافیل ہرمین نے ۱۰ لاکھ ڈالر جو ۲۵ لاکھ روپیہ سے اوپر ہوتا ہے، برانسلس (بلجیم کا صدر مقام ہے) میں ایک بین الاقوامی یونیورسٹی قایم کرنے کے لئے عطا کیا ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں کہ ہندوستان کا موجودہ نظام تعلیم نہایت ہی ناقص اور حد درجہ محتاج اصلاح ہے۔ ماہرین تعلیم اپنے اپنے خیال کے مطابق اس نقص کو دور کرنے اور اس نظام کو بہتر بنانے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ کوئی جبری مفت تعلیم پر زور دے رہا ہے کوئی تربیت اساتذہ کا خواہاں ہے۔ کوئی صنعتی و حرفتی تعلیم رائج کرنا چاہتا ہے۔ اسی فہرست میں ایک صاحب کیپٹن پٹاول بھی ہیں جو ایک "تعلیمی نو آبادی" قایم کرنا چاہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ موجودہ نظام میں عملی تعلیم کی طرف سے بالکل بے توجہی برتی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فراغت تعلیم کے بعد طلبہ بیکار رہتے ہیں ان کے اس مجوزہ اسکیم کے مطابق طلبہ کو زراعتی اور صنعتی کام کرنا ہوگا جس سے ایک طرف وہ خانگی استعمال کے لئے اشیا تیار کریں گے دوسری جانب وہ کوئی نہ کوئی ہنر بھی سیکھتے جائیں گے۔ اس اسکیم کی پہلی مثال قایم کرنے کے لئے مسٹر الگزنڈر نے زمین اور عمارات دی ہیں مہاراجہ قاسم بازار نے بھی ماہوار چندہ کے علاوہ ۵ ہزار اور مسز سوشیلا سندری نے چھوٹی چھوٹی رقموں کے علاوہ ۴ ہزار یکمشت ادا کئے ہیں۔

ہندوستان کی عام تعلیم بالعموم اور ابتدائی تعلیم خاص کر دیگر ممالک کی بہ نسبت بہت ہی کم ہے اور طرفہ یہ کہ اس طرف توجہ بھی بہت کم کیجاتی ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار ہمارے اس دعوے کا ثبوت دیں گے۔

سنہ ۲۲-۱۹۱۷ء کے پنجسالہ عرصہ میں ہندوستان میں لڑکوں کے لئے ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۲۴۰۸۱ سے بڑھکر ۱۳۷۴۳۵ ہوگئی، گویا ۱۳۳۵۴ یا گیارہ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ لیکن یہ حالت ہر صوبہ میں انفرادی حیثیت سے نہ تھی۔ صوبہ جات متحدہ میں ۴۷ فیصدی، مدراس، بمبئی اور پنجاب میں تقریباً ۱۵ فیصدی کا اضافہ تھا۔ برعکس اس کے آسام اور بہار میں کچھ اضافہ نہ ہوا۔ برہما میں تقریباً ۳۵ فیصدی کی تخفیف ہوئی۔ سابق پنجسالہ میں ۱۳۳۰۹ مدارس کا اضافہ تھا، اس لحاظ سے اول الذکر اضافہ کچھ ہمت افزا نہیں۔

سنہ ۲۲-۱۹۱۷ء میں لڑکیوں کے ابتدائی مدارس کی تعداد میں ۱۴۴۳ کا اضافہ تھا۔ سابق پنجسالہ میں یہ اضافہ ۲۵۲۰ کا تھا۔ دونوں اعداد میں جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔

مدارس کے اضافہ و تخفیف سے زیادہ طلبا و طالبات کی کمی بیشی اہمیت رکھتی ہے ذیل کے گذشتہ تین پنجسالہ کے اعداد طلبا و طالبات کی کمی کو بخوبی ظاہر کریں گے۔

مدت	لڑکوں میں اضافہ	لڑکیوں میں اضافہ
سنہ ۱۲-۱۹۰۷	۸۹۲۰۰۰	۳۰۸۰۰۰
سنہ ۱۷-۱۹۱۲	۶۶۹۰۰۰	۲۷۷۰۰۰
سنہ ۲۲-۱۹۱۷	۳۳۵۰۰۰	۱۸۸۰۰۰

یہاں تک تو ہندوستان کی مجموعی حالت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اب ذرا یہ دیکھنا ہے کہ ہر صوبہ میں اس کی کیا حالت ہے اور کون صوبہ اپنے ہاں کی ابتدائی تعلیم پر کس قدر

کرتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ۲۲-۱۹۲۱ء صوبہ وار کا ایک ایسا نقشہ دیا جاتا ہے جس سے یہ پتہ چلیگا
کہ ابتدائی مدارس میں زیر تعلیم لڑکے اور لڑکیوں اور اسی عمر کی مجموعی تعداد (جس میں زیر
تعلیم و غیر تعلیم یافتہ دونوں شامل ہیں) میں کیا نسبت ہے نیز اس سے ابتدائی تعلیم پر اخراجات
کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

صوبہ جات	فی صدی لڑکے	فیصدی لڑکیاں	خرچ لاکھ میں
مدراس	۴۳	۱۱٫۵	۸۰
بمبئی	۴۶	۱۱٫۵	۱۳۲
بنگال	۳۴	۱۰	۲۸
صوبجات متحدہ	۲۳	۲٫۵	۶۳
پنجاب	۱۸	۴	۳۱
برہما	۱۸	۱۲٫۵	۱۱
بہار	۲۴	۴	۲۱ (بشمول اڑیسہ)
آسام	۲۸	۴٫۵	۸
ممالک متوسط	۲۴	۴	۲۶ (بشمول برار)

۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان میں جبریہ تعلیم کے قوانین شہر بمبئی کے علاوہ تقریباً
سات صوبجات میں پاس ہو چکے ہیں۔ بعض مقامات پر عمل درآمد ہو رہا ہے اور بعض جگہوں
میں ابھی اس کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ لیکن ابتدائی تعلیم میں تنزل اور کمی روز بروز
پیدا ہو رہی ہے، وہ نقشہ جات بالا سے بخوبی ذہن نشین ہو گئی ہو گی۔ ٹراونکور
اور کوچین کی ریاستوں میں اختیاری طریقہ ہی کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کا جس قدر رواج ہے

وہ بڑودہ جیسی ریاست میں بھی جہاں جبریہ تعلیم کا بہت زور ہے، نہیں ہے، پھر برٹش انڈیا کے صوبوں   ذکر، لیکن اس سے جبریہ طریقہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس تنزل کی اصلی وجہ خود ہماری بے توجہی ہے۔ اب تو مقامی بورڈ یعنی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کے عام بنانے کے لئے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ اے کاش! ہم اب بھی چیتیں۔!

مطبوعات جدیدہ

انجام عیش مرتبہ قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی دفتر تمدن ٹیامحل دہلی قیمت ۱۱ر
قاری سرفراز حسین صاحب کے قلم سے اس سے قبل چند فسانے شایع ہو چکے ہیں اور عام طور سے پسند کئے گئے ہیں۔ قاری صاحب نے ہندوستانی معاشرت وسوسائٹی کی اصلاح کے لئے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس میں سے سب سے زیادہ مقبول اُن کی یہ ہی ناول ہیں جن کو ایک خاص مقصد (یعنی آوارگی وعصمت فروشی کی مذمت) کے ساتھ انھوں نے ملک میں پیش کئے۔ اس سلسلہ کا پانچواں ناول انجام عیش کے نام سے شایع ہوا ہے۔ حجم ۸۰ صفحے اور سفید کاغذ پر بہت اچھا چھپا ہے۔ جس خرابی کی اصلاح اس کتاب کا مقصد ہے وہ بجاے خود ایک مسئلہ ہے اور مسئلہ بھی ایسا جس پر بالآخر تمام متمدن دنیا توجہ کرنے پر مجبور ہے، لیکن علاوہ اس موضوع کی اہمیت کے "انجام عیش" بہ اعتبار فسانہ ہر حیثیت سے کامیاب ہے۔

قاری صاحب کو زبان اردو پر جو قدرت ہے اور اُن کی تحریریں زبان کی سادگی، دلی کے محاورات کا جو خاص لطف پایا جاتا ہے۔ اس کو اب مغتنم سمجھنا چاہئے۔ اُردو کا موجودہ طرز تو اپنے سرچشمہ سے اتنا دور جا پڑا ہے کہ اندیشہ ہوتا ہے۔ کہ آگے چلکر اس کے منبع کا پتہ بھی چل سکے گا یا نہیں۔

قصہ کے اعتبار سے ناول کا حجم مختصر ہے۔ اور اس میں جناب مصنف نے چار خاندانوں کو خاص طور پر اور ایک دو کو ضمناً فسانہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اسی لئے واقعات کے تسلسل سے نتایج رفتہ رفتہ مترتب ہونے کے بجائے کسی قدر قبل از وقت رونما ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس مبحث حیا فروشی کو جس سلیقہ اور کمال واقفیت سے قاری صاحب نے ملک کے سامنے پیش کیا ہے وہ واقعی قابل داد ہے۔ اور بہ حیثیت مجموعی

کتاب نہایت دلچسپ ہے قصہ کی دلچسپی اور لطف بیان نے کہیں مسئلہ کی سنجیدگی اور مقصد اصلاح کو نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے اور یہ ہی غالباً اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

انجام زندگی یہ مختصر فسانہ ایک خاتون کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میدان میں غالباً یہ پہلا ہی قدم ہے۔ اور اگر ہر بلندی محض مشق اول کے خیال سے مستحق ستائش ہے۔ تو ضیار بانو صاحبہ کی کوشش بھی ضرور قابل تعریف ہے اس لئے اور بھی قصہ دلچسپ درد انگیز اور موثر ہے ضیار بانو صاحبہ نے اپنی پہلی ہی تصنیف میں "الم رقم" کا خطاب قبول فرماکر خوش مذاقی کا ثبوت نہیں دیا۔ بشرطیکہ اس کی وجہ اُن کے استاد معنوی مولانا راشد الخیری کا فیضان نہ قرار دیا جائے۔ جس کا خود ان کو بھی اعتراف ہے اور نیز طرز تحریر سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے۔

کتاب سفید کاغذ پر صاف چھپی ہے اور کمال بک ڈپو ٹیا محل دہلی سے آٹھ آنے قیمت پر ملتی ہے۔

احسن عقاید الاسلام تالیف زبدۃ الحکما حکیم غلام مصطفےٰ۔ ایم۔ او۔ ایل۔ مولوی فاضل مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس۔ لاہور یہ اک تصنیف ہے جو حکیم غلام مصطفےٰ صاحب نے سنہ ۱۹۱۰ء میں عربی زبان میں شایع فرمائی تھی اور جس کا مقصد مسئلہ توحید۔ ہمہ اوست ذجو تقلیدی اور علم الغیب کے خطرناک غلطیوں سے احکام قرآنی اور مسائل اسلامی کے مطابق عام مسلمانوں کو متنبہ کرنا تھا۔ اب دوبارہ اسی کتاب کو مع ترجمہ اردو شایع کیا ہے۔ ایک صفحہ پر عربی اور اس کے مقابل دوسرے صفحہ پر اردو ترجمہ ہے قیمت عہ ہے اور زبدۃ الحکما حکیم فیروز الدین احمد منیجر شفاخانہ مصطفائی۔ اکبری دروازہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

زیارت قبور از قاضی محمد عبد اللہ ایم۔ اے (ہزاروی) نمبر ۹ عثمانیہ ہوسٹل۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ علامہ محی الدین محمد برکوی حنفی متوفی سنہ ۹۸۱ھ کے عربی رسالہ "زیارۃ القبور" کا یہ اردو ترجمہ ہے جس کو قاضی صاحب نے مسلمانوں کی فلاح بدعات قبر پرستی کی اصلاح

کے خیال سے شایع کیا ہے۔ اور مترجم صاحب سے ۵ ر کی قیمت پر ملتا ہے۔

پیغام عندلیب | مصنفہ مولوی محمود حسن صاحب محمود اسرائیلی مطبوعہ خلافت پریس جیکب سرکل بمبئی قیمت ۴ ر

پیغام عندلیب چھوٹی تقطیع پر نہایت خوبصورت کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ مولوی محمود حسن صاحب کا کلام اکثر اخبارات میں شایع ہوتا رہتا ہے۔ اُن کی یہ نظم جذبات قومی اور حمیت اسلامی اُبھارنے اور مسلمانوں میں ولولہ عمل پیدا کرنے کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔ اور یقین ہے کہ ہر جگہ وہ لطف کے ساتھ پڑھی جائیگی اور اپنا اثر کئے بغیر نہ رہے گی۔

الاسلام (انگریزی) / عالمگیر اخوت انسانی " | از مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے دکنٹب جمعیت دعوۃ و تبلیغ اسلام پونا کی عنایت سے ہم کو یہ دو انگریزی رسالے موصول ہوئے ہیں جو جمعیت مذکور نے تبلیغی مقاصد کی غرض سے حال میں شایع کئے ہیں۔ یہ دونوں رسالے انگریزی زبان میں ہیں اور فی الحقیقت یہ دو جداگانہ لکچر ہیں جو مولوی محمد علی صاحب نے پونا کی مشہور مسیحی انجمن وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ اور تھیاسوفکل سوسائٹی پونا کے جلسہ میں پڑھے تھے۔ مولوی صاحب نے ان رسائل میں اسلام کی پاک تعلیم اس کی حقانیت، سادگی اور موجودہ سیاسی و معاشرتی حالات کے مطابق ہونا نہایت وضاحت و خوبی سے بیان کیا ہے۔ اور ساتھ ہی مغربی مصنفین کی غلط بیانیاں اور افترا پردازیاں جو انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق ہمیشہ کی ہیں موقع موقع سے واضح کر دی ہیں۔ دونوں رسالے جس مقصد سے شائع کئے گئے ہیں اُس کے لئے نہایت موزوں ہیں اور یقین ہے کہ جمعیت دعوت کی یہ سعی مشکور ہو گی قیمت ۴ ر فی جلد اور ملنے کا پتہ ۲۴۱۰ - ایسٹ اسٹریٹ پونا ہے۔

اشکِ خون

نویدِ ختمِ اسیری ہے شورِ مرغِ قفس
رگِ گلو میں در آیا غمِ شکستہ پری

کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کس کو روتے ہو
کہاں کہاں نہ ہوئی اشکِ خوں کی بے اثری

ہجومِ اہلِ عزا آرہا ہے نعش بدوش
اُدھر بھی دیکھیو اے محوِ حسنِ رہگذری

صدائے ماتمِ ہمسایہ کب وہ سنتے ہیں
نشاطِ بزم ہے فونو کا شورِ نغمہ گری

عبث ہیں خوفِ خزاں سے دلِ محال اندیش
بہارِ زیست ہی نخلِ اَمَل کی بے ثمری

درازیِ شبِ غم ہو گیا غبار اُس کا
کچھ اور کام تو آیا نہ نالۂ سحری

شبِ سوادِ ستم ہو گئی ہے روزِ سیاہ
کہاں تک اے اثرِ آہ اپنی پردہ دری

فضائے سوزِ تخیل ہے یہ ہجومِ سکوت
بپا ہے گوشۂ خلوت میں جنگِ دیو پری

میسر آئے کسے چشمِ التفات یہاں
نگاہِ لطف سے ناآشنا ہے دیدہ وری

شکستہ ہو کے مرے سر پہ سنگبار ہے روز
نصیبِ سقفِ مزار آسماں کی خیرہ سری

تپش خورجوی

(۱)

افاداتِ شاد

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا
ہنسو گے خود اس چمن پہ غنچو زمانہ آ لے ذرا نمو کا

قمارخانہ ہے بزمِ دنیا بڑے کھلاڑی کا سامنا ہے
گرہ سے پونجی گنوائی اُس نے یہاں ذرا بھی جو چال چوکا

نگاہ و ناز و ادا و غمزہ ، شریک سب ہیں مرے قتل میں ہیں
رہے گا کوئی نہ پاک دامن جو خون اُگلا رگِ گلو کا

پکار کر وحشیوں سے کہدو خزاں کا بھی دور ہے غنیمت
قبا کے دامن کو ٹانک تو لیں اگر نہ موقع ملے رفو کا

ابھی ہیں دل میں بہت امیدیں تڑپ کے حسرت سے مرنہ جائے
ملو اگر شاد سے عزیزو تو ذکر کرنا نہ آرزو کا

(۲)

دُہن ہے دیر میں نکلی تھی کعبہ میں فغاں پہونچی
پکارا تھا کہاں اُس کو پکارا ئے دل کہاں پہونچی

کھلا ہے بام پر جوڑا صبا کس جعد مشکیں کا
کہ مجھ تک بوئے گیسو کارواں در کارواں پہونچی

حریفوں نے مہار رکھے ہیں خوباسباں در پہ
یہ نوبت تیرے میخانہ کی اے پیر مغاں پہونچی

شہیدان وفا کی شان دیکھو کھول کر آنکھیں
لحد تھی جس جگہ اُتنی زمین تا آسماں پہونچی

(۳)

اسیر جسم ہوں میعاد قید لا معلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

تری گلی بھی مجھے یوں تو کھینچتی ہے بہت
دراصل ہے مری مٹی کہاں کی ، کیا معلوم

حواس و صبر و خرد کو نہ پوچھ اے شبِ غم
بتائیں کیا جو کسی کا نہ ہو پتا معلوم

تعلقات کا اُلجھاؤ ہر طرح ظاہر ہے
گرہ کشائیِ تقدیر نارسا معلوم

کہاں سے لاؤں الٰہی وہ دوربیں آنکھیں
کہ ہو اشارۂ انگشت حق نما معلوم

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزا تو یہ ہے کہ نہ منزل نہ راستہ معلوم

کچھ اپنے پاؤں کی طاقت بھی چاہیئے لے پیر
یہی نہیں، تو پھر مددگاریِ عصا معلوم

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

طلب کریں بھی تو کیا شے طلب کریں اے شاد
ہمیں کو آپ نہیں اپنا مدعا معلوم

(۴)

نزیست ہے نام تیری فرقت کا
کچھ ٹھکانا ہے اس مصیبت کا

حال دل سب بیان کر دل کیوں کر
حشر کل ایک دن ہے مُہلت کا

(۵)

پیری کے ساتھ لطف گیا زندگی کا بھی
شب کٹ گئی۔ سحر ہوئی ظاہر۔ بجھا چراغ

اشکوں کے ساتھ عمر کا بھی خاتمہ سمجھ
اے شاد! تیل جب نہ رہا بجھ گیا چراغ

(۶)

زنجیر بن گئی ہے فضا سر سے پاؤں تک
گویا رگیں ہیں دامِ بلا سر سے پاؤں تک

اے برق طور تیری تجلّی کی داستاں
بس سُن چکا، نہ آگ لگا سر سے پاؤں تک

لی تجلّیِ طُور کی نہ خبر تم نے اے کلیم!
تم دیکھتے رہے، وہ جلا سر سے پاؤں تک

(۷)

پہلے پہل کی وہ مری رغبت میں کیا کہوں
اور کچھ سمجھ کے اُن کی نزاکت میں کیا کہوں

کچھ دل میں مثل کانٹوں کے چبھتا تھا ہر گھڑی
اب کے سہی، ہے کیسی اذیّت میں کیا کہوں

(۸)

خواہشِ عمرِ جاودانی ہیچ
گر یہی ہے تو زندگانی ہیچ

لوگ دیوانگی پہ ٹالیں گے
غم کا قصہ مری زبانی ہیچ

حضرت شاد عظیم آبادی

شذرات

تعطیل کلاں کے بعد یکم جولائی سے جامعہ نے پھر کام شروع کر دیا ہے۔ اساتذہ میں جناب معظم علی خاں صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر اور مسٹر سیلوم بی۔ اے (آکسن) کا مزید اضافہ ہوا ہے۔ معظم علی خاں صاحب علاوہ قانونی قابلیت اور تجربہ کے فن تاریخ کے گریجویٹ اور اپنی قومی خدمات کے لئے ممتاز ہیں۔ سیلوم صاحب ان نوجوانوں میں ہیں جنہوں نے باوجود مغربی تعلیم کے بہترین اسناد حاصل کرنے کے اِن کو حصول زر کا آلہ نہیں بنایا ہے بلکہ ہنوز ترقی و خدمتِ علم کے شوق میں جامعہ ملیہ کے شعبہ سائنس کی نگرانی و تعلیم کو اپنے ذمّہ لیا ہے۔

مولوی عبد العزیز انصاری صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی گذشتہ سال جامعہ میں تشریف لے آئے تھے جناب موصوف علاوہ اپنی خدمات قومی کے اُن چند مسلمان نوجوانوں میں ہیں جن پر ہماری قوم کو بجا طور پر فخر رہے گا۔ علمی قابلیت کے ساتھ خلوص نیت، قوت ارادی اور غیر معمولی سرگرمی ایک جگہ مشکل سے جمع ہوتی ہیں لیکن جن لوگوں نے انصاری صاحب کو کام کرتے دیکھا ہے۔ وہ اُن کی غیر معمولی قابلیت کے علاوہ اِن قابل قدر خصوصیات کے بھی قایل ہیں۔

(م) یقین ہے کہ اساتذہ کی جماعت میں جو گرانبہا اضافے ہوئے ہیں اُن سے جامعہ کی تعلیمی خصوصیات میں غیر معمولی ترقی ہوگی۔

جامعہ کے شعبہ صنعت و حرفت کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ اس سال وہ پہلے سے زیادہ ترقی پذیر و کامیاب نظر آئے گا۔ ملمع سازی کے کارخانہ کی جو ابتدا گذشتہ سال کی گئی تھی بفضلہ اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور اگرچہ تجارتی

اغراض سے یہ کارخانہ ہنوز کوئی کام نہیں کرسکا۔ لیکن تعلیمی ضروریات کے لئے اس کے سامان سے پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ اس مرتبہ ایک مستقل انجینیر کے خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اور انجن شے مددسے کارخانہ کا کام قابل اطمینان حالت میں جاری رہنے کی امید کی جاتی ہے۔

(۳) جامعہ ملیہ نے جس بے سروسامانی سے اپنی زندگی شروع کی تھی اس کی یاد اب تک تازہ ہے اوراب بھی نئی نئی دشواریوں کے پیش آجانے سے بعض اوقات وہی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ بالخصوص مکانات کی قلت اورکرایہ کی کوٹھیوں کا فاصلہ اور طلبہ و اساتذہ کی علیحدگی کارکنان جامعہ کے لئے سخت صبر آزما مسائل کا دروازہ کھولے رکھتی ہے۔ ان دشواریوں کا صحیح علاج تو اس وقت ارکان جامعہ کے اختیار سے باہر ہے لیکن اب تک جو کچھ بھی ہوسکا ہے وہ بلاشبہ حیرت انگیز ہے۔ چنانچہ اس وقت جامعہ کے پاس ایک جدید بارک، دو کوٹھیاں اور دو بنگلے تقریباً خود طیار کردہ موجود ہیں اور متعدد مکانات قرب جوار میں کرایہ پر ہیں۔ ان جدید مکانات کی طیاری سے دار الاقامہ کی بہت سی دشواریاں کم ہوگئیں ہیں۔

(۴) گذشتہ ماہ میں سر آسوتوش مکرجی کا انتقال ہمارے ملک سے ایک عظیم الشان ہستی کا اُٹھ جانا ہے انسان کی قوت وعظمت کے لئے جو اصول بھی آپ قایم کریں، اس کے اثر و اقتدار کا اندازہ کرنے کے لئے جو معیار بھی رکھا جائے سر آسوتوش کی ذات اِن تمام اصولوں اور معیاروں کا عملی نمونہ نظر آئے گی۔ ان کی قانونی قابلیت اور مختلف علوم وفنون میں اِن کا تبحّر ضرب المثل ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ جس چیز نے ان کی زندگی کو ممتاز اور اِن کے نام کو ہمیشہ کے لئے زندہ کردیا ہے وہ اُن کی مسلسل خدمات تعلیمی ہیں جو اصلاح اور وسعت تعلیم کے خیال سے اُنہوں نے زندگی بھر انجام دیں اور

جس کی قابل فخر یادگار موجودہ کلکتہ یونیورسٹی ہے۔

ہندوستان کے دورِ جدید میں تعلیمی ترقی اور مسایل تعلیمی پر جس قدر معلومات سر آسوتوش نے اپنی مفید و مصروف زندگی میں چھوڑی ہیں۔ وہ بجائے خود ایک میراث ہے جس پر اُن کی قوم عرصہ تک فخر کرتی رہے گی۔ اِن تمام خصوصیات کے ساتھ جس چیز نے سر آسوتوش کے وجود کو ہر دلعزیزی و ناموری بخشی وہ ان کی جرأت و صداقت تھی۔ اپنے فرایضِ منصبی کی ادائیگی میں وہ جس ایمانداری اور بیباکی سے اپنے فرض اور اپنی قوم کی عزت کا احترام کرتے تھے۔ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ اس لئے وہ باوجود شدید اختلافات کے ہمیشہ "بنگال کے ہیرو" سمجھے گئے۔

(۵) سر آسوتوش کی ذات نادار طلبہ اور ضرورتمند اربابِ علم کے لئے ابرِ کرم کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور آج ان کی وفات اِس طبقہ کے لئے ذاتی نقصان سے کم نہیں۔

(۶) ہندوستان کے سیاسی معاملات میں مسلمانانِ ہند کا جو حصہ ہے اُس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن مسلمانانِ ہند کی سیاسیات نے مختصر زمانہ میں جس قدر رنگ بدلے اور جتنی کروٹیں لی ہیں اس کی تاریخ بھی دلچسپی و عبرت سے خالی نہیں۔ غریب اور بیکس قوم کا سہارا تعلیم ہے اور مسلمان بھی اپنی ذلت و نکبت کے بعد اسی سہارے اُٹھے تھے لیکن محکومیت کی تلخ حقیقت اور غلامی کی کڑی زنجیروں سے وہ عرصہ تک غافل نہ رہ سکے اور بالآخر حوادثِ زمانہ کی سبق آموزی نے ان کو بھی درسِ سیاست تک پہنچا دیا۔

اس سیاسی تبدیلی کا اثر جو کچھ ہو لیکن اِس کا معرضِ وجود میں آجانا بجائے خود اک کارنامہ ہے جس کے لئے مسلمانوں کو سب سے زیادہ اپنے بعض اخبارات

کا ممنون احسان ہونا چاہئے۔ اور جن میں "الہلال" "ہمدرد" کے علاوہ "کامریڈ" کا بہت بڑا حصہ ہے۔

مولانا محمد علی مدظلہٗ کی گوناگوں سیاسی خدمات اور جذبہ ایثار و قربانی کے جس قدر مظاہر اس وقت تک نظر آئے ہیں۔ اُن سب میں کامریڈ کے ذریعہ سے جو خدمات انہوں نے انجام دیں وہ زیادہ مستقل اور باا ثر ثابت ہوئیں۔ کامریڈ کا ابتدائی دور اگرچہ اس کی زندگی کے آخری زمانہ سے بہت زیادہ مختلف ہے لیکن فی الحقیقت سب سے بڑی خدمت اس کے دور اوّل ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس نے مسلمانوں کو من حیث الجماعت ایک سیاسی پلیٹ فارم کے لئے تیار کر دیا۔ اس زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد مسلمانوں کے لئے ایک ایسا مسئلہ تھا جس کے متعلق تفصیل سے گفتگو ہمدردانہ لہجہ میں تقریباً ناممکن تھی لیکن کامریڈ اور اس سے زیادہ "نیو ایرا" مرحوم نے اس مسئلہ کو مسلمانوں کے لئے ایک عملی حقیقت بنا دیا۔

ان اہم خدمات کا سلسلہ جن ناگوار واقعات نے منقطع کیا اُن سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خبر سے نہایت مسرت ہوتی ہے کہ یہ دور "بدعملی" اب ختم ہوتا نظر آتا ہے اور "کامریڈ" و "ہمدرد" دوبارہ مولانا محمد علی کے زیرادارت دہلی سے شایع ہونے والے ہیں۔ امید ہے کہ اس مرتبہ ان اخبارات کا حلقۂ اثر اور ان کی مفید خدمات کا سلسلہ پہلے سے زیادہ وسیع اور مستقل ہوگا۔

شعبۂ تصنیف و تالیف جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کی

جدید مطبوعات

تاریخ الدولتین (از مولینا نیاز فتح پوری) بنی امیہ و بنی عباس کے عہد کی سب سے زیادہ مؤثر دلکش قابل استناد تاریخ ایک جلد میں صرف اسی کتاب میں نظر آئے گی جو جرجی زیدان مصری کی شہرۂ آفاق تاریخ اسلامی کی بنیاد پر اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے طرز بیان کی خوبی اور عبارت کی دلکشی کے لیے مولانا نیاز فتح پوری کا نام کافی ضمانت ہے قیمت . . . . عہ

انتخاب کلام میر (مرتبہ مولوی نور الرحمن بی۔اے۔ اردو زبان کے بہترین شاعر اور استاذ الاساتذہ کی حیثیت سے میر کے ضخیم کلام کا انتخاب مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے لیکن جس سوز و گداز نے میر کو خدائے سخن بنایا ہے اس کے صحیح نمونے صرف اسی انتخاب میں نظر آتے ہیں جو نہایت مختصر ہونے کے ساتھ ہی میر کی تمام غزلیات کا جوہر ہے ابتدا میں حالات زندگی اور ایک زبردست مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں اردو شاعری کی تاریخ محاسن کلام اور موجودہ فن تنقید کے اصول پر اس عہد کے شعرا کا موازنہ شعرائے قدیم سے کیا گیا ہے مجلد قیمت . . . عہ

عرض جوہر | مولانا محمد علی مدظلہ کی غزلیات کا مجموعہ اس سے قبل شایع ہو چکا ہے لیکن زندان بیجاپور کے مکاشفات اس میں بھی نہیں ہیں عرض جوہر میں مولانا کا تازہ ترین کلام اور وہ بے نظیر غزلیں موجود ہیں جو صرف بیجاپور کے زندانی ہی کی زبان سے ادا ہو سکتی تھیں قیمت ۸

قواعد عربی (علم صرف) | از علامہ محمد بن یوسف السورتی استاد عربی، جامعہ ملیہ، علم صرف پر اردو زبان میں کوئی تصنیف اس سے زیادہ مکمل و مستند آج تک نہیں شایع ہوئی اور علامہ موصوف کا مرتبہ ادبیات عربی میں مسلم ہے یہ کتاب اس وقت تک ان کی بہترین تصنیف ہے قیمت . . . ۳ سے

(باہتمام عبد الحی خاں طبع ہوا)